

زندگی دُھوپ اور چھاؤں

نگہت عبداللہ



زندگی دُھوپ چھاؤں

نگہت عبداللہ

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: 37314169 - 37211468

انتساب

اس کہانی ”زندگی دھوپ چھاؤں“ کے ہر اس کردار کے نام
جو اپنی محبت، اپنی منزل کو پانے میں ٹھوکر ضرور کھاتا ہے
مگر کوئی قبل از وقت سنبھلتا ہے
اور کوئی ٹھوکر کھا کر سنبھلتا ہے

(نگہت عبداللہ)

☆.....☆.....☆

یعنی لفظ

نار میں لرام.....!

ناول "زندگی دھوپ چھاؤں" لکھنے کے دوران میں جن نشیب و فراز سے گزری ہوں، یہ میں یا میرا اللہ ہاں! یہ اللہ! میری کوشش تھی کہ مختصر عرصہ کے بعد آپ کی خدمت میں اپنا ایک نیا ناول پیش کروں، مگر ہوتا ہاں! یہ اللہ! ہاں! ہے، وہ نہیں جو اس کا بندہ چاہے۔

مختصر عرصہ کے طویل ہونے میں کئی مسائل درپیش رہے اور کسی اپنے کے پھڑنے کا غم بھی شامل حال ہاں! میں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ہی اپنی ذہنی روح کو بھٹکنے دیا۔ اسی کوشش کی بناء پر میرا یہ نیا ناول "زندگی دھوپ چھاؤں" ایک طویل عرصہ کے بعد ہی سہی، مگر آج آپ کے ہاتھوں میں موجود تو ہے۔

ناول "زندگی دھوپ چھاؤں" میں، میں نے ایک طویل کہانی اور ایک مختصر کہانی تخلیق کو کیا ہے۔ مختصر کہانی میری ہاں! ہاں! ایک یادگار کہانی ہے جس کو میں نے ایک نئے انداز میں ایک طویل کہانی میں ضم کیا ہے۔

شیطان.....!

شیطان ازل سے آدم اور حوا کے درمیان موجود ہے۔

بے شک شیطان موجود ہے۔

ہاں.....! شیطان واقعی ہی موجود ہے، لیکن اس سے بڑی ذات اللہ کی ہے، اور یہ ہماری بد قسمتی ہے اللہ! اللہ پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود کو آرام سے شیطان کے حوالے کر دیتے ہیں۔

بڑے رنگین خواب دکھاتا ہے یہ شیطان مردود۔ انسان اپنی سدھ بدھ ہی کھو بیٹھتا ہے۔ ہوش تب آتا ہے کہ وہی رنگین خواب بھیا تک تعبیر لے کر سامنے آتے ہیں۔

میرے اس ناول ”زندگی دھوپ چھاؤں“ میں، میں نے ایسی ہی ایک کوشش کی ہے کہ ہم دو کے درمیان موجود تیسرا شیطان کس طرح ہمیں اپنے جال میں پھانسا ہے اور ہمیں اپنی منزل سے کیسے بھٹکا دیتا ہے.....؟

نتیجہ کیا نکلتا ہے.....؟

کون بھٹکتا ہے.....؟

کون سنبھلتا ہے.....؟

جیت کس کی ہوتی ہے.....؟

شیطان مردود کی.....؟

یا پھر خاک آدم کی.....؟

اس کا فیصلہ آپ خود کیجئے گا۔

امید ہے کہ آپ کو میرا یہ ناول ”زندگی دھوپ چھاؤں“ بھی شروع سے آخر تک اپنے حرم میں لئے رکھے گا اور بے حد پسند آئے گا، انشاء اللہ.....!
اپنے رائے سے ضرور نوازئیے گا۔

خیر اندیش

نکبہ عبد اللہ

☆ ☆ ☆

زندگی دھوپ چھاؤں

ذوریتل بڑی دیر زور سے بجتی تھی۔ ثانیہ نے گھبرا کر دانیال کو ”خدا حافظ“ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے گیٹ کھولنے تک ذوریتل پھر بجنے لگی تھی۔

”کھول رہی ہوں بھئی.....!“

اس نے گیٹ کھول دیا اور اماں کو اکیلے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”را بعل نہیں آئی.....؟“

”نہیں.....!“

اماں گرمی سے پریشان تھیں۔ مختصر جواب دے کر سیدھی اندر چلی گئیں تو وہ ان کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

”اماں.....! میں نے کہا بھی تھا کہ رابعہ کو ساتھ لے آئے گا۔ کتنے دن ہو گئے ہیں اسے آئے ہوئے۔“
”اپنے گھر کے کھینٹوں سے نکلے گی تو آئے گی ناں.....؟“

اماں نے یوں ناگواری کا اظہار کیا جیسے وہ اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتی تھیں، اور وہ سمجھ کر پوچھنے لگی۔

”کیسی ہے رابعہ اور شو بی.....؟“

”ٹھیک ہیں.....! شو بی دانت نکال رہا ہے، جب ہی کمزور لگ رہا تھا۔“

اماں جواب دے کر پوچھنے لگیں۔

”تم نے کھانا کالیا کیا.....؟“

”جی.....! لے آؤں.....؟“

”نہیں.....! ابھی تو بھوک بھی نہیں ہے۔ پانی پیادو.....! زیادہ ٹھنڈا مت لانا۔“

”جی اچھا.....!“

وہ بھاگ کر پانی لے آئی اور گلاس انہیں تھا کر بیٹھے ہوئے کہنے لگی۔

”کیوں جاتی ہیں آپ رابعہ کے گھر؟ مت جایا کریں۔ اب بیٹھی کڑھتی رہیں گی۔“

اماں نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر پانی پی کر لٹ گئیں تو وہ اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔

”اماں.....! کیا پھر رابعہ کی ساس نے کچھ کہہ دیا ہے؟“

”نہیں.....!“

اماں نے آنکھیں بند کر لیں تو وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اچھا بھلا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے دانیال کے فون نے اس کے دل میں خوش گواری پھیل چائی تھی۔ اب اماں کی طرح وہ بھی آزرہ ہو گئی تھی۔

کہتے ہیں، خوشی کا دوسرا نام شادی ہے۔ لیکن رابعہ کی شادی کر کے تو اماں ابا کو روگ ہی لگ گیا تھا۔

حالانکہ رابعہ خصوصاً اماں ابا سے تو سسرال والوں کی شکایت نہیں کرتی تھی۔ اپنی طرف سے تو بے چاری ”سب ٹھیک ہے“ کا سگنل دیتی تھی، لیکن ماں باپ اس کا چہرہ دیکھتے تھے، جس پر ہر ستم انہیں واضح نظر آتا تھا۔

خولجہ صاحب کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی رابعہ جس کی بڑھ سال پہلے شادی ہوئی تھی اور وہ تھی ثانیہ۔ اس

نے اس سال گر بیچوین کیا تھا اور اب اماں کے ساتھ گھرداری میں مصروف تھی۔ چار مہینے پہلے تک اس کی زندگی میں

کوئی رنگ نہیں تھا۔ برسوں سے لگی بندھی روٹین چلی آ رہی تھی کہ اچانک دانیال کی آمد نے اس کے اندر پلچل چادی تھی۔

یہ چار مہینے پہلے کی بات تھی۔ وہ کالج سے آ رہی تھی کہ دانیال ایک دم اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

”آپ خولجہ صاحب کی بیٹی ہیں ناں؟“

”کیوں؟“ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

وہ گھبرا گئی تھی۔

”مجھے خولجہ صاحب سے آپ کی شکایت کرنی ہے۔“

وہ بظاہر بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔

”میری شکایت؟“

وہ مزید پریشان ہو گئی تھی۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“

”کیا نہیں کیا؟“ پیچھے بھلے انسان کو پاگل کر دیا ہے۔“

وہ ہنوز سنجیدہ بنا۔

”پاگل؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ خود سوچیں، یہ آفس ٹائم ہے اور میں اس وقت یہاں کھڑا ہوں۔ یہ

پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟“

دانیال کی وضاحت پر وہ ابھ گئی۔

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”سراسر آپ کا ہی قصور ہے۔“

وہ فوراً بولا تھا۔

”سر بھگائے قدم اٹھائی سیدی دل میں اُترتی چلی جاتی ہیں۔“

”جی؟“

وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”جی.....!“

وہ دلکشی سے مسکراتا تھا۔

”میں صرف آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اس وقت آفس سے بھاگا چلا آتا ہوں۔ وہ دیکھیں

سامنے میرا گھر ہے۔ وہاں ٹیرس پر کھڑا ہوتا ہوں آپ کے لئے۔“

اس نے بے اختیار اس کے اشارے کی طرف اس کے گھر کو دیکھا، پھر پلٹ کر تیز قدموں سے چل تو

پڑی تھی لیکن اس کا دھیان وہیں رہ گیا تھا اور اگلے روز کانٹا جاتے ہوئے اس کا دل انجانی لے پر دھڑک رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

میڈنگ کے دوران وہ بار بار ٹائم دیکھ رہا تھا۔ پھر وہاں سے نکلتے ہی اس نے گاڑی گھر کے راستے پر ڈال

دی۔ گوکہ معمول سے کچھ لیٹ ہو گیا تھا، پھر بھی جانے کیوں اسے یقین تھا کہ ثانیہ سے ملاقات ضرور ہوگی، اور آج

کل تو وہ اپنے دل کی ہر بات پر ایمان لے آتا تھا۔ جب ہی لیٹ ہونے کے باوجود وہ چل پڑا تھا۔

اور ابھی آدھا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ایک جگہ روڈ کے کنارے خولجہ صاحب کو بیٹھے دیکھ کر اس نے ایک دم

گاڑی کو بریک لگا تھتے۔

”خولجہ صاحب یہاں؟“

وہ سوچتے ہوئے گاڑی سے اتر کر ان کے پاس چلا آیا اور قدرے تشویش سے پوچھنے لگا۔

”خیر یہ خولجہ صاحب.....؟ آپ یہاں؟“

”تم؟“

خواجه صاحب اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگے تو وہ فوراً بولا۔

”جی میں دانیال ہوں۔ دانیال حسن.....! آپ کے گھر کے قریب ہی رہتا ہوں۔ بس.....! اتفاق ہے کہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”ہاں.....!“

خواجه صاحب نے ”ہاں“ کی صورت سانس کھینچی تھی۔

”آپ یہاں.....؟“

اس نے پھر پوچھا تو خواجه صاحب خود کو زمین پر بیٹھ دیکھ کر بولے۔

”بس بیٹا.....! ایک بائیک والے نے نگر مار کر یہاں پھینک دیا۔“

”اوہو.....! کہیں چوٹ تو نہیں آئی.....؟“

اس نے پریشانی سے پوچھا۔

”بس.....! اللہ نے بچا لیا۔“

خواجه صاحب نے کہا تو وہ ان کا بازو تھام کر بولا۔

”آئیے.....! میں گھر ہی جا رہا ہوں، آپ کو بھی چھوڑ دوں گا۔“

”خوش رہو میاں.....!“

اس نے خواجه صاحب کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا تو اس وقت اسے صرف انہیں گھر پہنچانے کا خیال تھا، لیکن جب گاڑی ان کے گھر کے سامنے روکی، تب ایک دم وہ پری پیکر نگاہوں میں آسانی تھی جس کی خاطر اس کی روٹین ہی بدل گئی تھی۔

خواجه صاحب کے شاید پیر میں موج آئی تھی یا گھٹنے میں چوٹ لگی تھی کہ ان سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور وہ ان کے ساتھ گھر کے اندر آ گیا۔

”ہائے اللہ.....! انہیں کیا ہوا.....؟“

اماں خواجه صاحب کو دیکھنے ہی پریشان ہو گئیں۔

”کچھ نہیں.....! بس.....“

خواجه صاحب اسی قدر بولے تھے۔

”کیا بس.....؟ اچھے بھلے گھر سے گئے تھے، اپنے پیروں پر چل کر.....؟“

”ابھی بھی اپنے پیروں پر چل کر ہی آ رہا ہوں۔ کندھوں پر سوار ہو کر نہیں آ رہا۔“

خواجه صاحب جھنجھلا گئے تھے، تب اسے بولنا پڑا۔

”آئی.....! آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوا خواجه صاحب کو، بس.....! چلتے چلتے پیر مڑ گیا تھا۔“

”ہاں.....! پیر مڑ گیا تھا۔ وہ تو شکر ہوا کہ.....“

خواجه صاحب نے تائید کے ساتھ اسے دیکھا تو وہ فوراً بولا۔

”جی..... دانیال.....!“

”ہاں.....! دانیال نے دیکھ لیا ورنہ جانے کب تک بیٹھا رہتا سرک کنارے.....؟“

خواجه صاحب نے کہا تو اماں مزید پریشان ہو گئیں۔

”سرک کنارے.....؟“

”اوہو بیگم.....! اب سرک کا نام پوچھنے مت کھڑی ہو جانا.....؟ پہلے شکر یہ ادا کرو دانیال کا، اور کوئی

چائے پانی لاؤ.....!“

”نہیں خواجه صاحب.....! بہت شکریہ.....! اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ فوراً بول پڑا۔

”ہاں.....! اگر آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے تو بتائیے.....! میں لے چلتا ہوں۔“

”ارے نہیں میاں.....! معمولی چوٹ ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے.....! پھر میں چلتا ہوں، دوبارہ انشاء اللہ آؤں گا۔“

وہ جلدی سے انہیں ”خدا حافظ“ کہہ کر کمرے سے نکلا تھا کہ سامنے کھڑکی میں ٹائیہ کو کھڑے دیکھ کر بے اختیار ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا تو جوانی اشارہ کرتے ہوئے ٹائیہ کے چہرے پر شرمیلیں مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ سرشار ہو گیا اور یوں سینے پر ہاتھ رکھا جیسے میرا دل غلط نہیں کہتا۔

☆.....☆.....☆

وہ گھر آیا تو ایک ذرا سی ملاقات کا خوش گوار تاثر اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ خواجه صاحب تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور یہ موقع اسے قدرت نے فراہم کیا تھا۔ بہر حال اس سے خوشی چھپائی نہیں جا رہی تھی۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آواز سن کر وہ سیدھا دھڑکی آ گیا اور سالن کی دیوچی میں جھج چلائی سیما بھائی کو زوردار سلام کر ڈالا۔

”السلام علیکم.....!“

”ہائے.....!“

سیما چانک آواز پر اچھیل پڑی۔

”توبہ.....! ذرا ہی دیا تم نے۔“

”کیا بھائی! سلام ہی تو کیا ہے.....؟“

وہ مظلوظ ہو کر بولا۔

”تو بھیا! پہلے ذرا ڈور سے کھانس لیا کر دتا کہ بندہ ہوشیار ہو جائے۔ طریقہ بھی یہی ہے۔“

سیما نے کہا تو اس نے پہلے گدی کھجائی، پھر شرارت سے بولا۔

”اچھا! تب ہی میں کہوں، بھیا ہر وقت کھانتے کیوں رہتے ہیں.....؟“

”انہیں تو خیر پیدا انٹی کھانسی ہے۔“

سیما فوراً بولی تھی۔ اسے بے اختیار ہنسی آئی۔

”نہیں بھائی! آپ ذرا پیچھے چلی گئی ہیں۔ بھیا کو کھانسی شادی کے بعد ہوئی ہے۔ شادی سے پہلے

وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔“

”تمہارا مطلب ہے، میری وجہ سے.....؟“

سیما نے ہاتھ میں پکڑا بیچ اُسے دکھایا تو وہ فوراً کان پکڑ کر بولا۔

”تو بہ کریں! آپ کی وجہ سے کیوں.....؟ آپ تو ان کی زندگی میں بہار بن کر آئی ہیں۔ بس.....!“

یہ ہے کہ بھیا کو بہار کا موسم راس نہیں آتا۔“

”تمہیں راس آتا ہے.....؟“

سیما چٹکی تھی۔

”ارے بھائی! میں تو پیدا ہی بہار کے موسم میں ہوا تھا۔ ہر طرف پھول کھل رہے تھے اور ایسی

مست ہوا میں چل رہی تھیں کہ میں پیدا ہوتے ہی کھلکھلانے لگا تھا۔“

وہ جھوم جھوم کر بول رہا تھا۔

”اچھا! ازرا اب کھلکھلاؤ تو.....!“

سیما اسے چیخ مارنا چاہتی تھی کہ وہ ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن آگے اور مصیبت آ رہی تھی۔ سیما کی بہن

حنا، جس سے وہ بری طرح ٹکرایا تھا۔

”اُف!“

حنانے اپنی پیشانی پکڑ لی۔

”سوری سوری! چھوٹ تو نہیں لگی آپ کو.....؟“

اس نے بوکھلا کر پوچھا تو پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر دھیرے سے بولی تھی۔

”لگی تو ہے.....!“

”سوری اگین!“

”اُس اوکے.....!“

حناسکرائی، پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”آپا کہاں ہیں.....؟“

”میں یہاں ہوں۔“

سیما کچن سے نکلتے ہوئے کہنے لگی۔

”بڑی عمر ہے تمہاری، ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“

”اچھا! اب جلدی سے بتا دیں، کیا کام ہے.....؟“

حنانے یاد کرنے سے سمجھ کر کہا تو سیما گڑبگڑی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”مطلب یہ میری اچھی آپا! آپ ہمیشہ مجھے کسی کام سے ہی یاد کرتی ہیں۔“

حنانے صاف گوئی پر سیما جڑبڑ ہو کر بولی۔

”ہاں تو کام کے وقت وہی یاد آتے ہیں جن سے محبت ہوتی ہے۔ کیوں دانیال.....؟“

”بالکل بالکل.....!“

اس نے فوراً تائید کی۔

”آپ تو ان کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔“

حنانے اس سے کہا تو وہ کندھے اُچکا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”جاؤ! جلدی سے دانیال کے لئے کھانا نکال دو۔ میں ذرا بچوں کو دیکھ لوں۔“

سیما کہتے ہوئے آخر میں معنی خیز انداز میں مسکرائی تو بظاہر انجان بن کر حنا کچن کی طرف بڑھ گئی اور

جلدی سے ٹرے میں کھانا رکھ کر دانیال کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر بمشکل اپنی ناگواری چھپا کر کہنے لگا۔

”ارے.....! آپ نے کیوں زحمت کی.....؟ میں..... میں آ رہی رہا تھا۔“

”تو کیا ہوا.....؟ میں آ گئی، کیا آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا.....؟“

حنانے مان سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ نظریں چرا گیا۔

”یہ بات نہیں ہے.....! تشریف رکھیں۔“

”شکریہ.....! کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔“

”جی.....؟“

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ آپا بے چاری ایک وقت میں کس کس کو دیکھیں.....؟ گھن چکر بنی رہتی

اس نے ملامت کی۔

”بری بات تو ہے، لیکن کیا کروں.....؟ بات ہی ایسی تھی۔“

”اچھا چلو، اب اصل بات بتاؤ.....!“

وہ اکتا کر بولی۔

”اصل بات.....؟ ہاں.....! میں نے سنا کہ ابوائے کسی دوست کا ذکر کر رہے تھے، جنہوں نے اپنے بیٹے کے لئے تمہیں مانگا ہے۔“

”کک..... کیا.....؟“

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں، اپنے کانوں سے سنا ہے میں نے۔“

”افوہ.....! تو میں نے کب کہا کہ تم جھوٹ کہہ رہی ہو.....؟ اچھا، یہ بتاؤ کون سے دوست.....؟ وہ شفیع صاحب تو نہیں جو اکثر یہاں آتے ہیں.....؟“

”نہیں نہیں.....! اب تو کوئی اور نام لے رہے تھے۔“

پنکی نے کچھ دیر سوچا، پھر نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

”اوہو.....! مجھے تو نام بھی یاد نہیں آ رہا۔“

”خیر.....! نام کو چھوڑو، یہ بتاؤ، اور کیا باتیں ہوئیں.....؟“

”پتا نہیں.....! میں نے تو بس اتنا ہی سنا تھا۔“

پنکی نے کہا تو اس کے اندر جو اچانک تجسس جاگا تھا، مایوسی میں بدل گیا۔ وہ دوبارہ لپٹتے ہوئے بولی۔

”چلو جاؤ، تمہیں ابھی روٹی بھی پکانی ہے۔“

اس وقت امی بھی پکارنے لگیں تو پنکی اٹھ کر چلی گئی۔ اس نے بس کچھ دیر پنکی کی کہی ہوئی بات کو سوچا، پھر منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے اٹھ گئی۔

وہ کوئی بہت کم عمر اور ناتجربہ لڑکی نہیں تھی۔ گزشتہ سال ہی اسے کرنے لگے بعد ایک مقامی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ وہ کسی حد تک حقیقت پسند ہونے کے باعث اتنا جانتی تھی کہ والدین نے اسے پڑھایا لکھایا اور اب جب بھی مناسب سمجھیں گے، اس کی شادی کر دیں گے۔ اس کے خیال میں لڑکیوں کے ساتھ بس یہی کچھ ہوتا ہے، اور غالباً اپنی اسی سوچ کے باعث اس نے خود سے اپنے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا اور نہ کوئی خواب سجائے تھے۔ البتہ پڑھی لکھی لڑکی ہونے کے ناطے یہ ضرور چاہتی تھی کہ اس کے والدین جس شخص سے بھی اس کی شادی کریں، وہ اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم تعلیم یافتہ بھی نہ ہو اور جسے اپنے خاندان کے کسی فرد سے متعارف کراتے ہوئے وہ سبکی محسوس نہ کرے، صورتِ شکل کے بارے میں گو کہ اس کا خیال تھا، سب اللہ کی بنائی ہوئی ہیں، پھر بھی شادی سے پہلے وہ

ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا، ہمارا گھر قریب ہی ہے۔ میں آکر ان کی ہیلپ کر دیتی ہوں۔“

حنکا وضاحت پر اسے کہنا پڑا۔

”یہ تو آپ بہت اچھا کرتی ہیں۔“

”میں تو اچھا کرتی ہوں، آپ کو بھی خیال کرنا چاہئے بلکہ احساس۔“

حنکا جانے اسے کس بات کا احساس دلانے جاری تھی کہ اس کا اپنا دھیان بٹ گیا۔ کتابوں کا ریک وکھ کر پوچھنے لگی۔

”آپ کو مطالعے کا شوق بھی ہے.....؟“

”جی.....! تھوڑا بہت.....!“

وہ کھانا شروع کر چکا تھا۔

”مجھے تو بہت شوق ہے۔“

حنکا کہتے ہوئے ریک کی طرف بڑھ گئی۔ پھر ایک کتاب نکال کر اس کے صفحے لپٹتے ہوئے بولی۔

”انشاء جی میرے بھی ثبوت ہیں۔ کیا خوب کہا ہے انہوں نے.....“

جب دہر کے غم سے امان نہ ملی ہم لوگوں نے عشق ایجاد کیا

کبھی شہر بنانا میں خراب پھرے کبھی دشت جنوں آباد کیا“

وہ کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا اور رشک بھرے لہجے میں بولا تھا۔

”یہ ٹرے لے جایئے.....!“

☆.....☆.....☆

”پتا ہے جانیہ.....! رات امی، ابو کیا باتیں کر رہے تھے.....؟“

پنکی نے سرگوشی کی اور کچھ رازداری سے کہا تو وہ تنگی باری ابھی آ کے لیٹی تھی، بغیر کوئی تجسس اور اشتیاق ظاہر کئے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”حالانکہ امی نے مجھے وہاں سے بھگا دیا تھا۔“

”پھر بھی تم نے ان کی باتیں سن لیں.....؟“

وہ فوراً ٹوک کر بولی کیونکہ پنکی کی عادت سے واقف تھی کہ وہ اصل بات سے پہلے پوری پوچھیشن ضرور بیان کرتی تھی۔

”ہاں.....! میں امی کے کہنے پر کمرے سے تو نکل آئی، لیکن پھر دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔“

”کتی بری بات ہے۔“

دیکھنے کی قائل تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کرامی، ابواس بات کے قائل ہیں یا نہیں۔ بہر حال جب سے چنکی نے اسے یہ بات بتائی تھی، تب سے فطری طور پر وہ کچھ ہوشیاری ہو گئی تھی۔

گھر میں کون آ رہا ہے؟ کون جا رہا ہے؟ بڑے بھیا کی وقت بے وقت آمد اور امی سے سرگوشیوں میں باتیں کرنا، گویا ایک غیر محسوس سی ہلچل شروع ہو گئی تھی اور ادھر یہ ہلچل شروع ہوئی، ادھر اس کے نظریے اور سوچیں آپ ہی آپ رخصت ہو کر فطری تجسس بیدار کر گئیں۔

”کون ہے؟“

”کیسا ہے؟“

ہر سوچ اسی سے شروع ہو کر اتنی پر ختم ہونے لگی۔ کئی بار اس نے باتوں باتوں میں چنکی کو کریدنے کی کوشش کی، لیکن وہ مزید معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی، اس لئے کچھ نہیں بتا سکی۔

”ایسا کرو۔۔۔!“

وہ سوچ کر بولی۔

”تم اب براہ راست امی سے پوچھ لو۔“

”ناں، بھئی ناں۔۔۔!“

چنکی نے صاف انکار کر دیا۔

”کیوں؟“

”اس روز امی اسی سلسلے میں کوئی بات کر رہی تھیں، میں وہاں بیٹھنے لگی تو چھوٹے بھیا نے بری طرح

ڈانٹ کر مجھے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔“

چنکی نے وجہ بیان کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی تو وہ براسامہ بنا کر بولی۔

”چھوٹے بھیا تو بس ایسے ہی ہیں۔ پتا نہیں اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔۔۔۔۔؟ حالانکہ بڑے بھیا بھی تو

ہیں، انہوں نے تو ہم پر ایسی پابندیاں نہیں لگائی تھیں۔ ایک یہ ہیں، انہیں ٹوکنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔! اور پتا ہے، صبح جب تم اسکول جاتی ہو تو یہ روزانہ گھنٹہ بھر تو ضرور امی سے اُلجھتے ہیں کہ کیا

ضرورت ہے تمہیں نوکری کرنے کی؟“

”خود جو نہیں کرتے۔“

وہ جل کر بولی۔

”آخر چھوٹے بھیا ایسے کیوں ہیں۔۔۔۔۔؟ انہیں کم از کم اپنے بارے میں تو سوچنا چاہئے۔ امی بھی ان کی

طرف سے اتنی پریشان رہتی ہیں۔“

”ابو کی غلطی ہے جو اتنی دھیل دے رکھی ہے۔ ہر وقت میرے چاند، میرے لال کرتے رہتے ہیں اور

چاند کا دماغ ہے کہ ساتویں آسمان تک جا پہنچا ہے۔“

وہ کچھ اس انداز سے بولی کہ چنکی کو ہنسی آ گئی جسے نظر انداز کر کے وہ تاسف سے کہنے لگی۔

”کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔۔۔۔۔! چھوٹے بھیا سراسر اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ دوسروں پر تنقید کرنے میں

کتنے ماسٹر ہیں، لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھتے۔ امی، ابو کی خواہش اور پھر ہزار منتوں کے باوجود انٹر کے بعد پڑھ کے

نہیں دیا، نہ کوئی ہنر سیکھا، اور جب نوکری کی بات آتی ہے تو جزل میجر سے کم سوچتے نہیں۔“

”چہ چہ۔۔۔۔۔! واقعی، ان کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔“

”دشش۔۔۔۔۔! وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔“

چنکی نے آواز دبا کر اسے خبردار کیا تو وہ اخبار پھیل کر بظاہر اس میں مصروف ہو گئی۔

”یہ تم دونوں یہاں کیا کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

چھوٹے بھیا کو بلا وجہ رعب بھانڑنے کی عادت تھی۔

”آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟“

وہ ان کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

”میں ایک ایجنٹ کے پاس گیا تھا۔“

خلاف توقع وہ برامانے بغیر بتانے لگے۔

”اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ جاپان کا ویزا دے رہا ہے۔“

”اچھا تو آپ جاپان جائیں گے۔۔۔۔۔؟“

چنکی اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”ہاں۔۔۔۔۔! کوشش تو کر رہا ہوں۔“

”لیکن جاپان جانا آسان تو نہیں ہے، میرا مطلب ہے کہ کافی پیسے چاہئے ہوں گے۔۔۔۔۔؟“

”بارہ لاکھ مانگ رہا ہے ایجنٹ۔“

”بارہ لاکھ۔۔۔۔۔؟“

اس نے تعجب سے دہرایا پھر اپنے طور پر سمجھاتے ہوئے بولی۔

”چھوڑیں بھیا۔۔۔۔۔! اگر اتنے پیسے ہوتے تو آپ یہیں کوئی کاروبار کر لیتے۔“

”اتنے پیسوں میں کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟ بارہ لاکھ کم تو نہیں ہوتے۔“

”کوئی بہت زیادہ بھی نہیں ہیں۔ اگر ابو جی کہیں سے انتظام کر دیں تو۔۔۔۔۔“

اس نے کچھ تاحسف سے انہیں دیکھا اور کچھ کہے بغیر وہاں سے اُٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

رات میں بچن کے آخری کام جلدی جلدی منٹاتے ہوئے اس کا دھیان ٹیلی فون کی طرف تھا۔ کیونکہ دانیال حسن سونے سے پہلے اسے فون ضرور کرتا تھا۔ جبکہ اسے فون ریسیور کرنے کا موقع کبھی بھی ہی ملتا تھا۔ اگر اماں یا ابا فون اٹھا لیتے تھے۔ پھر وہ ان کی بڑ بڑا ہٹ سنتی تھی کہ پتا نہیں کون ہے.....؟ آواز سن کر فون بند کر دیا۔ لیکن وہ سمجھ جاتی تھی۔

اور آج کیونکہ ابا چوٹوں کے باعث لیٹے ہوئے تھے اور اماں مسلسل ان کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ اس لئے وہ بچن سے فارغ ہوتے ہی ٹیلی فون سیٹ لے کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ تیل بج اُٹھی۔ اس نے فوراً ریسیور اٹھا لیا تھا۔

”اس کا مطلب ہے دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی.....؟“

فورا کال ریسیور ہونے پر دانیال کو یقین تھا کہ وہی ہوگی، جب ہی محفوظ ہو کر بولا تھا، اور تاحسف کے ہونٹوں سے دہی دہی کی آواز ابھری تھی۔

”بڑی ظالم ہو.....! صرف فون پر ہنستی ہو، سامنے آؤں تو یوں بن جاتی ہو جیسے جانتی ہی نہیں.....!“

اس کے شکوہ کرنے پر وہ دھیرے سے بولی تھی۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”پھر کیسا ہے.....؟“

وہ شریر ہوا۔

”مجھے نہیں پتا.....!“

وہ کنفیوز ہو گئی۔

”لیکن مجھے سب پتا ہے۔ بلکہ اب تو سارے زمانے کو پتا چلنے والا ہے۔“

دانیال نے کہا تو وہ گھبرا گئی۔

”کک..... کیا پتا چلنے والا ہے.....؟“

”یہی کہ راکر کو چھپ چھپ کر فون پر باتیں کرنے والے اب دنیا کے سامنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر

چلا کریں گے۔“

اس نے کہا تو وہ پھر نرموس ہو گئی۔

”میں فون رکھ رہی ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور رکھ دیا اور کچھ دیر اسے سوچتی رہی، پھر ایک دم ابا کا خیال آنے پر جلدی سے جا کر ٹیلی فون سیٹ اس کی جگہ پر رکھا، پھر اماں ابا کے کمرے میں آ کر پوچھنے لگی۔

”ابا.....! آپ کے گھنٹے میں در دو نمیں ہو رہا.....؟“

”نہیں بیٹا.....! تمہاری اماں نے آؤ بیڈیکس دی تھی۔ اب کافی آرام ہے۔“

ابا نے کہا تو وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ویسے آپ کو ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا چاہئے تھا۔“

”شام سے میں بھی یہی کہہ رہی تھی لیکن یہ سنتے کب ہیں کسی کی.....؟ اب بتاؤ.....! رات میں کوئی

مسئلہ ہو گیا تو.....؟“

اماں اسی فکر میں بیٹھی تھیں۔

”تو بلدی چونا لگا دینا۔“

ابا فوراً بولے تھے۔

”سن لیا.....؟“

اماں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”اچھا جلیں.....! اب آپ بھی آرام کریں۔ انشاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اور ہاں.....! کچھ چاہئے

تو بتادیں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں.....! بس جاؤ تم بھی.....!“

اماں نے کہا تو وہ ”شب بخیر“ کہہ کر پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابھی کوئی اتنی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی،

اور پہلے تو وہ بڑے آرام سے سو جایا کرتی تھی، لیکن جب سے دانیال زندگی میں آیا تھا، نیند آنکھوں سے رخصت ہو گئی

تھی۔ اس کی جگہ سینوں نے لے لی تھی۔ اس کی سنگت میں ایک آن دیکھی دنیا کا سفر بڑا حسین لگتا تھا۔ وہ اس سفر کے

اختتام پر منزل کا تصور لئے سو گئی تھی۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ اماں نے بھی نہیں جگایا۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر

اماں کے پاس آئی تو وہ بیٹھی بڑی کاٹ رہی تھیں۔

”اماں.....! میں اتنی دیر تک سوتی رہی.....؟ ابا کہاں ہیں.....؟“

اس نے متوش ہو کر پوچھا تھا۔

”آفس چلے گئے۔“

اماں کا انداز ناراضگی لئے ہوئے تھا۔

”افس..... لیکن ان سے تو چلا بھی نہیں جا رہا تھا.....؟“

”کہہ رہے تھے، ضروری کام ہے۔ لنگڑاتے ہوئے گئے ہیں۔ جاؤ تم ناشتہ کرو.....!“

اماں نے جواب کے ساتھ کہا۔

”دل نہیں چاہ رہا۔ لایئے.....! یہ سب میں کاٹ دوں۔“

اس نے بیٹھے ہوئے اماں کے ہاتھ سے چھری لے لی تو وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”پتا نہیں شوہن کی طبیعت کیسی ہے.....؟ کہا بھی تھا رابعہ سے فون کر کے بتا دینا۔“

”ارے اماں.....! آپ کو رابعہ کی ساس کا پتا تو ہے۔ فون کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتیں اسے۔“

وہ جل کر بولی تھی۔

”ہاں.....! بڑی بے کو ذرا خدا کا خوف نہیں ہے۔ ایسے ترساتی ہے میری بیٹی کو جیسے سیکے میں تو اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔“

”بڑی بی کو چھوڑیں اماں.....! عباد بھائی کون سا رابعہ کا خیال رکھتے ہیں.....؟ وہ بھی اپنی ماں کی طرح ہی ہیں۔“

اس نے کہا تو اماں نے نوک دیا۔

”اچھا بس.....! تم نہ زیادہ بولا کرو۔“

”بھئی.....! میں کیوں نہ بولوں.....؟ میری بہن کو یہ غمال بنا کر کھا ہوا ہے انہوں نے۔“

وہ تیز ہو کر بولی تو اماں اسے دیکھنے لگیں۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں اماں.....! ویسے غلطی آپ لوگوں کی ہے۔ بچا چھان بین کے اٹھا کے دے دی لڑکی۔“

”ارے.....! چھان بین کا موقع کب دیا تھا انہوں نے.....؟ بس.....! بات ڈالی اور بیماری کا تا تک رچا لیا تھا اس کی ساس نے۔“

”بیماری کا تا تک تو اب تک چل رہا ہے ان کا۔“

وہ کہتے ہوئے سبزی کی باسکٹ اٹھا کر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

سیما کو اپنے گھر پر مکمل حکمرانی حاصل تھی۔ ساس، سر سہنے نہیں، شوہر سادہ مزاج اور خصوصاً گھریلو کھیتروں سے خود کو الگ ہی رکھتے تھے اور ایک دیور دانیال حسن جس پر اسے مکمل کنٹرول تھا۔ اس کی کسی بات پر نا

کہنا تو دور کی بات، اختلاف تک نہیں کرتا تھا، اس سے وہ بہت خوش تھی اور اپنی خوشی کو ان کی ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ دانیال کی شادی اپنی بہن حنا سے کرے گی۔

حنا انگریزی میں ماسٹر کر رہی تھی۔ وہ قدرے آزاد خیال اور لائبرالی سلیب کی لڑکی تھی۔ خوب صورت بھی تھی، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کسی کے دل میں اترنے کے لئے ظاہری خوب صورتی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بہر حال اسے بھی دانیال پسند تھا۔ مزید سیماسے سنبھلے خواب دکھائی تھی اور اس نے اپنی ماں سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ حنا کو ہی اپنی دیوری بنا لے گی۔ اس وقت وہ فون پر اپنی اماں کو کلمہ دے رہی تھی۔

”اوہو امی.....! میں نے کہا نا.....! اب یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ بالکل فکر مت کریں۔ میں حنا کی شادی دانیال سے ہی کراؤں گی۔“

”نہیں.....! اب دیور نہیں ہے، بس.....! میں آج کل میں ہی بات کروں گی۔“

”ارے امی.....! آپ کو پتا ہے، میرا دیور میری بات نہیں مانتا۔ میں جہاں کہوں گی، وہ وہیں شادی کرے گا، اور میں نے سوچ لیا ہے، حنا ہی اس گھر میں آئے گی۔“

”ہاں.....! آپ بے فکر ہو جائیں۔“

”اچھا.....! اب میں فون رکھتی ہوں۔ کھانا بنانے جا رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے.....! انشاء اللہ.....!“

وہ فون رکھ کر کچن میں آگئی۔ بچوں کے اکیڑی سے آنے سے پہلے وہ کچن کے کاموں سے فارغ ہو جانا چاہتی تھی۔ اس کی یہی روٹین تھی۔ ہر کام وقت پر کرنے کی عادت نے ہی اس کامیاب اور دیور کی نظر میں مقام بنایا ہوا تھا۔ پھر سلیقہ مند بھی تھی۔ پھیلا داتو برداشت ہی نہیں کرتی تھی۔

حقیقتاً اس کی طرف سے کبھی اس کے میاں کمال حسن اور دیور دانیال حسن کو شکایت کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لئے یہ محض اس کی خوش فہمی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ دانیال کی شادی کے لئے حنا کا نام لے گی تو دونوں بھائی بلا چون و چرا مان جائیں گے۔

اور ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ اگر جو دانیال کی زندگی میں ثانیہ نہ آئی ہوتی۔ پھر ابھی اس نے اشارتا بھی سیماس کو یہ سگنل نہیں دیا تھا کہ وہ اپنے لئے جیون ساتھی کا انتخاب کر چکا ہے، نہ ہی اس کی کسی حرکت سے سیماس کو شبہ ہوا تھا۔ جب ہی رات کے کھانے پر اپنا مقصد بیان کرنے سے پہلے اس نے تمہید بانجھی تھی۔

”تم میری اچھی خاصی پریذکرا دیتے ہو دانیال.....! میرا ایک پیر کچن میں ہوتا ہے، دوسرا تمہارے کمرے میں۔ اب خدا کے لئے خود سے ناشتہ کھانے پر آنے کی عادت ڈال لو۔“

”جی.....؟“

دانیال نے کن اکھبوں سے کمال حسن کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا لوگے؟ چاول یا روٹی؟“

سیمائے اس سے پوچھا تو وہ جلدی سے بولا۔

”بس! تھوڑے سے چاول!“

”تھوڑے سے کیوں؟ پیٹ بھر کر کھاؤ!“

کمال حسن نے کہا تو سیمائے خیر انداز میں کہنے لگی۔

”آپ سمجھے نہیں کمال! اصل میں اب اسے میرے ہاتھ کا کھانا اچھا نہیں لگتا۔ کچھ نیا پین چاہ رہا ہے۔“

”نیا پین؟“

کمال حسن نے دانیال کو دیکھا، پھر سمجھ کر بولے۔

”اوہ! یہ تو اچھی بات ہے۔ پھر دیکر بات کی ہے؟“

”کسی بات کی نہیں!“

سیمائے فوراً بولی تھی۔

”میں تو خود کب سے کہہ رہی ہوں کہ دانیال اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہے۔ اب اس کی شادی کا

سوچیں، لیکن آپ سنتے ہی نہیں!“

”سن تو رہا ہوں۔“

کمال حسن، سیمائے کہہ کر دانیال کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہاں بھئی! دانیال! لڑکی وڑکی دیکھی جائے؟“

”جی؟“

اس نے شپٹا کر سیمائے کو دیکھا تو وہ ہنس کر بولی۔

”شرما کیوں رہے ہو؟ بتا دو اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو؟“

”جی وہ وہ۔۔۔“

وہ کمال حسن کے سامنے کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔

”ہاں ہاں! بتاؤ!“

کمال حسن نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مارا تو وہ رُک کر بولا تھا۔

”جی وہ۔۔۔ ثانیہ۔۔۔ ثانیہ نام ہے اس کا۔“

”ٹانیہ؟“

سیمائے اندر یک لخت جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔

”یہ ثانیہ کون ہے؟ میں نے تو پہلے یہ نام کبھی نہیں سنا۔؟ خاندان کی ہے؟“

”نہیں بھابی! وہ ہمیں آگے خوبصورت صاحب رہتے ہیں ناں! ان کی بیٹی ہے۔ بھائی! آپ تو

ماید جانتے ہوں گے خوبصورت صاحب کو؟ محلے میں بڑی عزت ہے ان کی۔“

وہ کمال حسن سے مخاطب ہو گیا تھا اور سیمائے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ فوراً مخالفت کر

لے وہ ان بھائیوں کی نظروں میں بری بھی نہیں بننا چاہتی تھی، اس لئے برتن رکھنے کے بہانے وہ وہاں سے اٹھ گئی

تھی۔

پھر اسے زیادہ غصہ اپنے آپ پر تھا کہ اس نے کیوں دانیال کی پسند پوچھی؟ پہلے ہی حنا کا نام لے

لیتی۔ اگر دانیال مال منول کرتا بھی تو کمال حسن ضرور اس کی حمایت کرتے۔ اس وقت وہ بیٹھی تھلا رہی تھی کہ حنا کا پارٹی

ہوئی آگئی۔

”آپا! آبا!“

سیمائے اندرونی کشش کے باعث بے دھیانی میں حنا کو دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا آپا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“

حنائے قریب آ کر پوچھا تو چونکنے کے ساتھ وہ نظریں چرا گئی۔

”ہاں بس!“

”کیا بس؟ مجھے تو آپ ٹھیک نہیں لگ رہی ہیں۔ ٹینشن میں لگ رہی ہیں۔ کوئی بات ہوئی ہے

ایا؟“

حنائے مسلسل اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ہوں؟ نہیں! کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس! ایسے ہی سر میں درد ہو رہا ہے۔“

وہ ابھی حنا کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن حنا بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”آپا! اب کیا آپ مجھ سے بھی چھپائیں گی؟“

”اوہو! تم تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔“

وہ جھنجھلا گئی۔

”جب پتا ہے کہ میں بات جانے بغیر پیچھا نہیں چھوڑوں گی تو بتا دیں!“

”ابھی نہیں! بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے میں اس کا پتہ صاف کر لوں۔“

وہ بے اختیار کہہ گئی۔

”پتہ صاف کر لوں؟ کس کی بات کر رہی ہیں؟ پلیرز آپا! یہ اُدھوری باتیں مت کریں۔

صاف صاف بتائیں مجھے۔“

جتا بخشنے والی نہیں تھی۔
”کیا بتاؤں.....؟“

سیانے ہتھیرا ڈال دیئے۔
”مجھے دانیال سے یہ اُمید نہیں تھی۔ میں تو اسے بہت سیدھا سمجھتی تھی، لیکن وہ تو بڑا تیز نکلا۔ اتنی بڑی بات مجھ سے چھپا گیا.....؟ ہوا تک نہیں لگنے دی.....؟“
”کس بات کی ہوا نہیں لگنے دی.....؟“
حنانے زچ ہو کر ٹوکا۔

”موصوف کا دل آ گیا ہے، وہ خواجہ صاحب کی بیٹی پر.....!“
سیما تو جلعے انداز میں بولی ہی تھی، حنا بھی اُچھل پڑی۔

”کک..... کیا.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں.....؟ کس نے بتایا آپ کو.....؟“
”ارے.....! کوئی اور بتاتا تو میں کبھی یقین نہ کرتی، خود اپنے منہ سے پھوٹا ہے دانیال، اور یہ بھی کہہ گیا ہے کہ میں آج اس کا رشتہ لے کر جاؤں خواجہ صاحب کے گھر۔“
”آپا.....!“

حنار و ہانسی ہو گئی تو وہ ایک دم سنبھل کر کہنے لگی۔

”ارے.....! تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔“
”کیا کریں گی آپ.....؟ بلکہ آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔ یوں بھی آپ کے دیور صاحب مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔“

حناکا مایوسی پر اسے پتنگ لگ گئے۔

”پاگل ہو تم.....! تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا نہیں.....؟ لیکن ہاں.....! ذرا مجھے ہوشیاری سے چلنا پڑے گا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“
پھر وہ نرم پڑ کر حنا کو یقین دلانے لگی تھی کہ دانیال اسی کا ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ گھر کی جھاڑ پونچھ سے فارغ ہو کر ابھی اپنی الماری نمیک کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ رابعہ آگئی۔ اسے دیکھ کر وہ خوشی سے اُچھل پڑی اور اس کی گود سے جھپٹنے کے انداز میں شوٹی کو لے کر بولی۔
”ہائے.....! بچ، تم نے تو ہمیں ترسائی دیا ہے۔ اماں روز دن گنتی ہیں کہ رابعہ کو دیکھے ہوئے اتنے دن ہو گئے ہیں۔“

”اچھا.....!“

رابعہ ہنسنے ہوئے اماں کے گلے لگ گئی۔
”خوش رہو.....!“

اماں نے رابعہ کا سر چوم کر اسے دُعا دی۔
”اماں.....! دیکھیں تو شوٹی کتنا پیارا ہو گیا ہے۔“

اس نے شوٹی کو ہاتھوں پر اُچھالتے ہوئے کہا۔
”ماشاء اللہ.....! اللہ نظر بد سے بچائے۔“

اماں نے شوٹی کی بلانیں لیں۔ پھر رابعہ سے پوچھنے لگیں۔
”تم کس کے ساتھ آئی ہو.....؟“

”عباد چھوڑ گئے ہیں اماں.....!“

رابعہ کے جواب پر اماں متجب ہوئیں۔

”ہائیں.....؟ عباد اندر نہیں آیا.....؟“

”نہیں.....! انہیں کسی کام سے جانا تھا، شام میں آئیں گے۔“
رابعہ نے سہولت سے بتایا تو اس بار وہ بول پڑی۔

”اب تم شام میں عباد بھائی کے ساتھ چلی مت جانا۔ اتنے دنوں بعد آئی ہو، رکوگی ناں.....؟“

”ہاں.....! میری ساس کو چاہتی نہیں ہو.....؟ ابھی بھی آ رہی تھی تو بار بار کہے جا رہی تھیں کہ جلدی آنا۔“
رابعہ شاید کچھ زیادہ ہی جلی بکھٹی ہوئی تھی، جو اماں کے سامنے ہی کہہ گئی۔

”غلطی تمہاری ہے۔ خواہ مخواہ اتنا ڈرتی ہو۔ کیا عباد بھائی بھی تمہاری طرف داری میں کچھ نہیں بولتے.....؟“

”وہ کیا بولیں گے.....؟ وہ تو خود اپنی اماں سے اتنا ڈرتے ہیں۔“

”تو ایسا کرو.....“

وہ کوئی مشورہ دینے جا رہی تھی کہ اماں نے ٹوک دیا۔

”بس ثانیہ.....! تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ لاؤ شوٹی کو مجھے دو، اور بہن کے لئے شربت بنا لاؤ۔“

”اماں.....! آپ بھی بس.....“

وہ شوٹی کو اماں کی گود میں ڈال کر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اسے رابعہ سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ اپنی زندگی میں آنے والے نئے موڑ کے بارے میں بھی بتانا تھا، لیکن اماں رابعہ کے پاس سے اُٹھ ہی نہیں رہی تھیں۔ تب

وہ کھانا پکانے میں لگ گئی۔ پھر کھانے کے بعد جب اماں نماز کے لئے انھیں تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، رابعہ اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولی تھی۔

”تو اب تم بھی پرائی ہونے والی ہو.....؟“

”کیا مطلب.....؟“

وہ اس اچانک بات پر بوکھلا گئی تھی۔

”مطلب یہ کہ حمیدہ خالہ نے تمہارے لئے کوئی پروزل بتایا ہے۔ اماں، ابا آج کل اسی پر غور کر رہے

ہیں۔“

رابعہ نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا تو وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

”سک..... کیا.....؟ یہ کس نے کہا تم سے.....؟“

”اماں نے.....! ابھی وہ یہی باتیں تو کر رہی تھیں۔“

رابعہ مزے سے بتاتے ہوئے اچانک ٹھٹکی تھی۔

”تم پریشان کیوں ہو گئیں.....؟ کوئی اور چکر ہے کیا.....؟“

وہ نظریں چرا کر اٹھنے لگی تھی کہ رابعہ نے پھر اس کا ہاتھ کھینچ لیا۔

”پاگل مت بنو نا تیر.....! اچھا تو کی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ کیونکہ اماں، ابا حمیدہ خالہ کے بتائے ہوئے

پر پوزل پر سنجیدہ ہو رہے ہیں۔“

”نہیں رابعہ.....! تم..... میرا مطلب ہے تم روکو اماں کو، بلکہ وہاں منع کروادو.....!“

وہ پریشانی سے بولی۔

”وہ تو میں منع کروادوں گی، لیکن یہ بھی تو پتا چلے، ہاں کہاں بھروانی ہے.....؟“

رابعہ نے شرارت سے اس کے بازو میں چٹکی کاٹ کر پوچھا تو وہ قصداً بے نیازی سے بولی۔

”جہاں بھروانی ہو گی، بتادوں گی۔“

”ٹھیک ہے.....! پھر اماں ہی کو بتادینا۔ کیونکہ میں تو اتنی جلدی جلدی نہیں آسکتی۔“

رابعہ نے اس سے زیادہ بے نیازی دکھائی تو وہ دانت پیس کر بولی۔

”زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھی.....؟“

”کیوں.....؟ تم اتراسکتی ہو، میں کیوں نہیں اتراسکتی؟ بتانا ہے تو ابھی بتاؤ تا کہ میں اماں کے کان

میں بات ڈالتی جاؤں، ورنہ ایسا نہ ہو، اگلی بار میں آؤں تو پتا چلے اماں، ابا نے تمہاری بات پکی کر دی ہے۔“

رابعہ نے اسے متوقع صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ خائف ہو گئی۔

”اچھا بس.....! چپ ہو جاؤ.....!“

رابعہ نے بے اختیار اپنے ہونٹوں پر اُننگی رکھ لی، پھر آنکھوں سے اسے بتانے کا اشارہ کیا تو وہ جھینپ کر بولی۔

”وانیاں.....! وانیاں حسن.....!“

”ارے.....! یہ تو بڑا افانوی سامنا ہے۔ کون ہے.....؟ کیسا ہے.....؟ کہاں ملا.....؟“

رابعہ نے نام سے متاثر ہو کر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تو وہ پہلے ہنسی، پھر پہلی ملاقات سے جو بتانا شروع ہوئی تو اس کی داستان ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام کو بڑے بھیا آئے، ساتھ میں بھابی اور بچے بھی تھے۔ اسے دیکھ کر جس طرح بھابی معنی خیز مسکرائیں، اس سے وہ سمجھ گئی کہ ضرور کوئی بات ہے اور یقیناً امی نے انہیں خاص طور پر بلوایا ہے۔ پھر بھی اپنے طور پر وہ انجان سی بنی رہی۔ کچھ دیر سب کے ساتھ بیٹھی، پھر رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں کچن میں آ گئی، اور ابھی وہ چاول نکال ہی رہی تھی کہ بھابی اس کے پیچھے آ گئیں۔

”کیا پکا رہی ہو.....؟“

وہ آتے ہی پوچھنے لگیں۔

”مٹر پلاؤ، اور.....“

”بس.....! مٹر پلاؤ ہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اہتمام مت کرنا۔“

”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ ہم کوئی مہمان نہیں ہیں۔“

پھر مسکرا کر بولیں۔

”البتہ تم اب مہمان ہو۔“

”میں.....؟“

وہ سمجھ کر بھی انجان بنی۔

”اب بنومت.....!“

بھابی نے شرارت سے گھوڑا۔

”اتنے دنوں سے بات چل رہی ہے، آخر تمہیں کچھ تو خبر ہو گی.....؟“

”نہیں بھابی.....! مجھے واقعی کچھ پتا نہیں۔ بس ایک روز چنکی نے بتایا تھا کہ ابا اپنے کسی دوست کے بیٹے

کا ذکر کر رہے تھے۔“

وہ صاف گوئی سے بولی۔

”ہاں..... اور امی نے آج مجھے اسی لئے بلایا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں۔“

”صرف بتا دوں.....؟“

اس نے سوچا اور سوالیہ نظروں سے بھابی کی طرف دیکھا تو وہ تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”لڑکے کا نام جہانزیب ہے اور بینک میں منجر ہے۔ زیادہ لمبی چوڑی فیملی بھی نہیں ہے۔ بس دو بہنیں ہیں اور دونوں شادی شدہ ہیں، البتہ چھوٹا بھائی ہے جو آج کل نوکری کی تلاش میں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کوئی خاص ذمہ داری نہیں ہے اس پر تھوڑا بہت اس کے والد بھی کمالیتے ہیں اور اس کی والدہ بھی اچھی خاتون ہیں۔“

بھابی خاموش ہوئیں، تب بھی وہ اسی طرح ان پر نظریں جمائے بیٹھی رہی، کیونکہ جو بات وہ جانتا چاہتی تھی، وہ تو بھابی نے بتائی ہی نہیں تھی۔

”اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

بھابی اس کے دیکھتے رہنے پر جو سمجھیں، اسی حساب سے کہا تو وہ نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے پوچھنے

لگی۔

”آپ نے اسے دیکھا ہے.....؟“

”کسے؟ اچھا اچھا..... کیا تم جہانزیب کا پوچھ رہی ہو.....؟ ہاں..... میں نے دیکھا ہے، خاصا

بینڈم ہے۔“

پھر سرگوشی میں پوچھنے لگیں۔

”کیا تم بھی دیکھنا چاہتی ہو.....؟“

”ہاں.....!“

وہ آہستہ سے بولی۔

”میں نے تمہارے بھیا سے پہلے ہی کہا تھا، اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ کہتے گئے کہ جب جہانزیب نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی اور اپنے والدین کی پسند کو قبول کر رہا ہے تو ہمیں بھی ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہئے۔“

”اس لئے کہ ہم لڑکی والے ہیں۔“

”شاید.....! بہر حال، تم فکر مت کرو۔ جہانزیب واقعی بہت اچھا لڑکا ہے۔“

بھابی کا انداز تسلی دینے والا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر چاول چننے میں مصروف ہو گئی۔ تب کچھ دیر بعد

بھابی کہنے لگی۔

”ویسے اسے دیکھنا کوئی اتنا مشکل نہیں ہے۔ جس اسکول میں تم جاتی ہو، اس سے بس ایک اسٹاپ آگے

نی تو اس کا بینک ہے۔ چاہو تو کسی دن جا کر نہ صرف دیکھ لینا، بلکہ مل بھی لینا۔“

”نہیں بھابی.....! یہ مناسب نہیں ہے۔ کیا سوچے گا وہ کہ.....“

”بیوقوف.....!“

بھابی فوراً ٹوک کر بولیں۔

”میرا مطلب ہے، اپنا تعارف کروائے بغیر اسے دیکھ آنا، یا پھر انتظار کرو۔ ہو سکتا ہے کسی دن وہ گھر

آجائے۔ ویسے بھی اس کے یہاں آنے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے ناں.....!“

”چھوڑیں بھابی.....! آپ نے تو اس بات کو سمجیدگی سے ہی لے لیا۔“

وہ موضوع ختم کرنے کی غرض سے بولی۔

”کیا مطلب.....؟ یعنی میں تو تمہاری خواہش کو سمجھتے ہوئے تمہارا ساتھ دے رہی ہوں اور تم.....“

بھابی نے براہ راستے ہوئے کہا تو وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔

”پلیز.....! روٹھے نہیں، میں جانتی ہوں آپ میری بہت اچھی بھابی ہیں۔“

”چلو.....!“

”ایسے نہیں، پہلے ہنس کر دکھائیں۔“

اس کے گدگدانے پر بھابی ہنس پڑیں۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح سہا سے کھد آیا تھا کہ وہ آج خواجہ صاحب کے ہاں چلی جائے اور کیونکہ سہا نے بھی بڑے جوش سے ہامی بھری تھی، اس لئے وہ آفس ہی میں اس کے فون کا منتظر تھا کہ وہ خواجہ صاحب کے ہاں سے آکر شام تک انتظار نہیں کرے گی اور ابھی اسے خوش خبری سنائے گی۔ اس انتظار میں اس کا کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار ٹیلی فون اٹھا کر چیک کرتا۔

آخر صبر نہیں ہوا تو جلدی جلدی ایک دوسروں کی کام نمٹا کر گھر چلا آیا اور لاؤنج ہی سے ”بھابی.....!“

بھابی.....!“ پکار تے ہوئے سہا کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ اسے بیڈ پر لیٹی نظر آئی۔

”ہیں.....؟“

وہ حیران ہوا۔

”کمال ہے بھابی.....! آپ اتنے آرام سے لیٹی ہیں.....؟ میرا تو خیال تھا آپ میرے انتظار میں

بے چینی سے ٹہل رہی ہوں گی.....؟“

”کیوں.....؟ آج تم نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے کیا.....؟“

سیما سمجھ کر بھی انجان بن گئی، لیکن وہ اپنی دھن میں بولا تھا۔

”میں تو اسے کارنامہ ہی کہوں گا۔ البتہ میرے کارنامے کو پایہ تکمیل تک آپ نے پہنچانا ہے۔“

”سم..... میں سمجھی نہیں! تم کس کارنامے کی بات کر رہے ہو.....؟“

سیما نے مزید الجھنے کی ایکٹنگ کی۔

”کیا مطلب.....؟ آپ واقعی نہیں سمجھیں.....؟ یا مجھے تنگ کر رہی ہیں.....؟ آپ کو خواجہ صاحب کے

ہاں جانا تھا۔“

اس نے زور دے کر کہا۔

”اچھا.....! ہاں.....! تو تم اسی لئے آفس سے جلدی آگئے ہو.....؟“

سیما نے بھیجے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا تو وہ فوراً بولا۔

”جی.....! آپ بتائیے.....! کیا پروگرام ہے.....؟“

”بھئی.....! میرا تو پکار پروگرام تھا، کپڑے بھی استری کر لئے تھے لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

اس نے بے صبری سے ٹوکا تو سیما اٹھنے کی کوشش میں کراہ کر بولی۔

”میرا جیر سلپ ہو گیا، کمر میں کافی جوت آئی ہے۔ اب چلنا تو کیا، اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔“

”اوہ.....!“

وہ پریشان ہو گیا۔

”تو بھابی.....! آپ مجھے اسی وقت فون کر دیتیں، میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلا۔“

”تمہارے بھیا آگئے تھے، لیکن ڈاکٹر کے پاس جانے کی میری ہمت نہیں تھی۔ خیر.....! وہ دوا لے

آئے تھے۔ شام تک دیکھو، اٹھنے کے قابل ہوئی تو چلی جاؤں گی۔“

”ارے.....! انہیں بھابی.....! ابھی آپ آرام کریں۔ جب فٹ فاٹ ہو جائیں، جب جائے گا، اور

کوئی میڈیٹن وغیرہ لانی ہے تو بتائیں!“

”نہیں.....! تنہا.....! بھیلے آئے تھے۔“

”تیلیں.....! آپ آرام کریں۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے لیجئے

گا۔“

وہ پورے غلوں سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ جتنا وہ مخلص تھا، تو دوسرے کو بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔

اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ سیما اس کے لئے کیا سوچے بیٹھی ہے.....؟ جبکہ اس کا دھیان ثانیہ کی طرف سے

ہٹ گیا تھا اور وہ سیما کے لئے پریشان ہو رہا تھا۔ کمرے میں آ کر بھی وہ الٹ بیٹھ گیا کہ کسی وقت بھی سیما پکار سکتی

تھی، اور سیما نے تو نہیں پکارا، حنا اس کے لئے چائے لے کر آگئی تو وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

”آپ کب آئیں.....؟“

”میں اتفاق سے یونیورسٹی سے ادھر ہی آگئی تھی۔ دیکھا تو آپاگری پڑی تھیں۔ میں نے جلدی سے ڈلہا

بھابی کو فون کر کے بلالیا تھا۔“

حناتا تے ہوئے بیٹھ گئی تو اس نے جزیب ہو کر چائے کا کپ اٹھا لیا تھا۔

”آج آپا کا سارا پروگرام چوٹ ہو گیا۔“

حناتا نے کہا تو وہ نا سمجھے ہوئے بولا۔

”جی.....؟“

”ہاں.....! آپا بتا رہی تھیں، انہیں آپ کا پروزل لے کر جانا تھا۔ بہت خوش ہو رہی تھیں آپا، لیکن بے

چاری سلپ ہو گئیں۔“

حناتا کی بات سن کر وہ خاموش ہو رہا تو قدرے رک کر وہ پھر کہنے لگی۔

”ثانیہ نام ہے نا اس لڑکی کا.....؟ میں اسے جانتی تو نہیں ہوں، لیکن اکثر نظر آتی ہے۔“

اس نے ٹوٹس نہیں لیا تو پوچھنے لگی۔

”آپ نے کہاں دیکھا تھا ثانیہ کو.....؟“

”جی.....؟“

اس کے چوٹنے پر حنا فٹس کر بولی۔

”ارے.....! آپ کن خیالوں میں گم ہیں.....؟ میں کب سے آپ سے بات کر رہی ہوں۔“

”سوری.....! میں آپ کی بات نہیں سن سکا۔“

وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا، پھر چائے کا کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے بولا۔

”مانٹنٹ کیجئے گا، مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ اور ہاں.....! بھابی کا خیال رکھئے گا۔“

”آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی بھابی میری بھی کچھ لگتی ہے۔“

وہ اندر ہی اندر تمللا کر بولی تھی۔

”جب ہی تو میں اطمینان سے جا رہا ہوں۔“

وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔ حالانکہ ابھی اسے کہیں نہیں جانا تھا۔ اس وقت کوئی دوست بھی نہیں مل

سکتا تھا۔ کیونکہ دن کے تیسرے پہر سب ہی آفس میں مصروف ہوتے تھے۔ وہ صرف اس لڑکی حنا سے بھاگ کر نکلا

تھا۔ وہ اس کی زبردستی فری ہونے کی کوشش سے سخت نالاں تھا۔ اگر وہ سیما کی بہن نہ ہوتی، تب تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اب مجبوراً اسے نہ صرف برداشت کرنا پڑتا، بلکہ اخلاقاً بھی تنہا نے پڑتے تھے، جس کے لئے اسے خود پر بہت

جبر کرنا پڑتا تھا۔

ابھی بھی وہ محض اس کی وجہ سے بلا وجہ سڑکیں ناپتا پھر رہا تھا۔ پھر شام میں وہ ایک ریستورینٹ میں جا بیٹھا تو وہاں اتفاق سے ایک دوست مل گیا جس کے ساتھ باتوں میں وقت کا پتا نہیں چلا۔ کھانا بھی وہیں کھالیا، اور جب گھر لوٹا تو گیارہ بج رہے تھے۔ خاموشی سے وہ یہی سمجھا کہ سب سو چکے ہوں گے، اس لئے سیدھا اپنے کمرے میں آ رہا تھا کہ نہ صرف ٹھکا، بلکہ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کی آرام دہ چیز پر حنا بیک پر سڑکائے سو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا اسے کرسی سمیت اٹھا کر باہر بھینک دے۔ بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے زور سے کھانا تو حنا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولی۔

”سوری.....! وہ..... پڑھتے پڑھتے میری آنکھ لگ گئی۔“

”لیکن اس وقت آپ کو میرے کمرے میں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

وہ کسی طرح اپنی ناگواری چھپا نہیں سکا۔

”معاف کیجئے گا، میں شوق سے یہاں نہیں بیٹھی تھی۔ مجھے آپانے کہا تھا کہ میں آپ کا انتظار کروں اور آپ کو کھانا کھلا کر سوؤں۔“

اس کی ناگواری دیکھتے ہوئے حنا بھی تنک کر بولی تھی۔

”شکریہ.....! میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔“

”یہ اگر آپ جاتے ہوئے کہہ کر جاتے کہ کھانے کے لئے آپ کا انتظار نہ کیا جائے تو میں بھی اس ذلت سے بچ جاتی۔“

حنا کی بات پر وہ پکرا گیا۔

”ذلت.....؟“

”تو اور کیا.....؟ عزت افزائی تو نہیں کی آپ نے میری.....؟“

حنا کا انداز ہنوز تھا۔ دانیال کو احساس ہوا کہ وہ غلطی ہی ہو کر گیا ہے۔

”آئی ایم سوری.....! میں اصل میں آپ کو یہاں دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔“

”کیوں.....؟ خود پر بھروسہ نہیں ہے کیا.....؟“

وہ چوٹ لگانے سے باز نہیں آئی۔ پھر فوراً ”گڈ نائٹ“ کہہ کر چلی گئی تو کتنی دیر وہ اس کے پیچھے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر پہلے خود کو نال کیا، اس کے بعد کارڈ لیس اٹھا کر تانیہ کا نمبر ڈائل کیا تو ادھر تیل جاتے ہی اس نے فون اٹھایا تھا۔

”انتظار کر رہی تھی.....؟“

اس نے کہا تو وہ دھیر سے بولی تھی۔

”ہاں.....! بہت دیر ہے۔“

”سوری.....! میں اصل میں ایک کام میں پھنس گیا تھا۔“

”میں سمجھ گئی تھی، ایسی ہی بات ہوگی، اور میں نے آپ سے شکوہ تو نہیں کیا۔“

تانیہ نے کہا تو وہ سانس کھینچ کر بولا۔

”تمہاری یہی بات تو مجھے اچھی لگتی ہے۔ ویسے کبھی کبھی شکوہ کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، کر سکتی

ہو۔“

”اچھا.....!“

اس کی دہلی دہلی ہنسی میں وہ کھو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی اماں، ابا کی باتیں سن رہی تھی۔ ناشتہ کرتے ہوئے ابا، اماں سے پوچھ رہے

تھے۔

”پھر حیدرہ کا فون نہیں آیا کیا.....؟“

”ہاں.....! میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ کل بھی اس کا فون آیا تھا۔“

”اچھا.....! کیا کہہ رہی تھی.....؟“

”وہی جواستے دنوں سے کہہ رہی ہے کہ جا کر لڑکے کو دیکھ آئیں۔ پھر جو چھان بین کرنی ہو، وہ بھی کر

لیں۔“

اماں نے بتایا تو ابا نے غالباً اثبات میں سر ہلایا تھا، جب ہی ان کی آواز نہیں آئی تھی۔ پھر اماں بولی

تھیں۔

”بچ پوچھیں تو میرا دل تو ڈرتا ہے۔ انجان لوگوں کا کچھ بتا نہیں چلتا۔ پہلے کیسے نظر آتے ہیں، بعد میں کیا

لکھتے ہیں.....؟ رابعہ کا حال نہیں دیکھا.....؟“

”سب نصیب کی باتیں ہیں بیگم.....! قسمت ساتھ نہ دے تو اچھے کو برا بنے میں دیر نہیں لگتی۔“

ابا کی بات پر اماں کڑھ کر بولی تھیں۔

”تو کیا میں یہ سوچ کر صبر کر لوں کہ رابعہ کا نصیب ہی برا ہے.....؟“

”یہ میں نے کب کہا.....؟ دُعا کرو، اللہ بڑا کارساز ہے، اور دیکھو، ہم اس ڈر سے کہ کہیں تانیہ کا نصیب

بھی رابعہ جیسا نہ ہو، تانیہ کو بٹھائے تو نہیں رکھیں گے ناں.....؟“

”نہیں.....! کیوں بٹھائے رکھیں گے.....؟ میں تو خود چاہتی ہوں اب جلدی تانیہ کی شادی ہو

جائے۔“

”اسی لئے تو میں حمیدہ کا پوچھ رہا تھا۔ فون کر کے اس سے لڑکے کا اتنا پتا معلوم کر لو، میں چھان بین کرنے کے ہی انہیں گھر بلاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے.....! میں آج ہی حمیدہ سے معلوم کر لیتی ہوں۔“

اماں کی بات سن کر وہ پریشان ہو گئی۔ کیونکہ رابعہ نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ اماں کو دانیال کے بارے میں بتا کر جائے گی۔ پتا نہیں وہ بھول گئی یا اماں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ بہر حال نہ صرف پریشان تھی، بلکہ اب یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے.....؟

رابعہ کو فون تو کر سکتی تھی لیکن ادھر اس کی ساس رابعہ سے بات ہی نہیں کرنے دیتی تھیں، اور اماں سے وہ خود پوچھ نہیں سکتی تھی۔ اسی پریشان میں کھڑی تھی کہ اماں آ کر پوچھنے لگیں۔

”کیا کر رہی ہو غائیہ.....؟“

”کچھ نہیں اماں.....! آپ بتائیں کیا کام ہے.....؟“

اس نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

”وہ..... میں یہ کہہ رہی تھی کہ درزن کے ہاں چلی جاؤ۔ کمیٹی کے پیسے دینے ہیں اور ایک دوسوٹ بھی سٹے دے دو۔“

اماں نے کہا تو وہ ٹھٹک کر پوچھنے لگی۔

”سوٹ.....؟ سوٹ کون سے.....؟“

”میں ابھی دیتی ہوں۔“

اماں نے کہہ کر الماری کھولی اور دوسوٹ شاپر میں ڈال کر اسے تھاتے ہوئے بولیں۔

”بہت دن لگا دیتی ہے درزن، ابھی دو گی تو پتا نہیں کب سی کر دے گی، اور یہ کمیٹی کے پیسے بھی دے دینا۔“

وہ جیسے سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔ لہاں کے ہاتھ سے پیسے لے کر بولی۔

”آپ بھی جلیں اماں.....! پچھلی بار درزن خالہ آپ کا پوچھ رہی تھیں۔“

”ارے بیٹا.....! مجھ سے کہاں اتنا چلا جاتا ہے.....؟ تم جا کر دے آؤ، اور دیکھو.....! بیٹھ مت جانا

وہاں۔“

”کیا کروں.....؟ درزن خالہ کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔“

وہ چادر اوڑھتے ہوئے بولی۔

”اچھا جاؤ.....! میں جب تک برتن دھو لیتی ہوں، پھر تم آ کر کھانا بنا لیا۔“

”ارے.....! نہیں اماں.....! آپ بیٹھیں آرام سے، میں آ کر برتن بھی دھولوں گی۔ سن رہی ہیں ناں

آپ.....؟“

”ہاں ہاں.....! جاؤ.....!“

”بس.....! میں ابھی گئی اور ابھی آئی۔“

وہ کپڑوں کا شاپر اٹھا کر تیزی سے نکلی تھی۔

☆.....☆.....☆

سیما کے زور زور سے پکارنے، حنا بھاگی آئی تھی۔

”کیا ہے آپا.....؟ کیوں اتنا شور مچا رہی ہو.....؟“

”تم کہاں تھیں.....؟ کب سے پکار رہی ہوں۔“

سیما نے چڑ کر پوچھا۔

”کچن میں تھی۔“

حنا بھی جل کر بولی تھی۔

”بس آپا.....! اب آپ اٹھ جائیں۔ آپ کا یہ ڈرامہ زیادہ دن چلنے والا نہیں ہے۔“

”ارے.....! اصل ڈرامہ تو اب شروع ہوگا۔ یہ ڈھونگ تو میں نے اس لئے رچایا تھا کہ فوری طور پر کچھ

میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں.....؟“

سیما کی آنکھیں اپنے کسی پلان پر جھکنے لگی تھیں۔

”اچھا.....! اب کیا سمجھ میں آیا ہے.....؟“

حنا فوراً اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”کیا کرنے کا ارادہ ہے.....؟“

”ابھی تو میری بہن.....! وہی کرنا پڑے گا جو دانیال چاہ رہا ہے۔“

سیما نے کہا تو حنا اچھل پڑی۔

”کیا مطلب.....؟ یعنی آپ دانیال کا پروزل لے کر جائیں گی.....؟“

”ہوں.....! جانا تو پڑے گا۔“

سیما پڑ سوچ انداز میں سر ہلانے لگی۔ پھر حنا کو دیکھ کر بولی۔

”کمال بھی ساتھ جانے کو تیار ہیں۔ صبح آفس جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ جلدی آ جاؤں گا، پھر خوبہ

صاحب کے ہاں چلیں گے۔“

”پھر تو آپا!..... آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔“

حنانا پس ہو گئی، پھر کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے مجھے اماں کی بات مان لینی چاہئے۔“

”کون سی بات.....؟“

سیمانے چونک کر پوچھا تھا۔

”وہ..... میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا، بدر صاحب کی بیگم میرے لئے آئی تھیں، اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر.....؟ اماں نے ابھی تک انہیں جواب نہیں دیا۔“

حنانے یاد دلاتے ہوئے بتایا تو سیمانہ جھجھلا کر بولی۔

”کیوں.....؟ کیوں لٹکا کر رکھا ہوا ہے اماں نے انہیں؟ لگتا ہے اماں کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے.....؟“

”بھروسے کی بات نہیں ہے آپا!.....! جوابات آپ کے اختیار میں ہی نہیں ہے.....“

حنانہ جو کہ بول رہی تھی کہ سیمانے اس کی بات کاٹ دی۔

”سب اختیار میں ہے میرے۔ جان مارتی ہوں میں اس گھر کے لئے، پھر میری مرضی کے خلاف یہاں کیسے کچھ ہو سکتا ہے.....؟ اور اگر کچھ میری مرضی کے خلاف ہوا تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا، یہ تم بھی دیکھنا!“

”آپ جذباتی ہو رہی ہیں آپا!.....!“

حنانہ دھمکے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

”جذباتی ہی تو نہیں ہو رہی۔ پوری پلاننگ سے چلوں گی کہ سناپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

سیمانے آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ حنانہ کی دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

پھر کہتے بہت سارے دن گزر گئے۔ جہانزیب کی والدہ ایک روز اپنی بیٹیوں کے ساتھ آ کر اسے انگوٹھی پہنا گئی تھیں اور اس سے اگلے روز گھر کے افراد اسی سادگی سے جہانزیب کے گھر پر دم ادا کر آئے۔

”سچ جانیہ!.....! جہانزیب بھائی اتنے اچھے ہیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔“

موقع ملتے ہی چنگی نے اسے جہانزیب کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

”بالکل افسانوی کرداروں جیسے لگتے ہیں۔ اتنا اونچا قد، خوب صورت آنکھیں، سلیقے سے جھے ہوئے

بال، اور باتیں اتنے دھمکے لہجے میں کرتے ہیں کہ بندہ چپ چاپ سنا جائے۔“

پھر لہجہ بھرڑک کر بولی۔

”بس ایک خامی ہے۔“

”وہ..... وہ کیا.....؟“

وہ جو پوری توجہ سے سن رہی تھی، چونک کر پوچھنے لگی۔

”ذرا رنگ کالا ہے۔“

”کیا.....؟“

اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

”زیادہ کالا نہیں ہے، سانولا کہہ سکتی ہو۔“

اس کے چیخنے پر چنگی نے فوراً کہا، پھر شرارت سے آنکھیں نچا کر بولی۔

”اچھا ہوا میں نے تمہیں بتا دیا، ورنہ اگر تم انہیں دیکھ کر اس طرح چیخیں تو بیچارے کتنے ہرٹ ہوتے۔“

”ہکومت.....!“

وہ اپنی خجالت مٹانے کو اس پر بگڑنے لگی اور چنگی نے پرواہ نہ کرتے ہوئے گنگنا نا شروع کر دیا۔

”او..... کالا شاہ کالا

میرا کالا اے دلدار

تے گوریاں نوں پراں کرو۔“

”کیا بکواس ہے۔“

اس نے چنگی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، پھر رعب سے پوچھنے لگی۔

”سچ سچ بتاؤ، کیا واقعی ان کا رنگ کالا ہے.....؟“

”گورا ہوا یا کالا، اب کیا ہو سکتا ہے.....؟ اب تو بات چکی ہو گئی ہے۔“

چنگی کا انداز اب بھی چھیڑنے والا تھا۔

”جی نہیں.....! میں کسی کالے دولا لے سے شادی نہیں کروں گی۔“

”نہیں جانیہ.....! ایسی بات مت کرو۔“

چنگی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”جہانزیب بھائی بہت اچھے ہیں، ان کی شخصیت بہت متاثر کن ہے۔ ویسے ہی میں تم سے مذاق کر رہی

تھی۔ ان کا رنگ اتنا کالا نہیں ہے، اور میں سمجھتی ہوں کہ کالا رنگ برائیاں ہوتا۔ بس بندے کا دل کالا نہ ہو، باقی سب

خیر ہے۔“

اس نے چنگی کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ جانے کیا سمجھی کہنے لگی۔

”جتا ہے، جب ہم ان کے گھر جا رہے تھے تو تمام راستہ میں یہی سوچتی رہی کہ جہانزیب بھائی

کیسے ہوں گے.....؟ ان سے ملتے ہی سارے خدشے دُور ہو گئے۔ تم جب انہیں دیکھو گی تو اپنی قسمت پر رشک کرو گی۔“

”تم ان کی تصویر ہی لے آئیں۔“

وہ ناخنوں سے کھینچتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں بولی۔

”میں نے کہا تھا ان سے۔ کہنے لگے، تمہیں نہیں دوں گا، اور جسے چاہئے وہ خود مانگے۔ ان کا اشارہ تمہاری طرف تھا۔“

وہ بے اختیار اپنی طرف اشارہ کر گئی۔

”یعنی میں مانگوں.....؟“

”ہاں.....!“

”جی نہیں.....! مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

چنگی کے سامنے اس نے اپنے آپ کو خاصا ریزرو پوز کیا، لیکن اس کے اندر ایک باپل بچ چکی تھی کہ جس شخص کے نام کی انگوٹھی اس کی انگلی میں جگمگا رہی ہے، وہ انجانا نہیں رہا۔ پھر شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھنے کی قائل تو وہ پہلے سے تھی۔ اب چنگی کی تعریفوں نے اس کے اندر مزید اشتیاق پیدا کر دیا تھا۔ جب ہی وہ اگلے کئی دن تک انتظار کرتی رہی کہ شاید جہانزیب خود آجائے، لیکن جب وہ نہیں آیا، تب وہ بھابی کے مشورے پر غور کرنے لگی اور ابھی شش و پنج میں تھی کہ اس روز اس کی کوئی مہم صائمہ اس سے کہنے لگیں۔

”سنو.....! ذرا میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں.....؟“

”بس، یہیں اگلے اسٹاپ تک بینک جانا ہے۔“

”کیا.....؟“

وہ یوں چوکی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

”کمال ہے، تم تو یوں اچھلی ہو جیسے میں نے کوسوں دُور جانے کی بات کی ہو۔“

”نہیں.....!“ وہ تجل سی ہوئی۔

”میرا مطلب ہے، وہاں کیا کام ہے تمہیں.....؟“

”بینک میں کیا کام ہوتا ہے.....؟“

اس نے اُلٹا ٹوکا۔

”ناٹم.....؟“

وہ گھڑی دیکھنے لگی۔

”ابھی کچھ وقت ہے، جلدی چلو ورنہ بینک بند ہو جائے گا۔“

صائمہ نے کہا تو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے ساتھ چل پڑی گو کہ اس کی طرح جہانزیب بھی اس کا صورت آشنا نہیں تھا، پھر بھی اسے پہچان لئے جانے کا دھڑکا لگا رہا۔

وہ صائمہ کے ساتھ بینک میں داخل ہوئی تو اس کی کیفیت عجیب سی تھی۔ پہلے اپنے آپ کو صائمہ کے ہم چمپانے کی کوشش کی، لیکن پھر سوچا جب یہاں تک آئی گئی ہے تو جہانزیب کو بھی دیکھ لینا چاہئے۔ اس خیال کے ماتھے ہی اس نے سب سے اگ رکنی فیئر کی ٹیبل کی طرف دیکھا۔ اسی وقت صائمہ کاؤنٹر کی طرف بڑھی اور وہ بے ہالی میں چلتی ہوئی اس ٹیبل تک آ گئی۔

”جی فرمائیے.....!“

وہ جو کوئی بھی تھا، اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”جہانزیب صاحب ہیں.....؟“

وہ دل میں جس نام کو ذرا ہی تھی، زبان پر آ گیا اور غالباً وہ اس وقت شرارت پر آمادہ تھا کہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

”جی.....! میں جہانزیب ہوں۔“

”آ..... آپ.....؟“

”آپ.....“ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ نیم وا ہوئے۔

”فرمائیے.....! کیا کام ہے مجھ سے.....؟“

وہ اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔

”کک کچھ نہیں.....!“

غیر ارادی طور پر اس کا ایک قدم پیچھے کی طرف اٹھا۔

”پلیز.....!“

اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا جسے نظر انداز کر کے وہ فوراً پلٹ آئی۔ صائمہ ابھی وہیں کھڑی تھی، اس نے دل میں شکر کیا کہ اس نے اسے جہانزیب سے بات کرتے ہوئے دیکھا نہیں تھا، پھر جیسے ہی صائمہ فارغ ہوئی، وہ ہلدی سے اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔

وہ بڑی سرشاری گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اچانک ایک نیا احساس ملا تھا کہ دھڑکنیں انداز ہی بدل گئی تھیں۔ اس کا دل چاہا وہ یوں ہی بے سبب کھلکھلا کر ہنسنے، لیکن چھوٹے بھیا کو امی سے اُلٹتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر نمٹراہٹ پھیل رہی تھی، وہ بھی معدوم ہو گئی۔

”کیا بات ہے.....؟“

اس نے یوں ہی پوچھ لیا اور چھوٹے بھیا جو اس کی آمد پر ذرا دیر کو خاموش ہوئے تھے، پھر شروع ہو گئے۔
ای سے کہنے لگے۔

”اصل میں آپ لوگ چاہتے ہی نہیں کہ میں کچھ کروں۔ ابو جی ابھی تک مجھے پچہ ہی سمجھتے ہیں، حالانکہ میری عمر میں آپ لوگ بڑے بھیا کی شادی کر چکے تھے۔“

”ظاہر ہے، وہ اپنے بیروں پر کھڑا ہو چکا تھا، پھر کیوں نہ کرتے اس کی شادی؟ تم بھی کمانے لگو تو۔۔۔“

”آپ لوگ کمانے دیں تب ناں۔۔۔!“

وہ امی کی بات کاٹ کر بولے۔

”منع کیا ہے ہم نے؟“

”اور کیسے منع کیا جاتا ہے؟ میں نے جاپان جانے کے لئے ابو جی سے بات کی۔“

وہ اپنی مجبوریاں سناتے بیٹھ گئے۔

”تو تم کسی اولاد ہو جو تمہیں خود سے باپ کی مجبور یوں کا احساس نہیں۔۔۔؟ دھڑ جانیہ کی بات طے ہو گئی

ہے، اس کی شادی کریں یا تمہیں پیسہ دیں۔؟“

”جانیہ کی شادی دو سال بعد بھی ہو سکتی ہے۔“

وہ بڑے آرام سے بولے۔

”نہیں۔۔۔! جہانزیب کے گھر والے کبھی بھی اتنا عرصہ انتظار نہیں کریں گے۔ اتنی مشکل سے ایک سال

کا وقت دیا ہے انہوں نے۔“

”تو آپ منع کر دیں انہیں، ہمیں اس سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔“

”کیا۔۔۔؟“

ای لکنتی دیر تک تاسف سے انہیں دیکھنے لگیں۔

”کچھ شرم کرو تا قب۔۔۔! اب جبکہ سب کو خبر ہو گئی ہے، تو تم کہتے ہو رشتہ ہی ختم کر دیں۔؟ میں کہتی

ہوں، اگر بوڑھے باپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تو اس کے مسائل میں اضافہ بھی مت کرو، اور سن لو، آج کے بعد اگر تم

نے ایسی کوئی غلط بات منہ سے نکالی تو۔۔۔“

”امی۔۔۔!“

اس نے بڑھ کراہی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”بس۔۔۔! آپ خاموش ہو جائیں، اور چھوٹے بھیا۔۔۔! آپ امی کے سامنے کیوں جلا رہے

ہیں۔۔۔؟ یہ ساری باتیں ابو جی سے کریں۔“

”ان سے بھی کر لوں گا، ڈرتا نہیں ہوں کسی سے۔“

چھوٹے بھیا بکتے بکتے چلے گئے تو وہ امی کے سامنے آ بیٹھی۔

”پتا نہیں یہ لڑکا کب سدھرے گا۔۔۔؟ اتنی عمر ہو گئی ہے، لیکن۔۔۔“

”چھوڑیں امی۔۔۔! جب انہیں خود اپنی گزرتی عمر کا احساس نہیں ہے تو آپ کیوں پریشان ہوتی

ہیں۔۔۔؟“

”میں پریشان نہیں ہوں گی تو اور کون ہوگا۔۔۔؟ اتنی فکر تو مجھے تم دونوں بہنوں کی نہیں ہے، جتنی اس کی

ہے۔“

”کہتے کیا ہیں وہ۔۔۔؟“

”جاپان جاؤں گا، پتا نہیں کس نے دماغ میں ڈال دیا ہے کہ پچھلے ایک مہینے سے مسلسل ہی رٹ لگا رہا

ہے۔“

”تو جانے دیجئے۔“

بنا سوچے اس کے منہ سے نکل گیا۔

”لو۔۔۔ تم بھی یہی کہہ رہی ہو۔۔۔؟ کہاں سے لا کر دیں اسے بارہ لاکھ۔۔۔؟“

”میرا مطلب ہے، ان سے کہیں، پہلے یہیں کما کر اتنا پیسہ جمع کریں پھر چلے جائیں۔ آپ کو کیوں تنگ

کر رہے ہیں۔۔۔؟“

پھر موضوع بدلنے کی خاطر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”چنگی نہیں آئی ابھی۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔! اور آج تو کہہ کر گئی تھی کہ دیر سے آئے گی، شاید پرکٹیکل ہو رہے ہیں۔“

”اچھا۔۔۔!“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی، اپنی چادر تہہ کر کے الماری میں رکھی، پھر پوچھنے لگی۔

”روٹی پکانی ہے ابھی۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔! میں پکا چکی ہوں۔“

”لے آؤں۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔! مجھے ابھی بھوک نہیں ہے، تم کھانا چاہو تو کھاؤ۔“

”نہیں۔۔۔! چنگی آ جائے پھر ساتھ ہی کھائیں گے۔“

اس نے کہا اور منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے کمرے سے نکل آئی۔ پھر جب وہ منہ ہاتھ دھو کر آ رہی تھی تو

اسی وقت چنگی بھی آ گئی۔ اسے دیکھ کر وہ اندر جانے کی بجائے کچن میں آ کر کھانا لگا لے گئی۔ وہ جانتی تھی جب تک

چھوٹے بھیا کھانا نہیں کھائیں گے، امی بھی نہیں کھائیں گی۔ اس لئے پہلے چھوٹے بھیا کو ان کے کمرے میں کھانا دے آئی، پھر لاکرامی کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”میں چھوٹے بھیا کو کھانا دے آئی ہوں، اب آپ بھی کھالیں۔“
امی نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا، پھر اسی خاموشی سے کھانا کھانے لگیں۔

☆.....☆.....☆

اس نے درزن کے ہاں ہی دیکھتے تھے کہ اماں نے کون سے کپڑے سٹنے کے لئے بھیجے ہیں۔ وہ جو اس کے جینز کے لئے جمع کر رہی تھیں، ان ہی میں سے دو جوڑے تھے، جس سے وہ مزید پریشان ہو گئی تھی، اور یہ سوچتے ہوئے کہ گھر جاتے ہی راجہ کو فون کرے گی، وہ تیز قدم اٹھا رہی تھی کہ اچانک راجہ کے دیوار اسد نے سامنے آکر اس کا راستہ روک لیا۔

”کہاں جا رہی ہو.....؟“

”جی.....؟“

وہ اسد کو دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی۔ تھوک نکلتے ہوئے بے شکل بولی تھی۔

”گھا..... گھر!“

”گھا گھر.....؟“

وہ سوزنا انداز میں ہنسا، پھر گانے لگا۔

”میں نے تمہاری گھا گھر سے

کبھی پانی پیا تھا

پیا سا تھا میں

یاد کرو!“

”اُف.....!“

وہ جھکی نظروں سے اطراف میں دیکھتے ہوئے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

”بڑی آزادی دے رکھی ہے تمہارے اماں باواؤں نے تمہیں.....؟ اکیلی نکل پڑتی ہو گھر سے.....؟ پتا نہیں

ہے، زمانہ کتنا خراب ہے۔ چلو میں تمہیں گھر پہنچا دوں، بحفاظت.....!“

اس کی آفر پر وہ بے اختیار پیچھے ہٹ کر بولی تھی۔

”نہیں.....! میں چلی جاؤں گی اسد بھائی.....!“

”بھائی.....؟“

وہ دھاڑا تھا۔

”خبردار جو مجھے بھائی کہا تو، نکاح ٹوٹ جائے گا۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اسد بھائی.....“

”بس.....!“

اسد نے وارننگ کے انداز میں اُننگی اُٹھا کر دائیں بائیں بلائی۔

”کہہ دیا ناں.....! بھائی نہیں.....!“

”مجھے جانے دیں.....!“

اس نے یہ کہہ کر قدم بڑھائے تو وہ پھر سامنے آ گیا۔

”جانے دیں ناں.....! اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔“

وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”ہائے.....! اماں کے انتظار کا بڑا احساس ہے، اور جو میں یہاں دُھوپ میں جلتا ہوں، وہ کسی کھاتے

میں نہیں.....؟“

وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا تھا۔

”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟“

وہ اس کی سائیڈ سے نکل کر تفریبا بھاگ پڑی تھی اور پھر گھر میں داخل ہوتے ہی چلائے گئی تھی۔

”اماں.....! اماں.....!“

”کیا ہو گیا ہے.....؟“

اماں بوکھلا کر کمرے سے نکلیں تو وہ ایک دم ان کے سینے سے لگ گئی۔

”سمجھالیں اماں.....! اے، میں راجہ کی وجہ سے چپ رہتی ہوں۔“

”ہائیں.....؟ یہ کیا کہہ رہی ہو.....؟“

اماں اسے خود سے الگ کر کے پوچھنے لگیں۔

”کس کی بات کر رہی ہو.....؟ کسے سمجھاؤں.....؟“

”میں راجہ کے دیوار اسد کی بات کر رہی ہوں۔ جب بھی میں گھر سے نکلتی ہوں، راستے میں آجاتا ہے۔“

اس نے بتایا تو اماں اس سے زیادہ پریشان ہو گئیں۔

”ہیں.....؟ یہ کب سے ہو رہا ہے.....؟ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا.....؟“

”پہلے بتاتی تو کیا کرتیں آپ.....؟ میرا ہی گھر سے نکلتا بند کر دیتیں۔“

اس نے ناراضگی سے کہا تو اماں فوراً بولی تھیں۔

”ہاں.....! تو کوئی ضرورت بھی نہیں ہے گھر سے نکلنے کی۔“

”کیوں ضرورت نہیں ہے.....؟ ابھی بھی میں کہیں گھومنے نہیں نکلی تھی۔ درزن خالہ کے ہاں کام سے گئی تھی، اور ابھی ایسے کتنے کام ہوتے ہیں۔ کون کرے گا.....؟“

”کوئی بھی کر لے گا، تم گھر سے نہیں نکلو گی۔“

اماں نے فیصلہ سنا دیا۔

”یہ کیا بات ہوئی اماں.....؟“

اس نے احتجاج کیا۔

”اسد کو سمجھانے والا کوئی نہیں ہے کیا.....؟ آپ جا کر رابعہ کی ساس سے بات کریں۔“

”بیٹا.....! رابعہ کی ساس سے بات کرنے کا مطلب تم جانتی ہو۔ اُلتا ہمیں الزام دیں گی۔ پھر رابعہ کو

الگ پریشان کریں گی۔“

اماں نے نرم پڑ کر سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو ایسا کب تک ہوتا رہے گا.....؟ رابعہ کی ساس کے ڈر سے ہم جینا ہی چھوڑ دیں.....؟ ہوا بنا لیا ہے

آپ نے اس عورت کو۔“

وہ شے سے بیزبختی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سیما بظاہر بہت خوشی سے تیار ہو گئی تھی اور بچوں کو دانیال کے حوالے کر کے میں آئی تو کمال حسن کو آئینے کے سامنے کھڑے دیکھ کر ہنس کر کہنے لگی۔

”آپ نے تو عورتوں کو مات دے دی۔ کتنا وقت لیتے ہیں آپ تیاری میں۔ گھنٹے بھر سے آئینے کے سامنے کھڑے ہیں۔ کیا ضرورت ہے خود کو اتنا پالش کرنے کی.....؟“

”جیلز ہو رہی ہو۔“

کمال حسن اس کی طرف پلٹ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

”اصل میں تم سے برداشت نہیں ہوتا کہ میں شادی کے اتنے عرصے بعد بھی پہلے جیسا ہینڈم اور اٹریکٹو

ہوں۔ ہاں.....! البتہ تم پچھلے عرصے کے اثرات نظر آنے لگے ہیں۔“

”اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹھو.....!“

سیما استہزاء سے ہنسی تھی۔

”چلو.....! تو کسی اور سے پوچھ لیتے ہیں۔“

”بس کر دیں.....!“

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”اب چلیں.....! شام تو آپ نے یہیں کر دی ہے۔“

”لو.....! میں تو کب سے تیار کھڑا ہوں، اور ہاں.....! کچھ لے کر نہیں جاؤ گی، میرا مطلب ہے مٹھائی

و غیرہ.....؟“

کمال حسن نے چلنے پر آمادہ ہو کر پوچھا۔

”ابھی کیوں.....؟ ابھی تو ہم رشتہ لے کر جا رہے ہیں، آگے پتا نہیں وہ لوگ کیا جواب دیتے

!.....؟“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب واپس آ کر سمجھاؤں گی۔ اب چلیں پلیز.....!“

وہ یہ کہہ کر پلٹی تھی کہ کمال حسن نے اس کا بازو تھام لیا۔

”سیما.....! آئی ایم پراؤنڈ آف یو.....! تم نے جس طرح دانیال کا ایک ماں کی طرح خیال رکھا ہے،

اس نے کتنے ہم دونوں بھائی تمہارے بہت مشکور ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟ دانیال کا خیال میں نہ رکھتی تو اور کون رکھتا.....؟ اماں، ابا بیچارے تو

’اماں کو بڑا آدمی بننے دیکھنے کی حسرت لئے چلے گئے۔“

وہ وقتی طور پر مغلوب ہو گئی تھی۔

”پھر بھی آج ان کی روجھن بہت خوش ہوں گی۔ بالکل اسی طرح جیسے میں خوش ہو رہا ہوں، دانیال خوش

ہو، اور ہماری خوشیوں کا سہرا تمہارے سر ہے سیما.....!“

کمال حسن دل سے اسے سہرا رہے تھے۔

”میں سوچتا ہوں سیما.....! اگر تم دانیال کے ساتھ روایتی بھابیوں والا سلوک کرتی تو ہم دونوں بھائی

’اماں‘ انٹرب ہو جاتے۔“

”افوہ.....! یہ باتیں آپ واپس آ کر بھی کر سکتے ہیں۔ چلیں.....! دیر ہو رہی ہے۔“

وہ گھبرا گئی تھی۔ کمال حسن کا بازو تھام کر فوراً چل پڑی۔

راستے میں کمال حسن نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں بالکل اناڑی ہیں۔ لہذا وہی بات

کہی، اور وہ جب تک ٹائیہ چائے کے ساتھ دوسرے لوازمات ٹیبل پر رکھ رہی تھی تو بغور اس کا جائزہ لیتی رہی۔

’اماں‘ لے جاتے ہی اماں سے پوچھنے لگی۔

”بس یہی ایک بیٹی ہے آپ کی.....؟“

”نہیں.....! بڑی رابعہ ماشاء اللہ اپنے گھر کی ہے۔ ابھی دو سال ہوئے ہیں اس کی شادی کو، ایک بیٹا

ہے اس کا ماشاء اللہ.....!“

اماں نے بتایا تو وہ ایک نظر کمال حسن کو دیکھ کر کہنے لگی۔

”اچھا.....! ماشاء اللہ.....! ہم آپ کی بیٹی ثانیہ کے لئے آئے ہیں۔“

”جی.....؟“

اماں بے اختیار خوبصورت صاحب کو دیکھنے لگیں۔

”جی.....! میں اپنے دیور دانیال کی بات کر رہی ہوں۔“

وہ فوراً بولی۔ پھر خوبصورت سے پوچھنے لگی۔

”آپ نے تو دیکھا ہوگا دانیال کو.....؟“

”جی جی.....! بالکل دیکھا ہے، بلکہ ملاقات بھی ہوئی ہے۔“

خوبصورت صاحب نے کہا تو وہ جیسے رلیکس ہو کر بولی تھی۔

”پھر تو مجھے دانیال کے بارے میں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جی ہاں.....! دانیال سے اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ سلجھا ہوا بااخلاق لڑکا ہے۔ پھر بھی آپ ہر

نہ مانیں تو ہم کچھ وقت لینا چاہیں گے۔“

خوبصورت صاحب نے کہا تو سیمندر سے مطمئن ہو کر بولی تھی۔

”بالکل بالکل.....! وقت لیں آپ، یہ آپ کا حق ہے۔“

”شکریہ.....! آپ کچھ لیں ناں.....!“

خوبصورت صاحب نے کہتے ہوئے پیگم کو اشارہ کیا تو انہوں نے فوراً سموسوں کی پلیٹ اٹھا کر سیماء کے آگے

دی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ بڑی بے قراری سے سیماء اور کمال حسن کی واپسی کا منتظر تھا۔ جاتے ہوئے سیماء تو اسے یقین دلائی تھی

کہ وہ خوبصورت صاحب سے ہامی بھروا کر ہی آئے گی، اور اتنا تو اسے بھی یقین تھا کہ خوبصورت صاحب اسے ناپسند نہیں

کرتے۔ پھر بھی اس سے یہ وقت گزارنا دو بھر ہو رہا تھا۔ بھتیجا، بھتیجی کی دلچسپ باتوں اور شرارتوں سے بھی اب وہ نہیں

بہل رہا تھا۔ کبھی کبھڑی دیکھتا، کبھی دروازے پر نظریں جم جاتیں۔ پھر جب سیماء اور کمال حسن آئے تو وہ بے قراری

سے سیماء کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”بچوں نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا.....؟“

سیماء نے پوچھا تو اس نے کمال حسن کو اپنے کمرے میں جاتے دیکھا، پھر ایک ہی جست میں بڑھ کر سیماء کو کندھوں سے تھام لیا۔

”آپ بتائیں وہاں کیا رہا.....؟“

”ارے.....! اتنی بے صبری؟ سانس تو لینے دو.....!“

سیماء اپنے پیچھے صوفہ دیکھ کر ڈھے گئی۔

”ادھر میری سانسیں رکی ہوئی ہیں۔“

”پلیز میری اچھی بھائی.....! بتائیں ناں.....! خوبصورت صاحب نے برا تو نہیں مانا.....؟“

اس نے سیماء کے قریب گھٹنے ٹیک دیئے۔

”لو.....! برا کیوں مانیں گے.....؟ جہاں میری ہوتی ہے، وہاں پھر تو آتے ہی ہیں، اور تمہارے جیسا

انہیں کہاں لگے گا.....؟ خوش ہو گئے تھے خوبصورت صاحب اور ان کی بیگم بھی.....! لیکن.....“

سیماء نے اس کا خوشی سے دمکتا چہرہ دیکھ کر کچا تک اسے ہولا دیا تھا۔

”کیا لیکن.....؟“

”پتا نہیں کیوں سوچنے کا وقت مانگا ہے.....؟ حیرت ہے، تمہارے رشتے کے لئے سوچنا کیا.....؟ ہو سکتا

ہے خوبصورت صاحب نے اپنی بیٹی کے لئے کچھ اور سوچ رکھا ہو.....؟“

سیماء سوچتے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ وہ ایک تک اس کا چہرہ دیکھے گیا۔

”خیر.....! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں ناں.....!“

سیماء نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولی۔

”چلو جاؤ.....! بے فکر ہو کر سو جاؤ.....!“

”پہلے یہ بتائیں، پھر کب جائیں گی.....؟“

اس نے پوچھا تو سیماء نے مارنے کو ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”بتاؤں تمہیں کب جاؤں گی.....؟“

وہ ایک دم پیچھے ہٹا، پھر ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے ثانیہ کو فون کیا

”کیسے لگے تمہیں میرے بھائی اور بھائی.....؟“

اس نے چھوٹے ہی پوچھا تو ثانیہ نے حیرت کا مظاہرہ کیا تھا۔

”کیسے لگے.....؟ یہ کیسا سوال ہے دانیال.....؟ جب آپ اچھے ہیں تو آپ کے بھائی بھی اچھے ہی

لگتے۔“

”اور بھائی.....؟ بھائی کیسی لگیں تمہیں.....؟“

وہ سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

”وہ بھی بہت اچھی ہیں، اور کچھ.....؟“

ثانیہ ہنسی تھی۔

”اور یہ کہ تمہارے گھر والوں کو میری فیملی پسند آئی کہ نہیں.....؟“

”یہ تو مجھے نہیں پتا، کیونکہ میرے سامنے اماں، ابائے کوئی ذکر نہیں کیا۔“

وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

”لیکن تم ان کے چہروں سے اندازہ تو لگا سکتی ہو کہ وہ میرے پر پوزل پر خوش ہیں یا ناخوش.....؟“

اس کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ.....؟ مجھے تو اماں، ابائے کے سامنے جاتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔“

ثانیہ نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”اچھا.....!“

”آپ کوئی اور بات کریں ناں.....!“

وہ زور سے ہو کر بولی تھی۔

”اور بات یہ کہ میں ابھی سے یہ سوچنے لگا ہوں کہ جب تم اس گھر میں آ جاؤ گی تو.....“

وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا کہ ادھر سے ثانیہ نے گھبرا کر فون رکھ دیا تھا اور وہ نہ دیکھ کر بھی جیسے اسے ہی

دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمائی دل میں اُتری جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ اسکول جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی کہ امی دبے پاؤں اس کے کمرے میں آئیں اور اسے مخاطب کر

ہکے آہستہ آواز میں کہنے لگیں۔

”سنو.....! پیسے رکھ لو اور اسکول کے بعد وہیں سے بازار چلی جانا۔ دو تین اچھے سوٹ لے لینا، جینز

میں رکھنے کے لئے۔“

وہ ایک نظر پیسوں پر ڈال کر بولی۔

”اسکول سے کیوں جاؤں.....؟ شام میں آپ کے ساتھ.....“

”نہیں.....!“

امی نے فوراً ٹوکا۔

”میں نہیں جا سکتی۔“

”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ آج کل تمہارے چھوٹے بھیا اس چکر میں ہیں کہ گھر میں جو پیسہ ہے، اسے دے دیں اور

میں مسلسل اس سے یہی کہہ رہی ہوں کہ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔ اب اگر اس نے مجھے بازار جاتے دیکھ لیا تو

ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ تم بھی بہت چھپا کر لانا، اس کی نظر نہ پڑے۔“

پھر خود کلامی کے انداز میں کہنے لگیں۔

”میں چاہتی ہوں، کپڑوں اور کرکری میں جو کی بیشی ہے، وہ اسی طرح آہستہ آہستہ پوری کر دوں

تا کہ تمہارے ابو جی پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔“

اس نے اپنے آپ میں عجیب سا محسوس کیا اور نظریں چرا کر بیگ میں پیسے رکھنے لگی۔

”ناشتہ تیار ہے، کر کے جانا۔“

امی کہتی ہوئی چلی گئیں تو کچھ دیر بعد وہ بھی کمرے سے نکل آئی۔

اسکول سے بازار جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اکثر ہی اپنی ضرورت کی چھوٹی موٹی اشیاء کے لئے

وہ اور صائمہ اسکول کے بعد وہیں سے بازار چلی جایا کرتی تھیں۔ آج بھی اس کا خیال تھا کہ وہ صائمہ کو ساتھ لے

جائے گی، لیکن اتفاق سے صائمہ اسکول آئی ہی نہیں تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا، یہ کام کل پر چھوڑ دے، لیکن پھر جانے

کیا خیال آیا کہ اکیلی ہی چلی گئی۔ اکیلے خریداری کا یہ پہلا تجربہ تھا، پھر بھی وہ اطمینان سے اور جلدی فارغ ہو گئی۔

کیونکہ بلا ضرورت وہ کہیں نہیں رکی تھی۔ اپنے لئے روزمرہ کے استعمال کی کسی چیز کا خیال آیا بھی تو آئندہ پڑا لے

ہوئے لوگوں کی بھیڑ سے نکل آئی اور روڈ کر اس کرنا چاہتی تھی کہ نیلے رنگ کی گاڑی اس کے بالکل قریب آن لڑی۔

وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی اور کچھ غصے سے گاڑی کے اندر نظر ڈالی تو جہانزیب کو دیکھ کر فوراً سیدھی کھڑی ہو گئی اور وہ

گاڑی سے اتر کر سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔

”کیسی ہیں آپ.....؟“

اس نے رکی جگہ کو بھی خاص انداز دیا۔

”جی.....!“

وہ اس قدر کہہ سکی۔

”اس روز آپ اتنی جلدی چلی گئیں، مجھے لگا جیسے آپ صرف یہ رانا م پوچھنے آئی تھیں۔“

وہ کچھ نہیں بولی تو وہ اس کے پیچھے نظر دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اکیلی ہیں یا کوئی اور بھی ساتھ ہے.....؟“

”جی.....؟“

وہ بے حد گھبرا رہی تھی۔

”گو یا اکیلی ہیں۔“

وہ سمجھ کر بولا۔

”چلے..... میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“

”شکریہ.....!“

”کس بات کا؟“

”میرا مطلب ہے، میں چلی جاؤں گی۔“

وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ پر قابو پا رہی تھی۔ غالباً یہ خیال حوصلہ بخش رہا تھا کہ قریب کھڑا اجنبی اور غیر نہیں ہے، گمان بھی نہیں تھا کہ جس کے لئے وہ دل میں اپنائیت محسوس کر رہی ہے، وہ تصور سے زیادہ اجنبی اور غیر ہے۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ اگر اکیلی آسکتی ہیں تو اکیلی جا بھی سکتی ہیں، لیکن اس طرح میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔“

”جی.....؟“

وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

”میرا مطلب ہے، اس روز کی طرح آئیں بھی اور چلی بھی گئیں۔“

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

وہ جلدی سے بولی۔

”کوئی دیر نہیں ہو رہی۔ آئیے میرے ساتھ، اور جتنی دیر آپ بس کا انتظار کریں گی، اس سے پہلے میں

آپ کو گھر پہنچا دوں گا۔“

”لیکن..... لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔“

”کیوں؟“

”اچھا نہیں لگتا۔“

”چلے، تو پھر ایک کپ چائے؟“

اس نے سامنے کینے کی طرف اشارہ کیا، پھر بہت اصرار سے اسے لے آیا اور اس کے سامنے بیٹھتے

ہوئے جہاں وہ اندر ہی اندر ڈر رہی تھی، وہاں اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

وہ چائے کا آرڈر دینے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ پھر تعجب سے

بولی۔

”کیا آپ میرا نام نہیں جانتے؟“

اور وہ یقیناً شاطر تھا، فوراً جان گیا کہ وہ اس پر کسی اپنے گمان کر کے دھوکہ کھا رہی ہے اور وہ دھوکہ دینے میں ماسٹر تھا، سنبھل کر ڈنشین مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”میں آپ کے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔“

”جانیہ.....!“

”جانیہ جہانزیب.....!“

اس نے غالباً ان دو ناموں کو ڈہرا کر ڈنشین کیا۔ وہ کچھ اور سمجھ کر گلابی ہو گئی اور وہ جو اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، لمحہ بھر کو حیران رہ گیا۔

”چائے لیجئے.....!“

وہ اس کی نظروں سے گھبرا کر بول پڑی۔

”ہاں.....!“

اس نے کپ اپنی طرف کھینچا، پھر پوچھنے لگا۔

”اور کیا کیا مشاغل ہیں آپ کے؟“

آدھا دن تو اسکول میں ہی گزر جاتا ہے، اس کے بعد بس گھر کے کام۔“

وہ سادگی سے بتانے لگی۔

”پہلی کے امتحان قریب ہیں، اس لئے کہیں لکھنا بھی نہیں ہوتا، ورنہ کسی کسی دن کہیں اور نہیں تو ہم

دونوں بڑے بھیا کے گھر تو چلے ہی جاتے ہیں۔“

”میں سگریٹ پی سکتا ہوں۔“

وہ جیب سے پیکٹ نکال کر اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

”پتلی تو بتا رہی تھی، آپ سگریٹ نہیں پیتے۔“

”بس..... ابھی کبھی۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے پیکٹ دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

”میں نے منع تو نہیں کیا۔“

”منع تو نہیں کیا، لیکن اگر آپ نے تنگی کو بتا دیا تو وہ مجھے جھوٹا سمجھے گی۔“

”میں اسے نہیں بتاؤں گی۔“

”اچھا.....!“

وہ ذرا سانسہا، پھر سگریٹ نکال کر سگائے لگا۔ اس دوران وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اور جب اس نے سرواں بچا کیا تو گھڑی دیکھ کر بولی۔

”اب میں چلوں گی۔“

”پھر کب ملیں.....؟“

وہ فوراً پوچھنے لگا۔

”پتا نہیں.....!“

”ٹالنے والی بات مت کرو چانیہ.....! میں بار بار تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ لہجہ میں بے قراری سو کر بولا۔

”لیکن میں بار بار گھر سے نہیں نکل سکتی۔“

وہ متاثر ہو کر عاجزی سے بولی۔

”تو اپنا ٹیلی فون نمبر دے دو۔“

”آپ کو نمبر یاد نہیں ہے.....؟“

وہ پھر متوجہ ہوئی۔

اس معاملے میں میرا حافظہ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ لو..... اس پر نمبر لکھ دو۔“

اس نے ڈائری اس کے سامنے رکھی اور جیب سے پین نکال کر اس کے ہاتھ میں تھا دیا تو وہ نمبر لکھتے ہی

اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک منٹ.....! میں بل پے کر دوں۔“

اس نے ویٹر کو بلا کر بل پے کیا، پھر اس کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کے بعد جب تک وہ بس میں سوار نہ

ہو گئی، تب تک وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اماں بظاہر سوچوں میں گم، لیکن انتظار میں بیٹھی تھیں کہ خواجہ صاحب، ثانیہ کے لئے آنے والے دانیال کے رشتے کے بارے میں کچھ کہیں گے، اور خواجہ صاحب بھی اسی بیچ پر سوچ رہے تھے، پھر پوچھنے لگے۔

”ہاں تو بیگم.....! کیا کبھی ہو تم.....؟“

”کس بارے میں.....؟“

اماں چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔

”ارے بھئی.....! یہ جو دانیال کے بھائی بھادج آئے تھے، اس کا رشتہ لے کر.....!“

خواجہ صاحب نے کہا تو اماں نے سمجھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

”میاں.....! مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں، آپ کی زیادہ ملاقات ہے دانیال سے۔ میں نے تو بس دو

تین بار ہی دیکھا ہے اسے۔“

”ہوں.....!“

خواجہ صاحب پڑسوچ انداز میں سر ہلا کر گویا ہوئے۔

”لو کا تو اچھا ہے، پڑھا لکھا ہے۔ میرے خیال میں تو ثانیہ کے لئے بہت مناسب ہے۔“

”اگر آپ کو مناسب لگ رہا ہے تو پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے.....؟“

اماں جیسے پہلے سے رضامند بیٹھی تھیں۔

”پھر بھی بیگم.....! پہلے ثانیہ کی مرضی معلوم کر لو۔ اس کے بعد پھر دانیال کے بھائی بھادج کو کھانے پر

بلا نہیں گے۔“

”یہ ٹھیک ہے.....! لیکن اس سے پہلے آپ کو رابعہ اور اس کے میاں عباد کو بتانا چاہئے۔ ورنہ رابعہ کے

لئے نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ میاں کے ساتھ ساس بھی طعنے مارے گی کہ میکے والوں نے اسے کچھ سمجھا ہی

نہیں۔“

اماں، رابعہ کی ساس سے کچھ زیادہ ہی خائف تھیں۔

”ہاں.....! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں کہ پہلے داماد صاحب سے مشورہ کرنا چاہئے۔ خیر.....! تم کل رابعہ

کو فون کرو پتا۔“

خواجہ صاحب یہ ذمہ داری بیگم پر ڈال کر لیٹ گئے۔

”فون پر بتانا ٹھیک نہیں ہے، میں خود چلی جاؤں گی۔“

اماں نے کہا۔ خواجہ صاحب نے جواب نہیں دیا تو وہ بھی خاموش ہو رہیں۔ کیونکہ رابعہ کی ساس اور میاں

بھی جس بدلتی مظارہ کرتے تھے، وہ برداشت کرنا خواجہ صاحب کی مجبوری تھی۔ بیٹی کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ان

لوگوں کو کبھی منہ بھی نہ لگاتے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اماں ہی رابعہ کی وجہ سے مجبور تھیں، ورنہ ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ داماد سے مشورہ

کریں جو ہر بات میں کیڑے نکالنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی عادت سے واقف ہونے کے باوجود ناچار اماں کو جانا

پڑا، اور وہاں اپنے تئیں انہوں نے سمجھ داری کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ ثانیہ کا رشتہ طے کر رہی ہیں، اسی سلسلے میں

وہ جمعہ کو ثانیہ کی ہونے والی سسرال کی دعوت کر رہی ہیں اور اس ضمن میں انہوں نے رابعہ اور عباد کو بھی آنے کی دعوت

دے ڈالی تھی۔ یعنی عباد کو ناگنگ اڑانے کا موقع نہ دے کر وہ بہت خوش واپس آئی تھیں۔

لیکن ان کی خوشی بس اسی دن تک تھی کہ اگلے دن ہی رابعہ کی ساس اپنے لوفر بیٹے اسد کا رشتہ لے کر

آئیں، اور بعد ازاں کہ ہائی بھڑا کر ہی جائیں گی۔ بقول ان کے انہوں نے تو بہت پہلے سے ثانیہ کو بہو بنانے کا سوچ رکھا تھا، اور وہ رابعہ سے کہہ بھی چکی تھیں۔ جس سفید جھوٹ کو اماں جھٹلا بھی نہیں سکیں اور بڑی مشکل سے انہیں یہ کہہ کر ٹالا تھا کہ وہ خواجہ صاحب سے بات کر کے ہی انہیں جواب دیں گی۔ اور اس شام خواجہ صاحب انتہائی غصے میں دھاڑے تھے۔

”ہرگز نہیں.....! وہ آوارہ، نکما.....؟ بڑھیا کی بہت کیسے ہوئی ثانیہ کا ہاتھ مالتے کی.....؟ ابھی فون کر کے منع کر دواسے۔“

”آرام سے میاں.....! آرام سے۔“

اماں انہیں رابعہ کا احساس دلانا چاہتی تھیں، لیکن خواجہ صاحب کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہوئے، اور خود ہی فون کر کے رابعہ کی ساس کو منع کر دیا۔ اماں ہولنوں کی طرح انہیں دیکھے جارہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ سارا دن بے حد پریشان رہتی تھی کہ اگر ابانے رابعہ کی وجہ سے مجبور ہو کر اسد کے رشتے کی ہائی بھری تو وہ کیا کرے گی.....؟ لیکن ابانے ایک دم انکار کر کے جہاں اسے خوشی بخشی تھی، وہاں وہ رابعہ کے لئے پریشان ہو گئی تھی کہ جانے اس کی ساس اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی.....؟ اسے عباد بھائی پر بھی غصہ آ رہا تھا جو ہر جائز ناجائز میں بس اپنی اماں کی ہاں میں ہاں ملائے تھے۔ بیوی کی توان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اس وقت وہ رابعہ کے حالات پر کڑھ رہی تھی کہ فون کی تیل پر ایک دم اچھلی تھی۔ پھر بھاگ کر ریسورڈ اٹھایا تھا کہ اندر سے اماں پکار کر پوچھنے لگیں۔

”ثانیہ.....! کس کا فون ہے.....؟“

”میری کھیلی ہے اماں.....!“

اس نے جواب دے کر ریسورڈ کان سے لگایا تو دانیال ہنس رہا تھا۔

”اماں کو کھیلی کا نام بھی بتا دو.....!“

”پوچھیں گی تو بتا دوں گی۔“

”اچھا.....! کیا نام بتاؤ گی.....؟“

دانیال نے غصہ ہو کر پوچھا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”واہیہ.....!“

”اااا.....!“

دانیال کا ہتھیر بھی بے ساختہ تھا۔ اس نے گھبرا کر انہیں کے کمرے کی طرف دیکھا، پھر آواز دبا کر کہنے

”آپ ہنس سکتے ہیں، کیونکہ آپ کو بتائی نہیں ہے کہ آج مجھ پر کیا قیامت گزر گئی ہے.....؟“

”ارے.....! کیا ہوا.....؟“

وہ ایک دم سنجیدہ ہوا تھا۔

”بس.....! جانے دیں.....!“

اس نے کہا تو وہ بعد ہوا۔

”نہیں.....! پہلے بتاؤ.....! اب جانے بنا چین نہیں آئے گا۔“

”آپ مذاق تو نہیں اڑائیں گے.....؟“

وہ شش و پنج میں گھر کر بولی تھی۔

”مذاق کیوں اڑاؤں گا.....؟ تم بتاؤ.....!“

”وہ..... میری بہن کی ساس اپنے دوسرے بیٹے کا پر پوزل لے کر آ گئی تھیں۔“

اس نے بتانا شروع کیا ہی تھا کہ وہ بول پڑا۔

”پھر.....؟“

”پھر بس.....! ابانے انکار کر دیا۔“

”جینک گاڈ.....! تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ وہ گہری سانس کے ساتھ بولا پھر پوچھنے لگا۔

”اچھا.....! یہ بتاؤ.....! کب مل رہی ہو.....؟“

”ابھی تو نہیں.....!“

”وجہ.....؟“

”وجہ بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی اماں آرہی ہیں۔“

اس نے اماں کی چپقل کی آواز سن کر ہی کہا تھا اور فوراً ریسورڈ رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تو کچھ دیر ہی

اسے سوچ سکی، پھر دھیان رابعہ کی طرف چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رابعہ جرم نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی ساس بتول بیگم اور میاں عباد کے سامنے مجرم ہی بنی کھڑی تھی۔ خواجہ

صاحب کا انکار سن کر بتول بیگم بالکل ہی آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔ مزید رابعہ پر احسان جتاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”تم شکر کرو بہو.....! کہ میں نے اپنے اسد کے لئے پھر سے تمہارے گھر کا انتخاب کیا۔ ورنہ لوگ تو

بس گھر سے ایک بیٹی لیتے ہیں، دو بارہ ادھر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ کیوں عباد.....؟“

”بالکل بالکل.....!“

عباد نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”میرے اسد کے لئے کوئی کمی نہیں ہے۔ ہزاروں نہیں، لاکھوں میں ایک ہے۔“

”جی امی.....! مگر وہ.....“

رابعہ منمننا کر رہ گئی۔

”کیا وہ.....؟ تمہیں کوئی اعتراض ہے اس رشتے پر.....؟“

بتول بیگم دھاڑی تھیں۔

”نہیں امی.....! میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ثانیہ پر بھی لکھی.....“

رابعہ نے نہ کہہ کر بھی جتا دیا کہ اسد میٹرک فیل ہے، جس پر بتول بیگم مزید تیز ہو کر بولیں۔

”پڑھائی لکھائی کا بہت ناز ہے تمہارے میکے والوں کو.....؟ ارے.....! پڑھائی کام نہیں آتی سسرال

میں۔ پھر ہمیں کیا تم نے جاہل سمجھ رکھا ہے.....؟“

”نہیں امی.....! وہ اسد..... میرا مطلب ہے.....“

رابعہ بے بسی سے عباد کو دیکھنے لگی، لیکن وہ بول بیٹھا تھا جیسے اسے جانتا ہی نہ ہو۔

”میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میرے بیٹوں کو اُلو بنا سکتی ہو، مجھے نہیں.....! دیکھ رہے ہو

عباد.....! کسی زبان چلتی ہے تمہاری بیوی کی.....؟ ارے.....! احسان فراموش خاندان ہے ان کا۔ میں اس کے

بوڑھے ماں باپ کا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہی تھی، لیکن اس کے باپ نے مکسا جواب دے دیا۔ سن رہے ہو.....؟ اس

سے کہو ثانیہ کا رشتہ لے کر دوے ورنہ یہ بھی جا بیٹھے میکے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی.....؟“

رابعہ پریشان ہو گئی۔

”بس.....! میرا یہی فیصلہ ہے۔“

بتول بیگم نے فیصلہ سنا کر یوں مزہ موڑا کہ اب مزید کچھ نہیں سنیں گی، اور عباد بھی جیسے ان سے متفق ہو کر

اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو وہ پریشان اس کے پیچھے بھاگی آئی۔

”عباد.....! عباد.....! میری بات سنیں.....! جو کچھ امی چاہ رہی ہیں، وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔“

وہ توج اور عاجز ہو کر بول رہی تھی۔

”میں اماں اباسے صرف اسد کے رشتے کی بات کر سکتی ہوں، لیکن زبردستی ان سے منواتو نہیں سکتی۔“

”کیوں.....؟ کیوں نہیں منواتو سکتی.....؟ تم کیا بیٹی نہیں ہو ان کی.....؟“

عباد نے اُٹا اسے لٹاڑا تو وہ روہا نہ ہو گئی۔

”ہوں میں ان کی بیٹی، لیکن اب میں پہلے آپ کی بیوی ہوں عباد.....!“

”تو پھر تم پہلے اس گھر کا خیال کیوں نہیں کر رہی.....؟ تمہاری وفاداریاں مشکوک کیوں ہیں.....؟“

”میری وفاداریاں مشکوک ہیں.....؟“

وہ دُکھ سے اسے دیکھنے لگی۔

”اگر نہیں ہیں تو ثابت کرو، ساتھ دو ہمارا.....! بجائے میرا ساتھ دینے کے تم اپنے ماں باپ کی فیور کر

رہی ہو.....؟ تمہیں ان کی زیادہ فکر ہے تو جاؤ کرو ان کی فکر، رہو ان کے پاس.....!“

عباد کچھ سننے ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

”چلو اٹھاؤ شو بی کو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“

”چھوڑ آتا ہوں.....؟“

وہ سنائے میں آ گئی۔

”ہمیشہ کے لئے نہیں چھوڑ رہا، اسد کا رشتہ پکا کر کے آ جانا.....!“

”نہیں.....!“

وہ پیچھے ہٹنے لگی، لیکن عباد نے اس کی ایک نہیں سنی اور اسی وقت زبردستی اسے لے کر خواجہ صاحب کے

دراڑے پر چھوڑ گیا تھا۔ وہ جتنی بھی اس وقت اماں اباسے دیکھ کر کتنے پریشان ہوں گے اور اس کی روئی صورت

بہ لرزہ بھی جائیں گے کہ وہ کیوں بھیجی گئی ہے.....؟ اس لئے اس کے اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اگر اسد

’ن‘ قابل ہوتا تب تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ ایک نمبر کا آوارہ، بوفرتھا، اور اس کے لئے تو وہ اماں اباکو مجبور نہیں کر

اتی تھی۔ اس لئے خود پر قابو پانے کے بعد ہی وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

”ارے.....! رابعہ.....؟“

اماں نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا جبکہ خواجہ صاحب ٹھٹکے تھے۔

”السلام علیکم اباس.....!“

اس نے مسکرا کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام.....! خوش رہو بیٹا.....! یہ اس وقت.....؟“

خواجہ صاحب کو خود پوچھتے ہوئے عجیب سا لگا۔

”بس اباس.....! شو بی تنگ کر رہا تھا، اسے لے کر گھونٹے تو پھر میں آپ کے پاس آ گئی۔“

اس نے سہولت سے بات بنائی۔

”اچھا اچھا.....! عباد کہاں ہے.....؟“

خواجہ صاحب نے قدرے مطمئن ہو کر پوچھا۔

”وہ ان کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ان کی دوا لے کر گھر جائیں گے۔“

اس نے بتا کر بات بدل دی۔

”ٹائیہ کہاں ہے.....؟ کیا کر رہی ہے.....؟“

”اپنے کمرے میں ہے، بلائی ہوں۔“

اماں نے کا تو وہ فوراً بولی۔

”میں جاتی ہوں اماں.....! آپ یہیں بیٹھیں.....!“

”اچھا.....! کھانا تو کھاؤ گی ناں.....؟“

اماں نے پوچھا۔

”ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ کھانا ہوگا تو ٹائیہ سے کہہ دوں گی۔“

وہ کہتے ہوئے ٹائیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

گھر میں داخل ہوتے ہوئے صرف چھوٹے بھیا کا خوف تھا کہ اگر ان سے سامنا ہو گیا تو وہ اتنی دیر سے آنے کا سبب پوچھیں گے، ورنہ امی تو جانتی ہی تھیں۔

”چھوٹے بھیا ہیں.....؟“

اس نے امی سے دیکھتے ہی سرگوشی میں پوچھا اور ان کے نفی میں سر ہلانے پر اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے شاپنگ بیگ ان کے سامنے ڈال کر گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”کیا لائی ہو.....؟“

پنگی اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”امی نے کچھ سوٹ منگوائے تھے۔“

”کس کے لئے.....؟“

”چپ رہو.....!“

امی نے ٹوکا، پھر شاپنگ بیگ سے کپڑے نکال کر دیکھنے لگیں۔ ساتھ ساتھ تعریف بھی کرتی جا رہی تھیں، جس سے اطمینان ہو گیا۔

”اچھا اچھا.....! یہ جانیہ کی شادی کے لئے ہیں۔“

”ہاں.....!“

امی نے کپڑے دوبارہ شاپنگ بیگ میں ڈالے اور بکس میں رکھے جلی گئیں تو پنگی نے پہلے اس کے

ہاؤس چنگی کاٹی، پھر شرارت سے بولی۔

”ابھی جہانزیب بھائی کا فون بھی آیا تھا۔“

”کک..... کیا.....؟“

وہ بری طرح چوکی۔

”ارے.....! تم تو یوں اچھلی ہو جیسے میں نے ان کی آمد کی اطلاع دی ہو۔“

پنگی نے چمڑتے ہوئے ٹوکا تو وہ جلی سی ہو گئی۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو سرزنش بھی کرنے لگی۔

”کم از کم پوچھ تو لو کہ کیا کہہ رہے تھے وہ.....؟“

”میں کیوں پوچھوں.....؟“

وہ اترا کر بولی۔

”مت پوچھو.....! میں بھی نہیں بتاؤں گی کہ وہ تمہارے بارے میں کیا کہہ رہے تھے.....؟ اور یہ کہ انہوں نے تمہارے لئے کیا پیغام دیا ہے.....؟“

پنگی نے تجسس پیدا کرنے کے لئے کہا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ کہیں انہوں نے بتا تو نہیں دیا کہ وہ ابھی ابھی ان سے مل کر آ رہی ہے۔ بمشکل تمام خود پر قابو پا کر بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”کیا کہہ رہے تھے.....؟“

”اب کیوں پوچھ رہی ہو.....؟“

اس لئے کہ میں جانتی ہوں، تمہیں بتائے بغیر جین نہیں آئے گا۔“

پنگی بے ساختہ لمبی پھرا سے مزید تنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بولی۔

”جہانزیب بھائی کہہ رہے تھے کہ تم نے ابھی تک ان سے تصویر کی فرمائش نہیں کی۔“

”کروں گی بھی نہیں۔“

بلا ارادہ اس کے منہ سے فوراً نکل گیا۔

”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ میں انہیں دیکھ چکی ہوں۔“

”کیا.....؟“

پنگی حیرت کے ساتھ پوچھنے لگی۔

”کب.....؟ کہاں.....؟“

”کچھ دن پہلے سائبر کے ساتھ بینک گئی تھی تو انہیں بھی دیکھ لیا۔“

اس نے محظوظ ہو کر بتایا، البتہ آج کی ملاقات کو لے کر گئی۔

”بڑی وہ ہو، مجھے بتایا تک نہیں؟“
 چکی لمحہ بھر کو خفا ہوئی، پھر فوراً اشتیاق سے پوچھنے لگی۔
 ”کیا تم نے اپنا تعارف بھی کروایا تھا؟“
 ”نہیں! میں دُور ہی سے انہیں دیکھ کر آ گئی۔“
 ”دُور ہی سے دیکھ کر آ گئی۔“
 چکی اس کی نقل اُتارتے ہوئے بولی۔
 ”آپ بتائیں کس کو دیکھ آئی ہیں؟“
 ”جی نہیں! میں نے ان کا نام پوچھا تھا اور وہ جہانزیب ہی تھے۔“
 ”اتجھے ہیں ناں جہانزیب بھائی؟“
 ”ہاں!۔۔۔۔۔“
 اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا، پھر کہنے لگی۔
 ”اب انہیں بتامت دینا۔“
 ”کیوں؟ میں تو ضرور بتاؤں گی۔“
 ”اچھا چاہیے! امی آ رہی ہیں۔“
 امی کو آتے دیکھ کر اس نے سرگوشی میں چکی کو چپ کرایا۔
 ☆.....☆.....☆

سیما نے بچوں کو سلا کر کھانا گرم کیا، پھر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر دانیال کا انتظار کرنے لگی۔ اندر ہی اندر جھنجھلا بھی رہی تھی کہ جانے کن کاموں میں لگا ہے؟ سب کے ساتھ کھانا کھالے تو وہ بھی آرام سے ہو جائے۔ لیکن پتا نہیں اسے بھی کیا ضد تھی؟ اکثر رات کے کھانے سے غائب ہو جاتا تھا۔ پھر گیارہ بارہ بجے بھتا تھا، بھوک لگ رہی ہے۔
 اور پہلے تو وہ برائیاں مانتی تھی، لیکن جب سے دانیال نے ثانیہ کا نام لے کر اس کی اُمیدوں پر پانی پھیرا تھا، وہ اس کے چوچلوں سے جڑنے لگی تھی، لیکن ظاہر نہیں کرتی تھی۔ ابھی بھی دانیال آیا تو اس نے لہجے فرق نہیں آنے دیا، لیکن اس کے چہرے سے ناگوار ہی ظاہر ہو گئی تھی۔
 ”حد کرتے ہو دانیال! صرف تمہارے کھانے کے لئے بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔“
 ”بس!۔۔۔۔۔ اب تو کچھ دنوں کی بات ہے بھابی!۔۔۔۔۔ پھر تو ثانیہ آ جائے گی۔“
 وہ پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے اپنی ٹون میں بولا تھا۔

”پتا نہیں!۔۔۔۔۔ مجھے تو خواجہ صاحب کے ارادے نہیں لگ رہے۔“
 وہ پہلے سے سوچ کر بولی تھی۔
 ”کیا مطلب؟“
 دانیال ایک دم ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”بھئی! دیکھو ناں!۔۔۔۔۔ اتنے دن ہو گئے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اتنا بھی کیا سوچنا؟ دیکھ بھالے ہو تم!“
 ”ہاں!۔۔۔۔۔ لیکن!۔۔۔۔۔“
 وہ اس قدر بولا تھا کہ سیما شروع ہو گئی۔
 ”ویسے مجھے اسی دن ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ خواجہ صاحب اور ان کی بیگم کا انداز لیا دیا سا تھا۔ سیدھے منہ بات نہیں کر رہے تھے۔“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے بھابی؟ خواجہ صاحب تو بڑے مہذب اور وضع دار انسان ہیں۔“
 دانیال کو حقیقتاً یہ بات ہضم نہیں ہوئی تھی۔
 ”بھئی! میں نے تو جو محسوس کیا، وہی بتا رہی ہوں۔ تم چاہو تو اپنے بھائی سے پوچھ لو۔ عجیب اکھڑا اکھڑا انداز تھا ان لوگوں کا۔“
 سیما نے پہلے سے بدظن کرنے کی کوشش کی پھر بیتر ابدل گئی۔
 ”ویسے لڑکی اچھی ہے دیکھنے میں۔“
 ”جی!۔۔۔۔۔! نہ صرف دیکھنے میں، بلکہ ہر بات میں اچھی ہے، گھر داری میں ماسٹر!۔۔۔۔۔! دیکھئے گا، آتے ہی سارا گھر سنبھال لے گی۔“
 وہ ثانیہ کی تعریف پر خوش ہو گیا تھا۔
 ”اچھا! ویسے گھر داری کے ساتھ ساتھ سوسائٹی موڈ کرنا بھی آنا چاہئے۔ خیر!۔۔۔۔۔! وہ تو تم سکھائی دو گے۔ پھر میں بھی تو ہوں ناں!۔۔۔۔۔! میں سب سکھا دوں گی ثانیہ کو۔“
 سیما کو اپنا بھرم بھی رکھنا تھا۔
 ”بالکل!۔۔۔۔۔! آپ کی شاگردی میں آ کر تو وہ اور بھی کھر جائے گی۔“
 ”اچھا!۔۔۔۔۔! اب تم جلدی کھانا ختم کرو، اور پلیز!۔۔۔۔۔! برتن بچن میں رکھ دینا، میں ذرا احتیاط دیکھ لوں۔“
 وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”ارے!۔۔۔۔۔! حنا بیس ہے کیا؟“
 اس نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

”ہاں.....! شام میں آئی تھی تو پھر میں نے روک لیا۔“

سیما نے بغور دانیال کا چہرہ دیکھا۔ وہ کھانے میں مصروف ہو گیا تو وہاں سے نکل کر حنا کے پاس آگئی۔ حنا اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی، اسے دیکھتے ہی جلمے ہوئے انداز میں بولی تھیں۔

”کھلا آئیں دیور کو کھانا.....؟“

”ہاں.....!“

سیما ”ہاں“ کو لمبا کھینچتے ہوئے حنا کے پاس بیٹھ گئی۔

”بس کریں آپا.....! اب اس کے چوٹیلے اٹھانے کا کیا فائدہ.....؟ اس دن تو خوشی خوشی اس کا رشتہ لے

کر چلی گئی تھیں.....؟“

حنانے شک کر جتا یا تو سیما کو بھی غصہ آ گیا۔

”اس میں قصور میرا نہیں، تمہارا ہے۔ تم اگر حسین ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑی عقل مند بھی ہوتیں تو اس

کی نوبت نہ آتی۔“

”کیا مطلب.....؟ آپ مجھے کیوں الزام دے رہی ہیں.....؟ لڑکی دانیال نے خود پسندی ہے، میں

نے نہیں پسند کروائی۔“

”آف.....! ذرا عقل نہیں ہے تم میں۔“

سیما پھر جھنجھلا گئی۔

”میرا مطلب ہے، ثانیہ جیسی سولی معمولی لڑکی نے دانیال کو پھانس لیا، لیکن تم اسے اپنی طرف مائل نہ کر

سکی۔“

”میں کیا کروں.....؟ دانیال مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا، اور میں ایسی گری پڑی بھی نہیں

ہوں جو اس کے آگے پیچھے بھرتی رہوں.....؟“

”ابھی یہ کرنا پڑے گا حنا.....!“

سیما زور دے کر بولی۔

”دانیال قابو میں آجائے، پھر بے شک اسے جو تے کی نوک پہ رکھنا۔“

”آف.....! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ خود تو آپ نے دانیال سے کہہ دیا ہے کہ آپ کو

ثانیہ پسند آئی ہے.....؟“

حنا چڑکائی تھی۔

”وہ اس لئے میری بہن.....! کہ دیور کی نظروں میں میرا بیچ بنا رہے۔“

”بس.....! آپ بتاتی رہیں اپنا بیچ.....!“

حنا اٹھ کر چلی گئی تو سیما کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے.....؟

☆.....☆.....☆

رابعہ عجیب مشکل میں تھی۔ عباد تو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا کہ اسد کے رشتے کی ہامی بھردا کر آئے، اور اس

کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس منہ سے اسد کا نام لے.....؟ جس کے بارے میں سب ہی جانتے تھے کہ وہ کتنا

ہائیر، بد لحاظ ہے۔ پھر نہ تعلیم نہ روزگار۔ وہ خود بھی اس کے حق میں نہیں تھی۔ لیکن عباد اور اس کی امی کو جواب بھی دینا

نہا۔ اس وقت وہ اسی سوچ میں بیٹھی تھی کہ خواجہ صاحب اسے پکار کر کہنے لگے۔

”رابعہ بیٹا.....! تمہاری اماں نے تمہیں دانیال کے بارے میں بتایا ہے ناں.....؟“

”جی ہاں.....!“

منتشر ذہن کے ساتھ انہیں دیکھنے لگی۔

”تو بیٹا.....! مجھے اور تمہاری اماں کو تو یہ رشتہ بہت مناسب لگ رہا ہے۔ تم کیا کہتی ہو.....؟“

خواجہ صاحب نے اپنا خیال بتا کر اس سے پوچھا تو اس نے حیران ہو کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

”میں.....؟“

”ہاں بیٹی.....! تم بڑی بہن ہو ثانیہ کی، تمہاری رائے بھی ضروری ہے۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو اس کا حلق خشک ہو گیا جبکہ سماعتوں میں جتول بیگم کی آواز گونجنے لگی تھی۔

”تم سن لو لڑکی.....! میرے بیٹوں کے لئے کمی نہیں ہے۔ جاؤ بات کرو اپنے ماں باپ سے اسد کے

لئے ثانیہ کا رشتہ دیئے ہیں تو ٹھیک، ورنہ تمہیں بھی اپنے پاس رکھیں۔“

”کیا سوچنے لگیں رابعہ.....؟“

اماں نے نوک تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگی۔

”کچھ نہیں اماں.....! وہ..... میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کو اور ابا کو دانیال پسند ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو

ماتا ہے.....؟ اچھا ہے مختصر سی فیملی ہے، زیادہ جھجھٹ نہیں ہے۔ آپ ہامی بھر لیں، بلکہ جلدی شادی بھی کر دیں ثانیہ

کی۔“

”بہت جلدی تو ممکن نہیں ہے بیٹا.....! کچھ وقت تو لگے گا۔ ہاں.....! البتہ بات چکی کی جاسکتی ہے۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

”اور ہاں.....! تم ذرا ثانیہ سے اس کی مرضی معلوم کر لو۔“

اماں نے ایک دم خیال آنے پر کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”ثانیہ کیوں منع کرے گی.....؟“

پھر اسے اپنی بات سننا ہی پڑی۔

”میرا مطلب ہے اماں!..... ثانیا آپ کے اور ابا کے فیصلے سے اختلاف نہیں کرے گی۔“

”میں جانتا ہوں بیٹا!..... تمہاری طرح ثانیا بھی فرمانبردار اور سعادت مند ہے۔ پھر بھی اللہ رسول کا حکم

ہے، بیٹی سے ضرور پوچھ لینا چاہئے۔“

”جی.....! میں پوچھ لیتی ہوں۔“

وہ اسی وقت اٹھ کر ثانیا کے کمرے میں آئی تو وہ شوہنی کو آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی۔

”سو گیا یہ.....؟“

اس نے کہا تو ثانیا خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔

”آہستہ بولو.....! بڑی مشکل سے سویا ہے۔“

”خیر.....! اب اتنی جلدی نہیں اٹھے گا۔“

وہ کہتے ہوئے بیٹھ گئی اور ثانیا کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو.....؟“

ثانیا نے ٹوکا تو مسکرا کر بولی۔

”اچھی لگ رہی ہو اور خوش بھی۔“

”تمہاری محبت ہے.....!“

”میری یا.....“

اس کے معنی خیز انداز پر ثانیا جھینپ گئی۔ پھر پوچھنے لگی۔

”اماں ابا نے کچھ کہا ہے تم سے.....؟“

”ہاں!.....! لیکن تم تو اس روز کوئی اور نام بتا رہی تھیں، جبکہ اماں ابا.....“

”اماں ابا نے کیا بتایا ہے.....؟“

ثانیا نے پریشان ہو کر فوراً پوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔

”دانیال.....!“

”اُف.....! میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ بہت بری ہوتم.....!“

ثانیا اس کی شرارت پر واقعی سہم گئی تھی۔

”ہاں بھی.....! اب تو سب ہی برے ہیں۔ اچھا تو بس ایک وہی ہوگا۔“

راجہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تو ثانیا ایک دم بخیدہ ہو گئی۔

”خیر.....! اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”اچھا.....! پھر کیسا ہے.....؟“

راجہ جانے کیا جانتا چاہ رہی تھی؟

”پھر ایسا ہے راجہ!.....! کہ میرے نزدیک ہر شے کی اپنی جگہ اپنی اہمیت ہے اور انشاء اللہ رہے گی۔“

”اور اگر خدا نہ کرے، کہیں آزمائش آگئی تو کیا کرو گی.....؟“

راجہ کسی بھی طرح اپنا خدشہ چھپا نہیں سکی۔

”کیسی آزمائش.....؟“

ثانیا غصی تھی۔

”رشتوں میں آزمائش یعنی ماں، باپ، بہن اور محبت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا پڑے تو کسے منتخب کرو

گی.....؟“

”تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو راجہ.....؟ کیا اماں ابا، دانیال کے رشتے پر راضی نہیں ہیں.....؟“

ثانیا بھی سہمی تھی۔

”ارے نہیں.....!“

راجہ ایک دم سنبھلی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اماں ابا دل سے راضی ہیں اور پتا ہے، کہہ رہے تھے اس جمعہ کو دانیال کے گھر

والوں کو کھانے پر بلائیں گے اور تمہاری بات کچی کر دیں گے۔“

راجہ اسے خوشی اور اطمینان دے کر خود اندر سے متوحش ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے سوچ لیا کہ اسے اپنی بہن

کی خوشیاں چھیننے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ ایسی کوشش بھی نہیں کرے گی۔ اس لئے اس نے اسد کا نام بھی نہیں لیا تھا

اور گھر آ کر ساس سے بس اتنا کہا کہ ثانیا کی بات کچی ہو گئی ہے جس پر وہ ایک دم ہتھے سے اٹھ گئیں۔ عباد کو مخاطب کر

کے بولیں۔

”دیکھ لیا عباد!.....! اپنی بیوی اور اس کے بچے والوں کی مکاریاں.....؟ کل تک تو ایسی کوئی بات نہیں

تھی۔ پھر یہ اچانک بات کیسے کچی ہو گئی.....؟ وہ بھی داماد سے مشورہ کئے بغیر.....؟ کانوں کان خبر نہیں ہونے دیں

تمہیں۔“

”یہ جھوٹ بول رہی ہے امی.....!“

عباد کو جیسے اپنی عزت کے لالے پڑ گئے تھے۔

”اس کے اماں ابا میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ کوئی کام میرے مشورے کے بغیر کر لیں۔ اس نے جان

بوجھ کر وہاں بات نہیں کی ہوگی، کیونکہ یہ نہیں چاہتی کہ اس کی بہن یہاں آئے۔“

”کیوں بہو.....؟“

بتول بیگم نے کڑے تیروں سے اسے دیکھا تو وہ گڑبڑا کر بولی تھی۔
”نہیں امی! میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں، آپ میرا یقین کریں۔“

”تمہارا یقین کر لوں؟“ او بیٹے کو جھٹلا دوں؟“

”میں یہ نہیں کہہ رہی امی! آپ خود جا کر معلوم کر لیں۔ ثانیہ کے دو تین رشتے آئے ہوئے تھے، پھر

اماں ابا کو جو مناسب لگا، انہوں نے وہیں بات کی کر دی۔“

”بات کچی ہوئی ہے ناں؟“ نکاح تو نہیں ہو گیا؟“ اور اب تو نکاح ٹوٹنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔“

عباد نے کہا تو وہ سائے میں آگئی۔

”عباد؟“

”ارے! ٹھیک کہہ رہا ہے عباد! تم اپنے نکاح کی سلامتی چاہتی ہو یا نہیں؟“

بتول بیگم نے سنگ دلی کی انتہا کر دی۔

”خدا کے لئے امی! مجھ پر نہیں تو اپنے پوتے پر رحم کریں۔ عباد! آپ سمجھائیں ناں امی کو۔“

”میں امی کو سمجھاؤں؟ تم اپنے ماں باپ کو نہیں سمجھا سکتیں؟“ رحم کی جھجک مانگتی ہے تو ان سے

مانگو جا کر۔“

عباد نے یہ کہتے ہوئے اسے زور سے دھکا دیا تھا۔

”امی! خدا کے لئے میری مجبوری سمجھیں۔ مجھے ایک موقع اور دیں۔ میں پھر اماں ابا سے بات

کروں گی۔“

اس نے مدد کے لئے بتول بیگم کو پکارا، لیکن ان ہی کی شہ پر تو عباد نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکالا

تھا۔

”اب تم اس گھر میں ثانیہ کے ساتھ ہی آ سکتی ہو۔“

عباد نے فیصلہ سنا کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

”میرا بچہ!“

وہ پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جمعہ میں ابھی چار دن تھے، لیکن اماں ابھی سے ہی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی، پھر

کھانے میں کیا کیا پکنا چاہئے؟

باقی سب تو ٹھیک تھا بس ایک عباد کی طرف سے تھوڑا خدشہ تھا کہ وہ مہمانوں کے سامنے کوئی الٹی سیدھی

بات نہ کر دے۔ اس وقت وہ خواجہ صاحب سے اپنے اسی خدشے کا اظہار کر رہی تھیں کہ ڈور بیل بڑی زور سے بجی تھی۔

”یہ کیوں آگیا۔؟“

اماں کو یہ مداخلت ناگوار گزری تھی۔

”میں دیکھتا ہوں۔“

خواجہ صاحب اٹھ کر چلے گئے اور جب واپس آئے تو ان کی بانہوں میں روتی سسکتی رابعہ کو دیکھ کر اماں

دہل گئیں۔

”الہی خیر! کیا ہوا میری بچی کو؟“ ثانیہ! ثانیہ! پانی لاؤ جلدی سے۔“

”آرام سے بیگم!۔“

خواجہ صاحب خود پریشان تھے، بیگم کو نوک کر رابعہ سے کہنے لگے۔

”ارے بیٹا! کچھ بتاؤ تو سہی، کیا ہوا ہے؟“ یوں روتی رہو گی تو کیا پتا چلے گا۔؟“

تب ہی ثانیہ پانی لے کر آگئی اور نا سنجی کے عالم میں ایک ایک کو دیکھنے لگی۔

”لو پانی پیو۔!“

اماں نے ثانیہ کے ہاتھ سے گلاس لے کر رابعہ کے ہونٹوں سے لگایا تو وہ ایک گھونٹ لے کر بولی۔

”اماں! میرا بچہ! انہوں نے شوبی کو بھی اپنے پاس رکھ لیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شوبی کو رکھ لیا ہے؟“

خواجہ صاحب نے الجھ کر پوچھا۔

”وہ! ابا!۔!“

رابعہ زک کر بولی۔

”وہ! اسد کے لئے ثانیہ کو مانگ رہے ہیں۔“

”میرے خدا!۔!“

ثانیہ بے اختیار پیچھے ہٹی۔ پھر ایک دم پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

”ارے! کوئی زبردستی ہے کیا؟“ ایک بیٹی کو کون سا کھ دیا ہے انہوں نے جو میں دوسری بھی

دے دوں۔؟“

اماں نے غصے سے کہا تو خواجہ صاحب نے معاملہ سمجھتے ہوئے بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر رابعہ

سے بولے۔

”بیٹا! تم رومت! مجھے بتاؤ! کیا کہا ہے تمہاری ساس نے؟“

دل بیگم نے کہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔
اماں نے یہ کہہ کر پھر آہ بھری تھی۔

”تو غلطی تو ہماری ہوئی ناں بیگم.....! کہ ہم نے ان کا اعتبار کر لیا تھا.....؟“
خواب صاحب نے کہا تو وہ فوراً بولی تھیں۔

”اب دوبارہ نہ اعتبار کر لیجئے گا، اسد کی حرکتیں کوئی دھکی چھپی نہیں ہیں۔ زمانہ جانتا ہے، کیسا لوفر، آوارہ ہے۔“

”اسد کو چھوڑو، رابعہ کا سوچو.....!“

خواب صاحب جھلا کر بولے تھے۔

”رابعہ کا کیا سوچوں میاں.....؟ میں نے تو جب سے رابعہ کی شادی ہوئی ہے، کسی ایک دن بھی اسے اوش نہیں دیکھا ہے۔ کسی ہنسی ٹھکھلائی تھی، اب کیسی مر جھا کر رہ گئی ہے میری بیٹی۔“

”ہاں.....! بہت صابر رہے میری بیٹی۔“

”آپ جا کر بات کریں اس کی ساس سے۔ شریف لوگوں کے یہ طریقے تو نہیں ہوتے کہ دھکے دے کر ہو کر گھر سے نکال دیا.....؟ خدا نخواستہ راستے میں کچھ ہو جاتا تو.....؟“

”بس کرو بیگم.....! میں بیٹیوں کا باپ ہوں۔“

خواب صاحب کمزور پڑ گئے تھے۔

”ارے.....! بیٹیوں کا باپ ہونا جرم ہے کیا.....؟“

”شاید جرم ہی ہے، جس کی سزا کبھی ختم نہیں ہوتی۔“

خواب صاحب کی حد درجہ دل گرفتگی محسوس کر کے اماں ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اس کی زندگی کو ایک نیا عنوان مل گیا تھا۔ گوکہ وہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی، لیکن اب جبکہ قیمت میں رنگیناں آن سانی تھیں تو خواب آپ ہی آپ جگ گئے تھے۔ وہ بہت خاموشی سے جہانزیب کے ساتھ بیان باندھتی رہی۔

وہ اکثر اس کے راستے میں آکھڑا ہوتا تو کبھی کسی کینے میں لے جاتا، جس کے خواب ناک ماحول میں الٹی عمر انگیز باتوں سے وہ اسے یوں گرفت میں لیتا کہ وہ اگلے کئی دنوں تک اس حشر سے نکل نہیں پاتی تھی، اور کبھی یوں اٹا گاڑی کو لمبی سڑکوں پر دوڑاتا رہتا۔ اس کی سنگت میں اگر کبھی دل نے ٹوکا بھی تو یہ خیال زیادہ غالب نہ رہا کہ وہ لڑکی غیر نہیں، اس کا منگیترا ہے، اور آخر کو اس کو اسی کے ساتھ نہ صرف چلنا ہے بلکہ زندگی گزارنی ہے۔

”ابا.....! انہوں نے یہ کہہ کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے کہ جب تک ثانیہ کا رشتہ نہیں دیں گے، میں بھی وہاں نہیں رہ سکتی۔“

رابعہ نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا تو خواب صاحب اچانک خیال آنے پر پوچھنے لگے۔

”بیٹا.....! کل کیا انہوں نے اسی سلسلے میں تمہیں بھیج دیا تھا.....؟“

رابعہ نے سر جھکا لیا تو خواب صاحب افسوس سے بولے۔

”تو بیٹا.....! تمہیں بتانا چاہئے تھا۔“

”میں نہیں جانتی ابا.....! اسد کو آپ جانتے ہیں، پھر بھی اگر میں بتا دیتی تو کیا آپ مان لیتے.....؟“
خواب صاحب خاموش ہو گئے تھے۔

”نہیں ابا.....! اسد کسی بھی طرح ثانیہ کے قابل نہیں ہے۔ بس.....! آپ مجھے میرا پچا لادیں۔ شوبی بہت چھوٹا ہے ابا.....! میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

رابعہ پھر رونے لگی تو خواب صاحب اس کا سر تھپک کر بولے۔

”صبر سے بیٹا.....! صبر سے، شوبی کسی غیر کے نہیں، اپنے باپ دادی کے پاس ہے۔ اس کے لئے پریشان مت ہو۔“

”کیسے پریشان نہ ہوں.....؟“

”اسی لئے میں کہہ رہا تھا، تمہیں کل ہی بتانا چاہئے تھا۔ شوبی تمہارے ساتھ تھا، پھر میں خود تمہیں نہ جانے دیتا۔ سخت حماقت کی ہے تم نے۔ اب رونا دھونا بند کرو۔ جاؤ آرام کرو جا کر۔ میں دیکھوں گا کیا کر سکتا ہوں.....؟“

خواب صاحب کے غصے سے اماں بوکھلا گئیں۔

”ہائیں.....؟ اسے کیوں ڈانٹ رہے ہیں.....؟“

”تم چپ رہو.....! جاؤ رابعہ.....! کمرے میں جاؤ۔“

خواب صاحب نے اماں کو ٹوک کر رابعہ سے کہا تو وہ ایک دم اُٹھ کر چلی گئی۔

”یا اللہ.....! تو رزم کر.....! جانے میری بیٹیوں کے نصیب میں کیا لکھا ہے.....؟“

اماں آہ بھر کر بولیں، پھر خواب صاحب کو دیکھا۔ وہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

”آپ کیا سوچ رہے ہیں.....؟“

کتکتی دیر بعد آخراں کو ٹوکنا پڑا۔

”کیا سوچ سکتا ہوں.....؟ میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا۔ مفلوج ہو گیا ہے بالکل۔“

خواب صاحب اچانک بے بس نظر آنے لگے تھے۔

”ہاں.....! یہی نہ مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔ اچھی زبردستی ہے۔ رابعہ کی باری بھی اتنی جلدی چپائی تھی

بہر حال وہ اتنی مگن تھی کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ چونکہ اس وقت جب امی نے اسے اسکول چھوڑنے کے لئے کہا۔

”جانیہ بیٹا.....! اب تم اسکول چھوڑ دو۔“

”کیوں؟“

وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

”بیٹا.....!“

”اب دو مہینے ہی تو رہ گئے ہیں تمہاری شادی میں، اور پھر جہانزیب بھی یہی چاہتا ہے کہ تم نوکری چھوڑ دو۔“

اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اگلے دن جب وہ استعفیٰ دے کر آ رہی تھی تو وہ راستے میں کھڑا تھا اور اب تک وہ خاصی بے باک ہو چکی تھی۔ جیسے ہی اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا، بغیر کسی پس و پیش کے فوراً بیٹھ گئی اور جب وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے مین روڈ تک لایا تو کہنے لگی۔

”آج ہماری آخری ملاقات ہے۔“

”کیا مطلب؟“

وہ چونک کر دیکھنے لگا۔

”بھئی.....! میں اسکول سے استعفیٰ دے آئی ہوں، اور ظاہر ہے، اب گھر سے نکلنا بھی نہیں ہوگا۔“

”لیکن کیوں؟“

”کیوں کا کیا مطلب.....؟ تم ہی نے تو کہا ہے۔“

”ہاں!.....“

وہ اس تمام عرصے میں بہت بے چین رہا تھا، اس لئے اکثر اس کی باتیں نہ سمجھنے کے باوجود کچھ کلمات کہتا تھا۔

”ویسے اس میں کوئی حرج تو نہیں تھا، میں بعد میں بھی اس جاب کو جاری رکھ سکتی تھی۔“

”بعد میں.....؟“

اس نے دل ہی دل میں ڈہرا کر سوچا، پھر کہنے لگا۔

”نہیں..... بس، مجھے پسند نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”اس بحث کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ مجھ سے ملنے تو آؤ گی ناں.....؟“

”بہت مشکل ہے، بلکہ ناممکن.....!“

پھر اپنی دھن میں کہہ گئی۔

”دو مہینے کی تو بات ہے.....!“

”دو مہینے.....؟“

وہ پریشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں دو دن تمہیں نہ دیکھوں تو مجھے چین نہیں آتا۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں.....؟“

اس نے معذوری ظاہر کی، تو وہ گاڑی روک کر اسے دیکھنے لگا، یوں کہ وہ نروس ہو گئی۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو.....؟“

”تمہاری صورت آنکھوں میں جذب کرنا چاہتا ہوں۔“

”بس کرو.....!“

وہ گھبرا گئی۔

”ایک بات مانو گی.....؟“

وہ محسوس ہو کر بولا۔

”کیا.....؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“

وہ گہری سانس لے کر سیدھا ہوا اور پھر گاڑی تیز رفتاری سے چلاتا ہوا ایک فوٹو سٹوڈیو کے سامنے روک کر بولا۔

”آؤ.....! آج اس آخری ملاقات کی یادگار کے طور پر ایک تصویر کھینچواتے ہیں۔“

اس نے بہت خاموشی سے گردن موڑ کر اسٹوڈیو کی طرف دیکھا، پھر بڑ سوچ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”چلو.....!“

وہ گاڑی بند کرتے ہوئے اس یقین سے بولا جیسے وہ منع نہیں کرے گی۔

”نہیں جہانزیب.....!“

”کیا نہیں.....؟“

وہ فوراً ٹوک کر بولا۔

”یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”لیکن یہ میری خواہش ہے، اور میں جانتا ہوں کہ تم میری خواہش رد نہیں کرو گی۔ نہ اب، نہ آئندہ“

کبھی۔“

وہ شش و پنج میں پڑ گئی، اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ منع کرتی، وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گیا اور چکر کاٹتے ہوئے اس کی طرف کا دروازہ کھولا اور اترنے پر اصرار کرنے لگا۔ آخر میں خفگی کا اظہار کیا تو وہ مجبور ہو گئی۔ گوکہ گزشتہ کی طرح اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کیا حرج ہے، ویسے بھی اب زیادہ دن تو نہیں ہیں جب وہ اس کے ساتھ آزادانہ گھوم پھر سکے گی، پھر بھی پتا نہیں کیوں اندر ایک ڈر سا گھر کر گیا تھا۔ جبکہ واپسی میں وہ اس کا دھیان بنانے کی خاطر بڑی لگاؤ کا مظاہرہ کرتا رہا، لیکن اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ بے حد مضطرب تھا۔ تین دن ہو گئے تھے ثانیہ سے بات کئے ہوئے۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی؟ وہ جب بھی فون کرتا، کبھی خواجہ صاحب کی آواز سنائی دیتی تو کبھی ان کی بیگم کی، اور وہ فوراً ہی لائن کاٹ دیتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کیسے ثانیہ سے رابطہ کرے؟ پہلے تو وہ خواجہ صاحب سے طعنے کے بہانے ان کے گھر چلا جاتا تھا لیکن جب سے رشتے کی بات ڈالی تھی، تب سے وہ وہاں جانے سے ہی رہ گیا تھا، کیونکہ خواجہ صاحب کی طرف سے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا، اور کسی جو اس سے پہلے ان کے ہاں جانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ وہ بہر حال اب پریشان ہو گیا تھا۔ رات بہت دیر تک وہ بار بار خواجہ صاحب کے گھر کا نمبر ملاتا رہا تھا لیکن ثانیہ کی آواز سننے کو نہیں ملی تو وہ جانے کیا کیا سوچتے ہوئے بہت دیر میں سویا تھا۔ اس لئے صبح اٹھنے میں بھی دیر ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر آیا تو سیما پتی ہوئی بیٹھی تھی۔

”آؤ شہزادے! تمہارے ہی انتظار میں بیٹھی ہوں۔“

”سوری بھابی! میں.....“

”بس بس! اب جلدی سے ناشتہ کرو، مجھے اور بھی کام ہیں۔“

”جی!.....“

وہ سعادت مندی سے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ جب اس کا چہرہ دیکھ کر سیما پوچھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“

”جج! جی بھابی! میں ٹھیک ہوں۔“

وہ چونک کر بولا تھا۔

”ٹھیک لگتو نہیں رہی ہے، کوئی پریشانی کی بات ہے تو بتاؤ؟“

”ارے نہیں بھابی! کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔“

وہ زبردستی مسکرایا، لیکن سیما کہاں بخشنے والی تھی؟ ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”ہاں بھائی! اب مجھے کیوں بتانے لگے تم؟ اب تو ساری باتیں ثانیہ کے ساتھ ہی ہوتی ہوں“

”کی“

”ارے! آپ تو ناراض ہو گئیں.....؟“

اس نے ہونٹوں سے لگا چائے کا کپ واپس رکھ دیا۔

”ثانیہ میری زندگی میں ضرور آنے والی ہے بھابی! لیکن اس کی اہمیت آپ سے زیادہ نہیں ہو“

”ہی۔“

”بس بس! ارے دو!.....“

سیما کی خفگی بند ہو گئی۔

”میرا یقین کریں بھابی! میرے لئے آپ بہت محترم ہیں۔“

وہ صدق دل سے بولا تھا۔

”اچھا بابا! کر لیا تمہارا یقین! اب یہ بتاؤ! خواجہ صاحب سوچنے میں اور کتنا وقت لگا نہیں لگے؟ دوپٹے ہو گئے ہیں۔“

سیما اصل بات کی طرف آ گئی۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں بھابی؟ آپ خود جا کر معلوم کریں۔“

اس نے کہا تو سیما حیرت سے بولی۔

”میں جاؤں؟ میرا مطلب ہے، اصولاً تو انہیں بلانا چاہئے۔“

”چہ نہیں!.....“

”کیوں؟ تمہاری ثانیہ سے بات نہیں ہوئی کیا؟ وہ کیا کہتی ہے؟“

سیما نے بظاہر سیدھے سادے انداز میں پوچھا تھا۔

”نہیں بھابی! میری ثانیہ سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ اصل میں وہ نروس ہو جاتی“

”ہ۔“

وہ بات بناتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور سیما کو مزید کچھ کہنے کا موقع دے بغیر جگت سے ”خدا حافظ“ کہہ کر اٹھ آیا تھا۔ پھر آفس آکر اپنی چیز پر بیٹھے ہی اس نے خواہ صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کیا تو ادھر سے اماں کی آواز آئی

”مہی۔ وہ نورانی سیور کہہ کر بڑبڑایا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے ثانیہ کو؟“

وہ سر جھکائے تیز تیز چل رہی تھی کہ اسد کے راستے روکنے پر انتہائی غصے اور ناگواری سے اسے دیکھا گئی۔ بولنے سے خود کو باز رکھنے کی خاطر اس کے ہونٹ سمجھنے لگے تھے۔

”کتنی بار کہا ہے، دھوپ میں نہ نکلا کرو، کالی ہو جاؤ گی۔“

اسد نے ترنگ میں کہا تو وہ دانت پیس کر بولی۔

”تم میرے راستے میں کیوں آتے ہو.....؟“

”میں.....؟“

اسد حیران ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔

”تمہیں نہیں پتا میں تمہارے راستے میں کیوں آتا ہوں.....؟ تمہاری بہن نے نہیں بتایا تمہیں.....؟“

”بتایا ہے، سب بتایا ہے رابعہ نے، یہ بھی کہ تم کتنے کتنے کینے اور لوفر ہو۔“

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”اپنا اسٹائل ہے۔“

اسد نے اپنی شرٹ کے کالر کھڑے کئے تو وہ غصے سے سر جھٹک کر جانے لگی کہ وہ بھر سائے آ گیا۔

”سنو.....! یہ رعب کسی اور پر جمانا۔ میں اگر آرام سے بات کرتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ

سر چڑھ جاؤ۔ یاد رکھو.....! میں اگر سر چڑھاتا ہوں تو مزاج ٹھکانے لگانا بھی جانتا ہوں۔ کسی بھول میں مت رہنا۔“

”تم بھی کسی بھول میں مت رہنا اسد.....! تمہارے جیسوں کو میں جوتے کی نوک پہ رکھتی ہوں۔ کبھی

تم.....؟ ہو میرے راستے سے، اور آئندہ اگر تم نے کبھی میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ حشر کروں گی کہ ساری

زندگی یاد رکھو گے۔“

وہ غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی اور پھر زکی نہیں تھی، اسے دھکیل کر تیز قدموں سے گھر آئے

برآمدے میں رکھے تخت پوش پر ڈھے گئی، اور اپنی سانسیں ہموار کر رہی تھی کہ اندر سے آتی ہوئی رابعہ کے رونے کی

آواز سن کر ایک دم اٹھ کر اندر آئی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتی اماں.....! مجھے بس میرا بچہ چاہئے۔“

وہ رابعہ کی شدن کر دروازے ہی میں ٹک گئی۔

”آجائے کا تمہارا بچہ.....! تم خود کو بلکان مت کرو بیٹا.....! ابھی تمہیں بہت حوصلے کی ضرورت ہے۔“

اماں نے رابعہ کو پکار تے ہوئے کہا۔

”کہاں سے لاؤں حوصلہ اماں.....؟ ساری ساری رات میرے کانوں میں شوبی کے رونے کی آواز

گونجتی ہے۔ پتا نہیں میرا بچہ.....“

”تمہارا بچہ کسی غیر کے پاس نہیں ہے رابعہ.....!“

وہ ایک دم آگے آکر بولی تھی۔

”اچھا ہے، ابھی اسے وہیں رہنے دو۔ چار دن سنبھالیں گے باپ اور دادی تو دن میں تارے نظر

اٹھائیں گے انہیں۔“

”میں یہ سب نہیں جانتی، مجھے بس میرا بچہ چاہئے۔“

رابعہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔ اماں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے بولیں۔

”حوصلہ رکھو رابعہ.....! روتی کیوں ہو.....؟ تمہارے ابا کہہ گئے ہیں، آج آفس سے سیدھا تمہاری

ماں کے پاس ہی جائیں گے۔“

تب ہی فون کی بیل پر اماں اس سے کہنے لگیں۔

”دیکھو نا.....! کس کا فون ہے.....؟ کئی بار فون آیا ہے مگر ادھر سے کوئی بولتا ہی نہیں ہے۔“

”عباد ہوں گے اماں.....! یا میری ساس۔ میں دیکھتی ہوں۔“

رابعہ کہتے ہوئے اٹھنے لگی کہ اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہیں نہیں.....! تم یہیں بیٹھو.....! جاؤ تم دیکھو نا.....!“

”جی.....!“

وہ پلٹ کر لابی میں آگئی اور کیونکہ رابعہ نے عباد اور اپنی ساس کا کہا تھا، تو اسے بھی یہی لگا، جب ہی

ریسیور اٹھا کر ناگواری سے بولی تھی۔

”ہیلو.....!“

”کہاں ہو نا.....؟“

دانیال کی بے قراری انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی۔

”تین دن سے میں مسلسل فون کر رہا ہوں۔ کبھی تمہاری اماں اٹھاتی ہیں کبھی ابا۔ تم خود کہاں ہو

.....؟“

اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا، پھر آواز دبا کر بولی تھی۔

”سوری دانیال.....! میں اس وقت بات نہیں کر سکتی۔“

”اس وقت بات نہیں کر سکتی یا مجھ سے بات کرنا ہی نہیں چاہتیں.....؟“

وہ یک دم شام کی ہو گیا تھا۔

”یہ.....! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں دانیال.....؟“

وہ پریشان ہو گئی۔

”تم بتاؤ! کیوں کتر اری ہو مجھ سے؟“

دانیال نے قدرے سخت لہجہ میں پوچھا تو وہ عاجزی سے بولی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے دانیال! آپ پلیز! غلط نہ سمجھیں۔“

”پھر کیا سمجھوں؟ جب تم میرا فون ریسو نہیں کرو گی تو میں یہی سمجھوں گا ناں کہ تم مجھ سے بات ہی

نہیں کرنا چاہتیں۔“

”ایسا نہیں ہے دانیال! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟“

وہ شکل میں پڑ گئی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے نا اہل سمجھتی ہو کہ میں تمہاری بات نہیں سمجھ پاؤں گا۔“

وہ ناراض ہو کر اسے زنج کر رہا تھا۔

”اف! آپ تو! اچھا! میں پھر بات کروں گی۔“

اس نے ایک دم ریسور رکھ دیا اور یہ اچھا ہی ہوا، کیونکہ اسی وقت خواجہ صاحب آگئے تھے۔ اس نے خود

پر قابو پاتے ہوئے انہیں سلام کیا اور ان کے پیچھے کمرے میں آگئی جہاں اماں اور رابعہ بیٹھی تھیں۔

”ابا!۔۔۔؟“

رابعہ انہیں دیکھ کر بے قراری سے ابھی تھی۔

”کیا ہوا ابا!۔۔۔؟ آپ گئے نہیں میرے گھر؟ کیا کہا میری ساس نے؟ شوبی؟ شوبی ٹھیک

ہے ناں۔۔۔؟“

”ہاں بیٹا!۔۔۔! سب ٹھیک ہیں۔ شوبی بھی ٹھیک ہے۔“

خواجہ صاحب کی بو بھل آواز اس کے دل میں ترازو ہو گئی، جبکہ رابعہ نے اپنے غم میں محسوس ہی نہیں کیا۔

”آپ شوبی کو لے آتے ناں ابا!۔۔۔! وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”رابعہ بیٹا!۔۔۔! اپنے ابا کو بیٹھنے تو دو۔ تم نے تو آتے ہی۔۔۔“

اماں نے رابعہ کو ٹوکا، جب احساس ہونے پر وہ نام ہو کر بولیں۔

”ہاں!۔۔۔! ابا!۔۔۔! آپ بیٹھیں، میں پانی لاتی ہوں۔“

وہ بھاگ کر پانی لے آئی تو خواجہ صاحب پانی پی کر غالباً فوری طور پر اس کے سوالوں سے بچنے کی خاطر

بولے تھے۔

”بیٹا!۔۔۔! اگر چائے مل جاتی تو۔۔۔“

”میں ابھی ہال لاتی ہوں۔ اماں! آپ بھی بیٹیں گی۔۔۔؟“

رابعہ نے بہت عجلت میں پوچھا جیسے وہ آنا فانا سب کاموں سے فارغ ہو جانا چاہتی ہو۔

”وے دینا!۔۔۔!“

اماں کا جواب سن کر وہ تیر کی سی تیزی سے لگی تھی، تب ہی خواجہ صاحب کہنے لگے۔

”بہت ضدی عورت ہے بتول بیگم، اسی بات پر آڑی ہوئی ہے کہ ثانیہ کا رشتہ دو گے تو رابعہ اس گھر میں

آئے گی، ورنہ نہیں!۔۔۔!“

وہ ابا کی بات سن کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔

”یا اللہ!۔۔۔! رحم کر میری بچیوں پر۔ پھر آپ نے کیا کہا۔۔۔؟“

اماں پوچھ رہی تھیں۔

”کہنے کو تو بہت کچھ تھا بیگم!۔۔۔! مگر بیٹیوں کا معاملہ ہے، کسے بساؤں کسے اجاڑوں۔۔۔؟ تم کر سکتی ہو

یہ فیصلہ۔۔۔؟“

ثانیہ اماں کا جواب سننے کو زکری نہیں، تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے مرچیں

بھر گئی تھیں۔ جانے یہ کون سا موڑ تھا۔۔۔؟ ابا ہاں بلے بس ہو گئے تھے۔ اس کا دل ابا کی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر

رونے کو چاہ رہا تھا۔ اس وقت اسے اپنا خیال بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔۔۔؟

لیکن رات میں بچن کے آخری کام سمیٹتے ہوئے اسے اچانک دانیال کی باتیں یاد آنے لگیں کہ وہ اس

سے کیوں کتر اری ہے۔۔۔؟ تو وہ یہ جاننے کے لئے کہ اماں ابا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔۔۔؟ کچن بند کر کے اماں کے

کمرے کی طرف آگئی۔ اندر شاید خواجہ صاحب ٹہل رہے تھے، جب ہی اماں کہہ رہی تھیں۔

”بیٹھ جائیں میاں!۔۔۔! تھک جائیں گے آپ!۔۔۔! یوں پریشان ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوتے۔“

”تو کیسے حل ہوتے ہیں؟ بتاؤ!۔۔۔! تمہارے نزدیک اس مسئلے کا کیا حل ہے۔۔۔؟ کے قربان کرو

گی۔۔۔؟ رابعہ کو یا ثانیہ کو۔۔۔؟“

خواجہ صاحب جیسے ڈھسے سے گئے تھے۔

”بس کریں میاں!۔۔۔! مجھ سے ایسی باتیں برداشت نہیں ہوتیں۔“

اماں کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش محسوس کر کے وہ تڑپ گئی۔

”تو میں کچھ پتھر کا بنا ہوا ہوں۔۔۔؟ میرے سینے میں دل نہیں ہے کیا۔۔۔؟ رابعہ کے آنسو پونچھتا ہوں تو

پھر ثانیہ ساری زندگی روتی ہوئی نظر آتی ہے، اور اگر ثانیہ کی خوشی دیکھوں تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔“

خواجہ صاحب کی آواز بھی ٹوٹ گئی تھی۔

”کچھ نہ سوچیں آپ!۔۔۔! اللہ پر چھوڑ دیں۔“

”اللہ بھی ظالموں کے ساتھ ہے۔“

”تو بہ کریں میاں!۔۔۔! اب کچھ انا سیدھا نہ بول دیجئے گا۔“

اماں نے دہل کر ٹوکا تھا۔

”کیوں.....؟ ایمان خطرے میں پڑ جائے گا، یہی ناں.....؟ کیا کروں.....؟ کچھ بھی سوچ لوں، وقت کی دوطرفہ مار تو پڑے گی ہی۔“

اس سے زیادہ سننے کی اس میں تاب نہیں تھی۔ وہ بے آواز مگر تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آئی تو رابعہ کو گھٹنوں میں منہ چھپائے دیکھ کر اس کا ضبط جواب دے گیا۔

”خدا کے لئے رابعہ.....! ہند کر دیہ رونا دھونا۔ کیوں اپنے ساتھ سب کو پریشان کرتی ہو.....؟ کم از کم اماں! کا ہی خیال کر لو۔“

”ان کا خیال کر کے ہی تو گھٹ گھٹ کر روتی ہوں۔ ورنہ دل تو چیخنے کو چاہتا ہے، اتنا چیخوں کہ آسمان کا کلیجہ ہلا دوں۔“

رابعہ نے کہا تو اس کے اندر ڈھیروں کڑواہٹ نکل گئی۔

”آسمان تو تماشا کی ہے، اور تماشا نیوں کے کلیجے نہیں ہوتے۔ وہ تو چیخنے والوں پر ہنستے ہیں۔“
”تم ٹھیک کہتی ہو۔“

رابعہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”تم بھی کیا سوچتی ہوگی.....؟ میری وجہ سے تمہارا معاملہ بھی کٹھنائی میں پڑ گیا۔“

”فضول باتیں مت کرو.....! میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔“

وہ نظریں چرا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

”پھر کیا سوچتی ہو.....؟“

ابعہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”تم بتاؤ.....! تم کیا چاہتی ہو.....؟“

اس نے اُلٹا پوچھا تو رابعہ چند لمحے رُک کر بولی۔

”میں چاہتی ہوں، اللہ کچھ ایسا کر دے کہ میرا گھر بھی بچ جائے اور تم بھی اسد کا لقمہ نہ بنو۔“

”اللہ ایسا ہی کرے گا۔ بس..... تم ہمت نہ ہارو.....! اور دیکھو.....! اماں ابابہت پریشان ہیں۔ تم پلیز.....! ان کا خیال کرو۔“

اس نے آخر میں منت سے کہا تو رابعہ بے بسی سے بولی۔

”میں کیا کروں.....؟ میں شوبی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کتنے دن ہو گئے ہیں اس کی آواز سننے ہوئے،

اسے دیکھے ہوئے۔“

پھر اسے دیکھ کر بے چارگی سے پوچھنے لگی۔

”سنو.....! میں فون کروں عباد کو.....؟“

“تم.....؟”

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”کر لیتی ہوں ناں.....! جاؤ ٹیلی فون سیٹ یہیں لے آؤ۔ اماں ابا کو پتا نہ چلے۔“

رابعہ نے اتنی عاجزی سے التجا کی کہ وہ منع نہیں کر سکی، اور چپکے سے ٹیلی فون سیٹ لا کر رابعہ کو تھما دیا۔

راجہ نور اسیسور اٹھا کر نمبر ڈاکل کرنے لگی۔ پھر دوسری طرف تیل جانے لگی تو اس نے مانیہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عباد کی آواز سنتے ہی بے اختیار بو لی تھی۔

”عباد.....! شوبی کیسا ہے.....؟“

”اوہ.....! تو تمہیں خیال آ ہی گیا شوبی کا.....؟“

ادھر وہ طنز سے بولا تھا۔

”مجھے ہر پل شوبی کا خیال ہے عباد.....! خدا کے لئے آپ اس معصوم بچے پر ظلم نہ کریں۔ اسے میرے

پاس لے آئیں۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

رابعہ اس ڈر سے جلدی جلدی بول رہی تھی کہ کہیں عبادفون بند نہ کر دے۔

”اچھا.....! شوبی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، تم رہ سکتی ہو شوبی کے بغیر.....؟“

عباد کے لہجے میں حد درجہ چھین تھی۔

”نہیں.....! میں نہیں رہ سکتی۔“

رابعہ سسک پڑی۔

”نہیں رہ سکتی تو اپنے اماں باوا سے کہو، ان کے سامنے گڑ گڑاؤ، میرا دماغ خراب مت کرو۔“

عباد نے یہ کہہ کر فون پیخ دیا تھا۔

”عباد.....! میری بات سنیں.....! عباد.....! عباد.....!“

رابعہ کریڈل پر ہاتھ مار مار کر پکارنے لگی تو اس نے گھبرا کر اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور اُٹھتے

ہوئے بولی تھی۔

”بس رابعہ.....! تم بھی دل پر پتھر رکھ لو۔“

☆.....☆.....☆

وہ آج خود خواہیہ صاحب کے گھر جانے کا سوچ کر آفس سے جلدی اٹھ آیا تھا، لیکن گھر آ کر پتا چلا کہ سیما یہیں گئی ہوئی ہے تو وہ اس کے انتظار میں بچوں کے کمرے میں آ بیٹھا۔ دونوں بچے نوئی اور دردا کا رٹون دیکھ رہے

”چاچو! ماما کہاں گئی ہیں؟“

ردانے اسے دیکھ کر پوچھا تو اس سے پہلے نومی بول پڑا۔

”ماما، چاچو کے لئے چاچی دیکھنے گئی ہیں۔“

وہ نومی کی بات پر بے ساختہ مسکرایا تھا۔

”تمہیں کیسے پتا؟“

ردانے نومی سے پوچھا۔

”مجھے ممانے بتایا تھا۔“

”ہیں چاچو؟“

ردانے نومی کا جواب سن کر اس سے تصدیق چاہی تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”پتا نہیں بیٹا! مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں۔“

تب ہی سیماء کے آنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آپ! کبلی گئی تھیں بھابی؟“

”نہیں! احتیاساً تھی۔ واپسی میں پہلے اسے گھر چھوڑا، اس لئے کچھ دیر ہو گئی۔“

سیماء اسے جواب دے کر بچوں سے مخاطب ہوئی۔

”چلو چلو! شام کا وقت ہے، ذرا تازہ ہوا میں سانس لو، اور دیکھو! لڑیا نہیں، چلو شام!۔“

”ماما! ہم چاچو کے ساتھ آکس کریم کھانے جائیں گے۔“

نومی نے کہا تو وہ فوراً بولا۔

”ہاں ہاں! لے چلو گا، ابھی جاؤ ذرا بارہ کیلو!۔“

”آپ بھی آئیں ناں چاچو!۔“

ردا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

”میں آ رہا ہوں بیٹا! آپ چلو، میں آ رہا ہوں۔“

اسے خواجہ صاحب کے ہاں کا احوال جاننے کی جلدی تھی۔ بڑی مشکل سے بچوں کو بھیج کر سیماء کو دیکھا تو

وہ پوچھنے لگی۔

”تمہارے بھائی کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں۔“

”اچھا! میں انہیں چائے دے آؤں۔“

سیماء قصد اسے زنج کر رہی تھی۔

”چلیز بھابی!۔“

اس نے سیماء کا راستہ روک لیا۔

”پہلے میرے حال پر رحم کریں۔ مجھے بتائیں کیا کہا خواجہ صاحب نے؟“

”خواجہ صاحب تو ملے ہی نہیں، اور ان کی بیگم نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے پوچھنے پر نال گئیں۔“

پتا نہیں کیا سوچ رہے ہیں وہ لوگ؟“

سیماء بے زاری سے بتاتے ہوئے بیٹھ گئی۔ وہ نا سمجھ کی کیفیت میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ تب سیماء

بہنے کا اشارہ کر کے کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے دانیال! خواجہ صاحب کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ آج ان کے گھر میں بڑی ٹینشن

محسوس ہو رہی تھی۔“

”کیسی ٹینشن؟“

وہ ہنسا تھا۔

”اب یہ تو مجھے نہیں پتا، خیر! ہو گا کوئی گھر کیلوس مسئلہ۔ لیکن۔“

وہ قصداً خاموش ہو گئی۔ مقصد دانیال کو شک میں مبتلا کرنا تھا۔

”لیکن کیا بھابی؟“

”لیکن یہ کہ انہیں مجھ سے تو ٹھیک طرح سے بات کرنی چاہئے تھی۔ یہی کہہ دیتیں بیگم خواجہ کہ وہ

تمہارے رشتے پر غور کر رہے ہیں۔ مگر کچھ بھی نہیں کہا انہوں نے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کا ذہن کام نہیں کر رہا۔ اسی

سے میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔“

وہ سیماء کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”کیا بات ہو سکتی ہے بھابی؟“

”ہو گی کوئی بات! لیکن تم دیکھو ناں دانیال! مسائل کہاں نہیں ہیں؟ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی

مسئلہ تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اس ایک مسئلے کو لے کر بیٹھے رہیں، باقی سارے کام چھوڑ

دیں؟ سب کام ساتھ ساتھ ہی چلتے ہیں بھابی!۔“

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی! میں پوچھوں گا ثانیہ سے۔“

دوسری بات وہ بے دھیانی میں کہہ گیا تھا۔

”ہیں؟ ثانیہ سے کیا پوچھو گے؟“

سیماء قدرے چکرائی تھی۔

”کچھ نہیں! آپ نہ ٹینشن لیں۔ جائیں بھائی کو چائے وغیرہ پلائیں۔ میں بھی بچوں کو باہر لے کر جا رہا ہوں۔“

وہ اچانک کچھ سوچ کر غلٹ میں کمرے سے نکلا اور نوئی اور رد اکو پکارتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھا۔ پھر پہلے اس نے بچوں کو آکس کریم دلائی، اس کے بعد گاڑی خوبصورت صاحب کے گیٹ پر روک کر بچوں کو آرام سے آکس کریم کھانے کی تاکید کرتے ہوئے گاڑی سے اتر آیا اور ڈور بتیل پش کرتے ہوئے اسے یہی خیال تھا کہ دروازہ خوبصورت صاحب ہی کھولیں گے۔ اس لئے وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیسے ہی اس نے دوبارہ بٹن پر انگلی رکھی، دروازہ کھلنے کے ساتھ ایک پل کو ثانیہ کا چہرہ نمودار ہوا اور فوراً دروازہ بند ہو گیا۔

غالباً ثانیہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ جبکہ وہ نہ صرف حیران بلکہ افسوس سے بند دروازے کو دیکھ گیا۔ پھر اچانک دوسری طرف ثانیہ کی موجودگی محسوس کر کے وہ دروازے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

”میں جانتا ہوں ثانیہ! تم یہاں موجود ہو۔ مجھے سچ بتاؤ! کیا تم نے گھر کی طرح اپنے دل کا دروازہ بھی مجھ پر بند کر دیا ہے؟“

”نہیں!“

ثانیہ نے تڑپ کر دروازہ کھولا تھا۔

”نہیں دانیال! میں..... بس ابھی آپ سے بات نہیں کر سکتی۔ آپ پلیز..... چلے جائیں یہاں سے۔“

”یوں نہیں جاؤں گا۔ جب تک تم کچھ بتاؤ گی نہیں۔“

وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔

”کیا بتاؤں؟ جب مجھے خود نہیں پتا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔؟“

ثانیہ کے بے بسی پر وہ مزید ہنک گیا۔

”کیا ہونے والا ہے۔؟“

”میں نے کہا ناں! مجھے کچھ نہیں پتا۔ آپ پلیز..... ابھی اس وقت چلے جائیں۔“

ثانیہ نے منت سے کہا، پھر گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا تو وہ اس کی مجبوری سمجھ کر بولا۔

”چلا جاؤں گا، لیکن پہلے ملنے کا وعدہ کرو۔“

”نہیں دانیال! میں ملنے کا وعدہ بھی نہیں کر سکتی۔“

”تو ٹھیک ہے! میں اندر آ جاتا ہوں۔“

اس نے کہنے کے ساتھ قدم آگے بڑھایا تھا کہ وہ رو دینے کو ہو گئی۔

”خدا کے لئے دانیال! آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں؟ آپ کا اس وقت آٹا ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ ہونٹ بھیج کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو وہ عاجزی سے بولی۔

”پلیز.....! مجھ سے منہ نہ موڑیں دانیال! میں آپ کی ناراضگی نہیں سہہ سکتی۔“

وہ پھر اسے دیکھنے لگا، بولا کچھ نہیں۔

”مم..... میں آؤں گی، جہاں آپ کہیں گے، وہیں آؤں گی۔“

وہ ہار گئی۔

”تو پھر کل وہیں ملتے ہیں، جہاں پہلے ملے تھے۔“

وہ یہ کہہ کر زکنا نہیں، تیزی سے پلٹ آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر وہ ایک دم گھر کی ہر کمرہ گئی اور کیونکہ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں، اس لئے امی نے بڑے بھیا اور بھابی کو بھی ادھر ہی بلا لیا تھا۔ وہ سارا دن بچوں کے ساتھ مصروف رہتی کیونکہ اور کوئی کام امی کرنے نہیں دے رہی تھیں۔ ان کا اور بھابی کا بھی کہنا تھا کہ اب اپنے گھر جا کر ہی باندی چولہا کرنا۔ گھر میں ایک خوشگوار پانچل مچی تھی۔ بس کسی کسی وقت چھوٹے بھیا کوئی ناشوشتہ چھوڑ کر بد مزگی پیدا کر دیتے ورنہ نہ ہی خوش اور مگن سے تھے۔ پھر یوں ہی تیاریوں میں دن گزرتے پتا بھی نہیں چلا اور وہ جہانزیب کی ہمراہی میں بابل کی دلیز پار کر آئی۔

جہانزیب کی بہنیں اسے جلد عروسی تک لانی تھیں، پھر پہلے اسے نئے سرے سے سنوارا، پھر کچھ رکسیں دوئیں۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے سب کمرے سے نکل گئیں تو تنہائی ملتے ہی اس نے آکڑی ہوئی کمر کو سیدھا لڑنے کی غرض سے بید کی پشت سے ٹیک لگائی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا اور جس زاویے سے وہ بیٹھی تھی، اس کی بائیں طرف بڑی سی دیوار گیر الماری تھی اور اسی طرف دیوار کی آخری حد کے پاس غالباً اٹچنڈ ہاتھ تھا اور ابھی اس کی نظریں سامنے بھٹک رہی تھیں کہ دروازے سے باہر قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ جلدی سے بیدھی ہو بیٹھی اور زرتار آ فچل آگے تک کھینچ کر سر بھی جھکا لیا، پھر قدموں کی آواز کے ساتھ ہی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو گئیں۔

”السلام علیکم.....!“

جہانزیب نے پہلے سلام کیا پھر کچھ دیر زک کر قریب بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے سے آنچل سر کا دیا۔ ہاشمہ حسین نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے دل ہی دل میں اپنے والدین کی پسند کو نہ صرف سراہا بلکہ اپنے اندر ڈھروں المینان بھی اترتا محسوس کیا، ورنہ ابھی کچھ دیر پہلے تک وہ خاصے مضطرب سے تھے۔

”چانیہ.....!“

ان کے پکارنے پر اس نے ذرا سی آنکھیں کھولی تھیں، لیکن ان پر نظر پڑتے ہی آپ ہی آپ نہ صرف

آنکھیں پھیل گئیں بلکہ ہونٹ بھی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔

”ارے.....! آپ تو یوں حیران ہو رہی ہیں، جیسے پہلی بار مجھے دیکھا ہو۔“

وہ ذرا سانس کر بولے تو وہ باوجود کوشش کے نہ ٹپکیں جھکا سکی نہ سر۔ حیرت کا مقام تو تھا اور اسے اپنی بصارتوں پر یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ غلطی سے یہاں آ گئی ہے یا سانسے بیٹھا شخص۔

”جنگی نے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ بہت خاموشی سے میرا دیدار کر آئی تھیں۔“

انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تو وہ چونکی، ساتھ ہی جنگی کی بات یاد آئی۔

”پتا نہیں کس کو دیکھ آئی ہو.....؟“

”نہیں.....! میں نے اس کا نام پوچھا تھا اور وہ جہاز زیب تھا۔“

اس نے یقین سے کہا تھا اور اب یہ سوچنے کو عمر پڑی تھی کہ اگر یہ جہاز زیب ہیں تو وہ کون تھا جسے اپنا سمجھ کر اس نے دل میں جگہ دی تھی اور اب اس کی حالت اس مسافر کی تھی جو منزل پر آ کے جھکا ہو۔

ابھی کچھ دیر پہلے کی ساری کیفیات آن کی آن میں زخمت ہو گئی تھیں۔ نہ آنکھوں میں ہمارا، نہ لبوں پر مسکان، دل جو دمھلے پر دھڑک رہا تھا، وہ الگ ڈھانیاں دینے لگا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان محبتوں کو کیسے محسوس کرے.....؟

”جب آپ وہاں تک آئی تھیں تو مجھ سے ملیں کیوں نہیں.....؟“

انہوں نے دھیمے لہجے میں پیار بھرا شکوہ کیا تو اس نے محض اپنے چکراتے سر کو سہارا دینے کی خاطر ٹھوڑی گھٹنوں پر نکالی۔ اس کے بعد وہ پتا نہیں کیا کچھ کہتے رہے، وہ ڈھنگ سے کوئی بات نہیں سن سکی، کیونکہ اندر ایک محشر برپا تھا۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں آتے جاتے اماں بار بار رابعہ کو دیکھ رہی تھیں جو پچھلے دو تین دن سے بالکل چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت بھی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے وہ کم کم بیٹھی تھی۔ اماں کو ہول اُٹھنے لگا۔ آخر اس کے پاس آ بیٹھیں اور نرمی سے گویا ہوئیں۔

”بیٹا.....! تم تو ہمیشہ سے بہت صابر ہو۔ کچھ دن اور صبر کر لو.....! اللہ کوئی راستہ نکال دے گا۔“

”میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں اماں.....؟“

رابعہ بے چارگی سے بولی تھی۔

”تمہاری چپ زیادہ تکلیف دے رہی ہے مجھے، کچھ بولو.....! خود کو کسی کام میں مصروف کرو۔ سارا

وقت ایک ہی خیال میں رہو گی تو بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”میںیں پڑتی پیار، آپ فکر نہ کریں۔“

”ارے.....! کیسے فکر نہ کروں.....؟ میری جان کو تو سوکریں گئی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں.....؟“

ادھر دانیال کے بھائی بھاجو جواب مانگ رہے ہیں۔

اماں نے کہا تو رابعہ چونک پڑی۔

”تو اماں.....! آپ نے انہیں کیوں لٹکا رکھا ہے.....؟ اگر آپ اور ابا مطمئن ہیں تو بات کچی کر دیں

ناں ٹائی کی۔“

”تمہارے ابا نہیں مان رہے۔ کہہ رہے تھے، پہلے تمہارا معاملہ ٹھیک ہو جائے، پھر ٹائی کا سوچیں گے۔“

اماں نے بتایا تو وہ پریشانی سے بولی۔

”لیکن اماں.....! اس طرح تو بات خراب ہو سکتی ہے۔“

”اللہ مالک ہے۔ اس نے ٹائی کے نصیب میں جو لکھا ہوگا، اسے وہی ملے گا۔“

اماں نے گہری سانس کے ساتھ کہا تو وہ ڈکھ سے بولی۔

”پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اماں.....! جب یہ طے ہے کہ جو ہمارے نصیب میں لکھا ہوگا، وہی ہمیں

ملے گا تو پھر آپ روتی کیوں ہیں.....؟“

”ہم نصیب کے لکھے کو نہیں روتے بیٹا.....! ہمیں اولاد کی محبت نہ لاتی ہے۔“

اماں یہ کہہ کر خود ہی شیشائیں، پھر کہنے لگیں۔

”میں مانتی ہوں تمہاری مانتا بھی اپنے بچے کے لئے تڑپتی ہے۔ تمہارے ابا کو بھی احساس ہے، جب

ہی تو.....“

”کیا جب ہی تو.....؟ بتائیں ناں اماں.....!“

رابعہ نے اماں کا خاموش ہو جانا محسوس کیا تھا۔

”کچھ نہیں بیٹا.....! میں تو.....“

اماں بات بنانے جاری تھیں کہ خواجہ صاحب کی آواز سن کر انہیں اُٹھنے کا موقع مل گیا۔

”لو.....! تمہارے ابا آ گئے۔“

وہ رابعہ کو سوالیہ نشان بنے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ خواجہ صاحب سر جھکائے بیٹھے غڑحال نظر آ

رہے تھے۔

”کیا ہوا میاں.....؟ خیریت تو ہے.....؟“

اماں نے ان کے سامنے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”ہاں.....!“

خواجه صاحب ”ہاں“ کولہا کھینچ کر بولے۔

”میں عباد سے ملنے اس کے آفس گیا تھا۔ وہیں سے آ رہا ہوں۔“

”پھر.....؟“

”میرا خیال تھا میں عباد کو سمجھا لوں گا، اسے اس کی بیوی اور بچے کا احساس دلاؤں گا، اور میں نے ایسی ہی ممکن کوشش کی، لیکن وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہتا۔“

خواجه صاحب مایوسی سے سر ہلانے لگے۔

”کیا کہتا ہے.....؟“

اماں نے بیٹھے دل کے ساتھ پوچھا۔

”وہی جو اس کی ماں کی ضد ہے۔ اُلٹا مجھے سمجھانے بیٹھ گیا کہ میری دونوں بیٹیاں ایک ہی گھر میں رہیں

گی، ایک دوسرے کا ڈکھ سکھ سمجھیں گی۔“

خواجه صاحب نے بتایا تو اماں ناگواری سے بولیں۔

”ڈکھ ہی ڈکھ.....! سکھ کہاں ہے اس گھر میں.....؟ امی ہم ایک بیٹی کے لئے پریشان ہیں، پھر دونوں کے لئے ٹکھیں گے۔“

”شاید ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔“

خواجه صاحب نے کہا تو اماں ایک دم پریشان ہو گئیں۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میاں.....؟ کہیں آپ ثانیہ کے لئے ہامی تو نہیں بھرا آئے.....؟“

”نہیں.....! ہامی تو نہیں بھری، البتہ یہ کہہ آیا ہوں کہ پہلے اسد کی کام سے لگے، پھر میں سوچوں گا۔“

خواجه صاحب دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ پھر اماں کو دیکھ کر ان سے زیادہ شاید خود کو ٹی دی تھی۔

”ہو سکتا ہے بیگم.....! کام کاج سے لگ کر لڑکا سدھر جائے.....؟ ہمیں رابعہ کو بھی تو دیکھنا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے میاں.....! اور ادھر جو دانیال کا رشتہ آیا ہوا ہے، کیا انہیں منع کر دوں.....؟“

اماں نے پوچھا تو خواجه صاحب چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

”ایک بات کہوں میاں.....؟“

”نہیں.....! ابھی کچھ مت کہو.....! میرا حوصلہ جواب دے رہا ہے۔ ثانیہ سے کہو ٹھنڈا پانی لے آئے

گلو کو زملہ کر۔“

”ثانیہ تو اپنی پہلی کے ہاں گئی ہے، میں خود ہی لاتی ہوں۔“

اماں یہ کہتے ہوئے فوراً اٹھ گئی تھیں۔

وہ اماں سے پہلی کے گھر کا بہانہ کر کے دانیال سے کیا ہوا وعدہ نبھانے آئی تھی، اور اصولاً تو دانیال کو پہلے سے موجود ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ بتا نہیں کہاں رہ گیا تھا کہ اسے نہ پا کر وہ پریشان ہو گئی۔ دل تو چاہا فوراً واپس چلی جائے۔ کیونکہ ریٹورینٹ میں اکیلے بیٹھنا اسے مشتہد تو بناتا ہی رہا تھا، وہ خود بہت خائف ہو رہی تھی۔ پھر بھی خود پر جبر لے کر اس نے چندرہ منٹ انتظار کیا۔ پھر لوگوں کی گھورتی نظروں سے گھبرا کر وہاں سے نکل آئی۔

اسے دانیال پر غصہ آ رہا تھا اور وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ کہیں دانیال نے جان بوجھ کر تو اس کے ساتھ ایسا نہیں کیا.....؟ کچھ بھی تھا، وہ گھر آئی تو اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔ جب ہی رابعہ نے تشویش سے پوچھا تھا۔

”کیا ہوا ثانیہ.....؟ کہاں سے آ رہی ہو.....؟“

”کہاں سے کیا مطلب.....؟“

وہ گھبراہٹ چھپانے کو ہنسی تھی۔

”مطلب کہیں کوئی تھیں کیا.....؟“

”ہاں.....! اپنی پہلی فرزانہ کے گھر گئی تھی، وہیں سے آ رہی ہوں۔“

اس نے بتایا تو رابعہ خاموش ہو گئی، لیکن اس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔

”تم ایسے کیوں دیکھ رہی ہو.....؟ میں اماں سے پوچھ کر گئی تھی۔“

یہ اس کے دل کا چور تھا۔

”ہاں.....! ظاہر ہے، پوچھ کر ہی گئی ہوگی، اور شاید اماں نے مجھے بتایا بھی تھا، میں ہی بھول گئی۔“

رابعہ نے کہا تو فوراً بولی۔

”اس میں تمہارا قصور نہیں ہے رابعہ.....! تم جن حالات سے گزر رہی ہو، اس میں اچھے اچھوں کو اپنا

آپ یاد نہیں رہتا۔“

”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔“

رابعہ آرزوگی میں گھر گئی۔

”مت اتنا سوچا کرو۔ جب عباد بھائی کو احساس نہیں ہے تو تم کیوں ٹکھتی ہو.....؟“

اس نے کہا، جب ہی اماں کے پکارنے کی آواز آئی تو وہ جلدی سے واش روم میں گھس گئی۔ پھر منہ ہاتھ

دھو کر کچن میں آئی تو اماں تسلی میں آٹا نکالے کھڑی تھیں۔

”آپ ہٹ جائیں اماں.....! میں کر لوں گی۔“

اس نے اماں کو زبردستی اندر بھیج دیا اور پھر رات کے کھانے تک وہ کچن میں مصروف رہی۔ اصل میں تو وہ

تہائی چاہ رہی تھی۔ گو کہ ذہن یکسو نہیں تھا، دل بھی خدشوں کی زد میں آ گیا تھا۔ ہر سوچ کا اختتام اس بات پر ہوتا کہ

دانیال آیا کیوں نہیں؟

”اس کے ساتھ تو کوئی مجبوری نہیں ہو سکتی؟“

اور خود سے قیاس کرتے ہوئے ہی وہ خدشوں میں گھر گئی تھی۔ پھر وہ سونے کے لئے ہی کمرے میں آئی تھی۔ رابعہ شاید اماں کے کمرے میں تھی۔ اس نے شکر کیا اور لیٹتے ہی نکلے میں منہ چھپا کر سوتی بن گئی تھی۔ کچھ دیر بعد رابعہ کمرے میں آئی اور اسے منہ چھپائے لیٹے دیکھ کر حیرت سے بولی تھی۔

”ہیں؟ تم اتنی جلدی سو رہی ہو؟“

اس نے جواب نہیں دیا تو رابعہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

”مجھے پتا ہے، تم جاگ رہی ہو۔“

وہ نکیہ ہٹا کر رابعہ کو دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟ میرا مطلب ہے، کوئی بات ہوئی ہے تو بتاؤ.....!“

رابعہ نے ٹوکا تو وہ نظریں چرا کر بولی۔

”نہیں.....! کوئی بات نہیں ہوئی۔“

”کم از کم مجھ سے تو مت چھپاؤ.....!“

”میں کچھ نہیں چھپا رہی۔“

اس نے پھر نکیہ منہ پر رکھنا چاہا کہ رابعہ نے نکیہ کھینچ کر پھینک دیا۔

”دیکھو.....! اتنا تو میں جان گئی ہوں کہ تم پریشان ہو۔ شام میں جب تم اپنی سہیلی کے ہاں سے آئی تھی تو

اس وقت تمہارا چہرہ اتر ا ہوا تھا۔ کیا وہاں کوئی بات ہوئی ہے؟“

”نہیں.....! میں سہیلی کے گھر نہیں گئی تھی۔“

اس کے منہ سے بلا ارادہ ج کھل گیا تھا، جس پر وہ گھبرا اسی گئی۔

”پھر؟“

رابعہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ جزبہ ہو کر بولی۔

”میں دانیال سے ملنے گئی تھی۔“

”دانیال سے؟ اس کے گھر گئی تھی کیا؟“

رابعہ نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں.....! ہمیں کہیں اور ملنا تھا، لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

رابعہ نے فوراً ٹوکا۔

”بس.....! وہ دانیال نہیں آئے۔ میرا مطلب..... میرا مطلب ہے، دانیال کے آنے سے پہلے ہی میں

واپس آ گئی۔ مجھے..... مجھے ڈر لگ رہا تھا، اس لئے میں نے ان کا انتظار نہیں کیا۔“

وہ زک زک کر بول رہی تھی۔

”تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ اگر تم جاتے ہوئے مجھے بتا دیتی تو خود تمہارے

اندر کو فیڈلس آ جاتا۔“

رابعہ نے کہا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں، آئندہ آزمادیکھنا۔“

رابعہ نے مسکرا کر اس کی ٹھوڑی ہلائی تو اس نے بازو میں چہرہ چھپا لیا۔

☆.....☆.....☆

اسے آج پہلی بار سیما پر غصہ آ رہا تھا، جس نے عین اس وقت جب وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ثانیہ

سے ملنے جا رہا تھا، تو سیما نے بچوں کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ دونوں بچے آؤنگ ٹک پر جانے کے لئے جھل گئے تھے۔ روا

تو باقاعدہ رونے لگی تھی۔ اس نے لاکھ کہا کہ وہ ایک ضروری میٹنگ میں جا رہا ہے، آدھے گھنٹے میں واپس آ کر بچوں کو

لے جائے گا، لیکن سیما نے بھی اس کی ایک نہیں سنی۔ یوں سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی جیسے بچوں نے اسے عاجز کر دیا ہو، اور

اس سے ہی کہا کہ بچے گاڑی میں ہی بیٹھے رہیں گے، ہم انہیں لے جاؤ۔

اور پھر جاتے جاتے تنا بھی ساتھ چل پڑی تھی۔ جب ہی پھر وہ ثانیہ کے پاس جانے کا سوچ بھی نہیں

سکا، لیکن پریشان ضرور تھا۔ زیادہ پریشانی ثانیہ کی طرف سے تھی کہ اسے نہ پا کر وہ کتنی پریشان ہوگی.....؟ ایک تو اس

لڑکی کو گھر کی طرف سے سیل فون رکھنے کی اجازت نہیں تھی، جو وہ اس سے رابطہ کر کے معذرت کرتا، بلکہ اسے گھر سے

نکلنے سے ہی روک دیتا، اور کسی اور دن پر رکھ لیتا۔

بہر حال وہ بری طرح پھنس گیا تھا، اور جب واپس آیا تو اس کا موڈ سخت آف تھا۔ کسی سے بات کرنے کو

دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سیدھا اپنے کمرے میں آ کر دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا۔ پھر چیخ کر کے ثانیہ کا نمبر ڈائل کیا اور

کتنی بار ٹرائی کرنے کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔

”آئی ایم سوری ثانیہ.....!“

وہ چھوٹے ہی بولا تھا۔

”مجھے احساس ہے، تم کتنی پریشان ہوئی ہوگی، لیکن میں کیا کرتا.....؟ یہاں بھابی کے ایک ضروری کام

میں پھنس گیا تھا۔“

”اگر ایسا تھا تو آپ پہلے مجھے فون کر دیتے، میں گھر سے نکلتی ہی نہ۔“

وہ جج ناراض تھی۔

”میں نے سوچا تھا لیکن موقع ہی نہیں ملا۔ بس آنا فانا بھائی نے ایک کام سے بھیج دیا تھا۔“
اس نے کہا، پھر ادھر اس کی خاموشی محسوس کر کے پوچھنے لگا۔

”کیا بہت ناراض ہو.....؟“

وہ ابھی بھی خاموش تھی۔

”معاف کر دیا.....! دیکھو.....! میں کان پکڑ رہا ہوں۔ آئندہ تم سے جو کٹ منٹ ہوگی، اس کے لئے میں باقی سارے کام چھوڑ دوں گا۔“

وہ باقاعدہ کان پکڑ کر بولا تھا۔

”وعدہ.....؟“

”پکا وعدہ.....! اب تو ناراض نہیں ہونا.....؟“

اس نے فوراً وعدہ کر کے پوچھا تو ادھر وہ ہنسی تھی۔

”میں پہلے بھی ناراض نہیں تھی، بس.....! آپ کو تنگ کر رہی تھی۔“

”اچھا.....! تو تم تنگ بھی کرتی ہو.....؟“

وہ محظوظ ہو کر بولا اور اس کے فون رکھنے پر پہلے بھنجایا، پھر مسکرانے لگا تھا۔

☆☆☆☆

پھر ابتدائی دنوں میں اس کی غیر معمولی خاموشی کو کسی نے یوں زیادہ محسوس نہیں کیا کہ سب اسے فطری شرم پر محمول کرتے رہے تھے، لیکن جب اس دور سے نکل کر بھی اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی، جب سب کو حیرت ہوئی۔ سب سے پہلے جہانزیب نے محسوس کیا اور اس انداز میں ٹوکا۔

”کیا تم کو نگے بہروں کے اسکول میں پڑھاتی تھیں.....؟“

”نہیں.....!“

وہ حیران ہوئی۔

”گلتا تو یہی ہے، کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ ایک اسکول بچہ اتنی کم گو ہو سکتی ہے۔“

وہ ابھی ان کی بات کا جواب سوچ رہی تھی کہ وہ پوچھنے لگے۔

”کیا تمہیں یہاں ایڈ جسٹ ہونے میں کسی دشواری کا سامنا ہے.....؟“

”نہیں تو.....!“

”پھر کیا وجہ ہے.....؟ تم اتنی کھینچی کھینچی سی کیوں رہتی ہو.....؟“

”نہیں تو.....!“

”کیا نہیں تو.....؟“

”میرا مطلب ہے، میں یہاں خوش ہوں۔“

”خوش ہو تو خوشی کا اظہار کرنا بھی سیکھو۔“

وہ جتانے والے انداز میں کہہ کر کروٹ بدل گئے اور وہ اپنی جگہ سن ہو گئی، اور یہاں آنے کے بعد سے اس نے ایک بار بھی پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اپنی ساری کوششیں اس بات پر صرف کرتی رہی تھیں کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ وہ انجانے میں کتنی بڑی غلطی کر آئی تھی۔ لیکن ابھی جہانزیب نے جس طرح جتایا تھا، اس سے اسے اپنی کوششیں رائیگاں جانی لگیں، اور پہلی بار گزرے حالات اس کی نگاہوں میں آ سائے۔

”وہ کون تھا اور اس کا مقصد کیا تھا.....؟“

آخر میں کتنی دیر تک وہ اسی سوچتی رہی، لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ یہ ضرور جان گئی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اپنی شخصیت کے اسرار سمیت اب بھی اس کے اندر موجود ہے۔

”نہیں.....!“

وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگی۔

”وہ یقیناً کوئی شاطر تھا، جس نے میری بے خبری سے فائدہ اٹھایا۔ محض وقت گزاری کے لئے اس خوب صورتی سے محنت کی آنکھ چولی کھلتا رہا کہ مجھے کبھی شبہ تک نہیں ہوا کہ وہ جہانزیب نہیں ہو سکتا۔“

”جہانزیب.....!“

اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں نے بلا ارادہ اس نام کو چھوا تھا اور جہانزیب جیسے منتظر تھے فوراً پلٹ کر دیکھنے لگے۔

”کیا بات ہے.....؟“

ان کے پوچھنے پر وہ چوکی۔

”کچھ نہیں.....!“

اس کے ساتھ ہی کروٹ بدل لی تو جہانزیب حیران ہوئے۔

”عجب لڑکی ہے، پکار کر منہ موڑ گئی۔“

رات گو کہ وہ تہیہ کر کے سوئی تھی کہ آئندہ جہانزیب کو شکایت کا موقع نہیں دے گی، اس کوشش کے باوجود صبح وہ فوری طور پر اپنے انداز میں گھر کے افراد جیسی بے تکلفی پیدا نہیں کر سکی۔ بس اتنا ہوا کہ کچن سے ڈائننگ ٹیبل تک اس نے کئی چکر لگا ڈالے۔ یہ ایک طرح سے اپنے آپ کو مصروف ٹھاہر کرنے کی غیر شعوری کوشش تھی، جیسے اس کے پاس بات کرنے کے لئے وقت نہ ہو۔ جہانزیب نے بہت خاموشی سے اس کا جائزہ لیا اور اس کے انداز

سے یہی سمجھ کر وہ رات کی کسی بات سے خفا ہے اور اس وقت تو نہیں، البتہ شام میں تلافی کے طور پر اسے گھمانے لے گئے۔ اصل میں وہ خود خفا صلیجوتھے، اس لئے نہیں چاہتے تھے کہ ان کے درمیان کوئی رنجش ہو جس کی خبر گھر والوں کو بھی ہو جائے۔

غالباً رات تم نے میرے رڈیے کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ مائنڈ بھی کیا۔“

راستے میں وہ اس سے کہنے لگے۔

”نہیں تو.....! آپ نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جسے میں مائنڈ کرتی۔“

”پھر تم خفا کیوں ہو.....؟“

”آپ سے کس نے کہا کہ میں خفا ہوں.....؟“

انہوں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر اپنی کہنے لگے۔

”اصل میں، میں نے بہت روکھی پھینکی زندگی گزاری ہے۔ زمانہ طالب علمی میں کالج تک میری صرف کتابوں سے دوستی رہی، البتہ یونیورسٹی میں زوہیب کے ساتھ تھوڑی بہت دوستی ہو گئی تھی، حالانکہ ہمارے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یعنی میں جتنا خشک، وہ اتنا ہی رنگین مزاج تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ دو سال تک ساتھ رہنے کے باوجود ہم دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول نہیں کیا۔“

قد رے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”وہ اکثر مجھے سمجھانے اور پھر قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ میرے ٹھہرے ہوئے مزاج کے ساتھ کوئی لڑکی زیادہ عرصہ تک سمجھوتہ بھی نہیں کر سکے گی۔ اس کا کہنا تھا کہ میری بیوی مجھ سے متفرق نہیں تو میرے ساتھ خوش بھی نہیں رہے گی۔“

وہ ایک دم سناٹوں میں گھر گئی، جبکہ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا کہ پتا نہیں اب آگے وہ کیا کہیں گے.....؟

”وہ نہیں جانتا جانیہ.....! کہ تم میرے ساتھ خوش ہو یا نہیں، کیونکہ اب تک تمہارے کسی انداز سے کوئی اظہار نہیں ہوا۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں خوشی کا ڈھنڈورا سارے شہر میں پیٹتی پھروں.....؟“

وہ سنبھل کر بولی۔

”نہیں.....!“

”پھر.....؟“

”پھر یہ کہ کم از کم میرے سامنے تو اظہار کرو، ورنہ میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ جیسے زوہیب ٹھیک کہتا تھا۔

گو کہ تمہارے انداز میں متفرق نہیں ہے، لیکن وہی بات کہ متفرق نہیں تو خوش بھی نہیں۔“

پھر اپنے آپ پر الزام رکھتے ہوئے بولے۔

”ویسے میں خود بھی بہت اناڑی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ بیوی کو خوش کیسے رکھا جاتا ہے.....؟“

”آپ نہ تو اناڑی ہیں اور نہ ہی نادان، اس کے برعکس بات صرف اتنی سی ہے کہ زوہیب کی باتیں آپ

لے ان کے کسی گوشے میں جم کر رہ گئی ہیں، اور اب ان ہی کی روشنی میں آپ مجھے دیکھنے اور پرکھنے لگے ہیں۔“

اس نے بڑی خوب صورتی سے ان کا نفسیاتی تجزیہ کیا اور وہ قائل ہو کر بولے۔

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”شاید نہیں، یقیناً.....!“

پھر اس موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے بولی۔

”میں کچھ میگزین لینا چاہتی ہوں۔“

”ضرور.....!“

انہوں نے ایک بک اسٹال کے سامنے گاڑی روک دی، پھر اس سے پوچھنے لگے۔

”میں لے آؤں یا.....؟“

”آپ لے آئیں۔“

اس نے کہا تو وہ گاڑی بند کر کے اتر گئے۔

”میرے خدا.....!“

اس نے گہری سانس لے کر سوچا۔

”ابھی تو اس زندگی کی ابتداء ہے اور ابھی سے جہان زیب یہ سوچنے لگے ہیں کہ میں ان کے ساتھ خوش

ہوں یا نہیں.....؟ آخر انہیں میری طرف سے یہ شب یا خدشہ کیوں ہے.....؟“

”جانیہ.....!“

اپنے نام پر اس نے چونک کر دیکھا اور بس دیکھنے کی حد تک ہی اس میں زندگی کی رتق رہ گئی تھی۔

”میری طرف اپنی گاڑی کے شیشے میں سے سر نکال کر اسے پکارنے والا وہی تھا جو پورے ایک سال تک جہان زیب بن

را اس کے ساتھ صحبت کی آنکھ پھولی کھیلتا رہا تھا۔

”کیسی ہو جانیہ.....؟ اور تم کہاں چلی گئی ہو.....؟ میں اس روز سے مسلسل تمہیں رنگ کر رہا ہوں، لیکن

”ہماری آواز سنائی نہیں دیتی۔ سنو.....! اکل میں تمہیں فون کروں گا۔ پلیز.....! میری بات سن لینا۔“

اس کے ساتھ ہی وہ گاڑی بڑھالے گیا۔ اب سامنے ٹریفک رواں دواں تھی، لیکن اس کا ذہن اس حد

تک ماؤف ہو چکا تھا کہ وہ پھر بھی اسی طرح بے حس بیٹھی رہی۔

”بس.....! یہی میگزین ہیں۔“

جہانزیب آکر بیٹھے اور اس کی گود میں بیگم زین ڈال کر کہا تو وہ چوکی نہیں، بس ذرا سا نظروں کا زاویہ بدل کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کچھ اور لینا ہے؟“

انہوں نے سرسری نظر اس پر ڈال کر پوچھا، تب اس نے چونک کر پہلے اپنے اطراف نظر ڈالی پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”نہیں!.....“

”کمال ہے!.....! میں نے تو سنا تھا، بیویاں شوہروں کی جیب خالی کرانے میں ماسٹر ہوتی ہیں۔“

”یہ بات آپ سے زوہیب نے کبھی ہوگی؟“

وہ بے ساختہ زور سے ہنسنے لگی۔

”زوہیب نے بعد میں کبھی تھی، پہلے میں نے کہیں پڑھی تھی۔“

پھر احتیاط سے گاڑی ریورس کرنے لگے۔ اس کے بعد شفاف سڑک پر آئے تو کہنے لگے۔

”بہت دلچسپ آدمی ہے زوہیب، میں تمہیں اس سے ملواؤں گا، اور ہاں!..... اب گھر چلو گی یا.....؟“

”گھر چلیں!.....“

”اگر اپنی امی کی طرف جانا چاہو تو.....“

”امی کی طرف؟.....؟“

اس کا ذہن بھٹک گیا۔

”میں کل تمہیں فون کروں گا، پلیز!..... میری بات سن لینا۔“

”چلیں!.....؟“

”نہیں!.....؟“

وہ سنبھل کر بولی۔

”میرا مطلب ہے، کل چلیں گے۔ صبح آفس جاتے ہوئے آپ مجھے وہاں مجھے چھوڑ دیجئے گا اور پھر

واپسی میں، میں آپ کے ساتھ آج بھی جاؤں گی۔“

”اچھی بات ہے۔“

انہوں نے گاڑی گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

☆.....☆.....☆

رابعہ کو گو کہ اپنے بچے کے بغیر کسی پل چین نہیں تھا، لیکن اب اماں ابا کی پریشانی کا خیال کر کے وہ خود پر

جبر کرنے لگی تھی۔ گھر کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ اس وقت اماں کو ہمزی کا نٹے دیکھ کر وہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے چھری لیتے ہوئے بولی۔

”آپ رہنے دیں اماں!..... میں کرلوں گی۔“

”ارے بیٹا!.....! فارغ نہیں بیٹھا جاتا مجھ سے۔ اللہ بخشنے!..... تمہاری دادی کہتی تھیں، بہو!..... تم

ایک دن کے لئے میکے جاتی ہو تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔“

اماں شاید ابھی اس وقت کو سوچ رہی تھیں، ان کے چہرے پر گئے دنوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔

”مجھے یاد ہیں دادی، بہت پیار کرتی تھیں ناں مجھ سے؟.....؟“

رابعہ کو دادی یاد آ گئیں۔

”اں!.....! سارا پیار انہوں نے تم پر ہی تولٹا یا، ثانیہ تو.....“

ڈورنٹل بچنے سے اماں کی بات اُدھوری رہ گئی۔

”میں دیکھتی ہوں اماں!.....!“

رابعہ اُٹھنے لگی کہ اماں نے روک دیا۔

”ارے نہیں!.....! تم بیٹھی رہو۔ اس وقت پتا نہیں کون آیا ہے؟.....؟“

اماں کہتے ہوئے اُٹھ گئیں اور جا کر دروازہ کھولا تو آگے رابعہ کی ساس بتول بیگم کھڑی تھیں۔

”آئیے بہن!.....! آپ تو ادھر کا راستہ ہی بھول گئیں۔“

اماں بمشکل اپنی ناگواری چھپا سکی تھیں۔

”ارے!.....! میں تو کب سے آنا چاہ رہی تھی۔“

بتول بیگم دھڑلے سے اندر آتے ہی ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”رابعہ کہاں ہے؟.....؟“

”نہیں ہے، آپ بیٹھیں!.....! میں پانی لاتی ہوں۔“

اماں نے کہا تو وہ فوراً ان کا بازو تھام کر بولیں۔

”آپ کیوں تکلیف کر رہی ہیں؟.....! رابعہ کو بلائیں، وہ لے آئے گی پانی، آپ بیٹھیں میرے پاس!.....!“

”جی!.....!“

اماں ناچار بیٹھ گئیں تو بتول بیگم اپنی چادر میں سے مٹھائی کا ڈبہ نکال کر انہیں تھمتے ہوئے بولیں۔

”یہ لیجئے!.....! خوش خبری لائی ہوں آپ کے لئے۔“

”کیسی خوش خبری؟.....؟“

اماں ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”میرے اسد کی نوکری لگ گئی ہے۔ اسی خوشی میں مٹھائی لائی ہوں۔“
بتول بیگم خوش ہو کر بولیں تو اماں کو یقین نہ آنے کے باوجود کہا پڑا۔

”اچھا! مبارک ہو!۔۔۔!“

تب ہی رابعہ دروازے میں آکر کڑک گئی۔ وہ ساس کو دیکھ کر کچھ خائف ہو گئی تھی۔

”ارے!۔۔۔! تم وہاں کیوں کھڑی ہو۔۔۔؟ یہاں آؤ۔۔۔! میں تمہیں ہی لینے آئی ہوں۔“

بتول بیگم اسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

”حالانکہ صبح عباد آفس جاتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ واپسی میں تمہیں لیتا آئے گا، لیکن مجھ سے صبر نہیں

ہوا۔“

رابعہ نے ان کی بات سن کر اماں کو دیکھا تو وہ نظریں چرائیں، کیونکہ انہوں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ خواجہ

صاحب اسد کے رشتے پر تقریباً ہامی بھڑ آئے ہیں۔

”شوہنی کیا ہے امی؟۔۔۔؟ آپ اسے کیوں نہیں لائیں۔۔۔؟“

اس نے اماں سے نظریں ہٹا کر بتول بیگم سے کہا۔

”شوہنی سو رہا تھا بیٹا!۔۔۔! پھرتی گری پڑ رہی ہے، بچہ پریشان ہو جاتا۔ چلو۔۔۔! تم چل رہی ہو

ناں۔۔۔؟“

بتول بیگم نے جواز کے ساتھ پوچھا تو وہ شوہنی کے خیال سے ہی فوراً بولی تھی۔

”جی!۔۔۔!“

”بیٹا!۔۔۔! پہلے کچھ ٹھنڈا چائے۔“

اماں نے کہنے کے ساتھ اسے اشارہ بھی کیا۔

”میں ابھی لاتی ہوں۔“

وہ کسی طرح غلت پر قابو نہیں پاسکی، تیزی سے کمرے سے نکل کر آئی تو آگے ثانے سے ٹکرائی۔

”افوہ!۔۔۔! کیا ہوا ہے۔۔۔؟ اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں ہو۔۔۔؟“

ثانیہ نے خود کو گرنے سے بچا کر پوچھا۔

”میری ساس آئی ہیں مجھے لینے۔“

رابعہ نے خوشی سے بتایا تو ثانے نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

”ارے!۔۔۔! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“

”ہاں!۔۔۔! تم جلدی سے ان کے لئے جوس بنا دو۔ میں جب تک پیچھ کر لوں۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟ ابھی جاؤ گی تم؟۔۔۔؟“

”ہاں ناں!۔۔۔! بس!۔۔۔! تم جلدی کرو۔۔۔!“

وہ ثانے کو دھکیل کر کمرے میں آگئی۔ اب اس کا بس نہیں چل رہا تھا، اڑ کر شوہنی کے پاس پہنچ جائے۔ دو

منٹ میں کپڑے بدل کر تیار ہو گئی پھر جب تک بتول بیگم جوس پیتیں، اس نے پڑوس کے لڑکے کو بھیج کر رکشہ منگوا لیا

تھا۔ اس کی غلت پر اماں اسے گھورتی رہ گئیں، لیکن اسے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ بتول بیگم سے پہلے جا کر رکشہ میں

بیٹھ گئی تھی۔

اور گھر آ کر تو اس نے بتول بیگم کا خیال نہیں کیا۔ سوئے ہوئے شوہنی کو جھپٹنے کے انداز میں اٹھا کر سیدھی

اپنے کمرے میں آگئی۔

”میرا بچہ!۔۔۔! میرا شوہنی!۔۔۔!“

وہ دیوانہ وار شوہنی کو چوم رہی تھی کہ اسد آ کر اونچی آواز میں بولا تھا۔

”اوہو!۔۔۔! بڑے لاڈ ہو رہے ہیں۔۔۔؟“

رابعہ اس اچانک آواز پر نہ صرف اچھٹی، اسے غصہ بھی آ گیا تھا۔

”کتنی بار کہا ہے اسد!۔۔۔! یہ منہ اٹھائے اندر مت چلے آیا کرو۔ دستک دینے میں تمہارے ہاتھ گھٹے

ہیں کیا۔۔۔؟“

”اپنوں کے دروازے پر کون دستک دیتا ہے بھابی۔۔۔؟“

اسد ڈھٹائی سے ہنسا تھا۔

”ہر شریف آدمی!۔۔۔!“

وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”تو میں کیا بد معاش ہوں۔۔۔؟“

اسد نے کہا تو وہ غصے سے سر جھٹک کر شوہنی میں لگ گئی۔

”او بھابی!۔۔۔! یہ غصہ کسی اور کو دکھانا۔ میں رعب میں آنے والا نہیں ہوں۔“

اسد اپنی اصلیت دکھانے لگا تو وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”تم پلیز!۔۔۔! جاؤ میرے کمرے سے۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”بات نہیں کرنا چاہتی تھی مجھ سے تو رکتی اپنے ابا کو، نا منظور کرتے میرا رشتہ۔۔۔؟“

اسد نے اسے پکڑا دیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟“

”بڑی بھولی بن رہی ہو۔۔۔؟ تمہاری اس گھر میں واپسی ایسے ہی نہیں ہو گئی۔۔۔؟ میرا رشتہ منظور کیا ہے

تمہارے ابا نے۔

”نہیں!“

اس نے ایک دم اسد کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہوتاں تم۔“
اسد اسے دھکیل کر ہنستا ہوا چلا گیا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اماں نے رابعہ کی بیچ کے لئے بے قراری دیکھتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں بھی انہیں روکنا تو نہیں تھا، لیکن وہ چاہتی تھیں کہ جو بھی بات ہو، خواجہ صاحب کے سامنے ہو۔ لیکن بتول بیگم ایسے وقت آئی تھیں، پھر شوبی کو بھی گھر چھوڑ آئی تھیں۔ اس لئے وہ کچھ کہہ نہ سکیں۔ لیکن رابعہ کے جانے کے بعد وہ کچھ پریشان ہو گئی تھیں کہ کہیں خواجہ صاحب ان پر ناراض نہ ہوں کہ ایسے کیوں بھیج دیا رابعہ کو۔

اور جب خواجہ صاحب آئے تو انہوں نے کچھ ڈرتے ڈرتے رابعہ کے جانے کا بتایا تو فوراً خواجہ صاحب کچھ نہیں بولے، جانے کس سوچ میں پڑ گئے تھے۔ پھر کتنی دیر بعد جیسے اپنے آپ سے بولے تھے۔
”تو رابعہ اپنے گھر چلی گئی۔“

”ہاں میاں!۔۔۔۔۔! جب آپ نے انہیں آسرا دے دیا تو پھر بتول بیگم دھڑلے سے آگئیں، اور ہاں!۔۔۔۔۔! یہ خوش خبری بھی سنا گئی ہیں کہ اسد کی نوکری لگ گئی ہے۔“

اماں کی دوسری بات پر خواجہ صاحب چونک کر بولے تھے۔
”اچھا؟“

”مجھے تو میاں! یقین نہیں آ رہا۔ اس موئے کو کون نوکری دے گا۔۔۔۔۔! الف، ب بھی نہیں جانتا۔“
اماں نالاں لگ رہی تھیں۔

”ہاں!۔۔۔۔۔! آج کل تو ایم اے پاس جوتیاں گھس رہے ہیں۔“
خواجہ صاحب کا انداز مایوسی لئے ہوئے تھا۔

”پھر؟“

”پھر کیا کر سکتا ہوں میں۔۔۔۔۔!“

”کیا مطلب؟“

اماں کو ہول اُٹھنے لگے۔

”آپ کچھ نہیں کریں گے؟ بتول بیگم کے جھوٹ کا یقین کر کے بیاہ دیں گے ثانیہ کو اس ٹکے کے

باتھ۔۔۔۔۔!“

”اوہو بیگم!۔۔۔۔۔!“

خواجہ صاحب جھنجھلا گئے۔

”تم سنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہو کہ بتول بیگم جھوٹ کہہ گئی ہیں۔۔۔۔۔! ہو سکتا ہے اسد کی کام سے

اقبلی لگ گیا ہو۔۔۔۔۔!“

”یہ ہو سکتا ہے، وہ ہو سکتا ہے، میں نہیں مانتی میاں!۔۔۔۔۔! آپ پوری چھان بین کریں، کسی دفتر میں کیا لگا

ہے۔۔۔۔۔!“

اماں نے کہا۔

”میں جانتا ہوں، کیا لگا ہوگا۔۔۔۔۔! تم جا کر ثانیہ سے پوچھو، وہ رابعہ پر قربان ہونے کو تیار ہو جائے تو

ٹھیک، ورنہ پھر رابعہ کو واپس بلا لو۔“

خواجہ صاحب یہ کہہ کر اُٹھ کر چلے گئے۔ اماں سکتے کی حالت میں کتنی دیر ان کے پیچھے دیکھتی رہیں۔ ان کے دل پروزی بی بوجھ آن گرا تھا۔

”ثانیہ!۔۔۔۔۔!“

انہوں نے گھبرا کر ثانیہ کو پکارا، پھر خود ہی اُٹھ کر اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

”رابعہ چلی گئی ہے اماں!۔۔۔۔۔! تو کمرے کی سا خالی خالی لگ رہا ہے۔“

ثانیہ اس وقت جو محسوس کر رہی تھی، وہی کہہ دیا، تو اماں نے چونک کر اسے دیکھا، پھر بیٹھے ہوئے ”ہاں“

کو لبہ کھینچ کر بولیں۔

”ہاں!۔۔۔۔۔! پر بیٹا!۔۔۔۔۔! لڑکیاں اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں۔“

”ابا آگئے؟ کھانا لگا دوں۔۔۔۔۔!“

ثانیہ نے پوچھا۔

”نہیں!۔۔۔۔۔! تمہارے ابا ابھی باہر نکلے ہیں۔ تم بیٹھو!۔۔۔۔۔! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

اماں اچانک کچھ سوچ کر بولیں تو ثانیہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

”جی اماں! کہئے۔۔۔۔۔!“

”بیٹا!۔۔۔۔۔! میری بات قتل سے سننا، اور دیکھو!۔۔۔۔۔! ماننے اور نہ ماننے کا تمہیں پورا اختیار ہے۔ دل

چاہے ماننا، ورنہ صاف منع کر دیتا۔“

اماں کی تمہید پر وہ اُلجھ گئی۔

”آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں اماں!۔۔۔۔۔! پہلے بات تو بتائیں!۔۔۔۔۔!“

”بات.....؟“

اماں نظر میں چرا کر بولیں۔

”بات وہی رابعہ کے دیواری ہے۔ ہم اگر اس کے رشتے سے انکار کرتے ہیں تو.....“

”تو کیا.....؟ رابعہ وہ پھر گھر سے نکال دیں گے؟“

وہ چیخ کر بولی تھی۔ اماں کوشش سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھ سکیں۔

”تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا..... تمہارے لئے دانیال کا رشتہ بھی موجود ہے، لیکن تم سوچ لو.....!“

تمہارے ابا نے فیصلہ تم پر چھوڑا ہے۔“

”مم..... میں کیا فیصلہ کروں گی؟.....؟“

اس کے اندر کڑواہٹ گل گئی۔

”نہیں اماں.....! مجھ پر اتنی بھاری ذمہ داری نہ ڈالیں۔ آپ کا اور ابا کا جودل چاہے کریں۔“

”ہم کیا کریں بیٹا.....؟ ہم رابعہ کی وجہ سے مجبور ہیں۔ چند دن یہاں رہی تو دیکھا نہیں تھا کیسے بچ کے

لے تڑپتی تھی؟“

”پھر اماں.....! آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں.....؟ جب آپ رابعہ کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں

تو.....“

”میں تمہیں بھی روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔“

اماں فوراً بولی تھیں۔ وہ ایک دم خاموش ہوئی، پھر کہنے لگی۔

”تو آپ ایسا کریں اماں.....! میرا گلا کھنٹ دیں یا زہر دے دیں مجھے۔ روز روز مرنے سے بہتر ہے،

ایک ہی بار مر جاؤں گی۔“

”ثانیہ.....؟“

اماں نے اسے سمجھ کر گلے لگا لیا۔

”میں کیا کروں بیٹا.....! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

اس کے آنسو بے اختیار چھلک گئے تھے۔

پھر کتنے دن گزر گئے۔ اماں کی پریشانی کم نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ ثانیہ نے بالکل چپ سادہ لی تھی اور

ادھر دانیال کی بھابی دو تین چکر لگا چکی تھی۔ آخر اماں کو اسے بتانا پڑا کہ ثانیہ کے لئے ان کی بڑی بیٹی رابعہ کے سسرال

سے بھی رشتہ آیا ہوا ہے، اور کیونکہ بیٹی کی سسرال کا معاملہ ہے، اس لئے وہ طریقے سے ہی انہیں جواب دینے کے بعد

دانیال کا سوچیں گے۔

یعنی اماں نے دانیال کے لئے منع نہیں کیا تھا، کیونکہ ایک تو اسد کے لئے کسی طرح ان کا دل نہیں مان رہا

تھا، دوسرے شاید وہ کسی معجزے کے انتظار میں تھیں کہ یہ بلا خود ہی ٹل جائے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تو وہ پھر ثانیہ سے پوچھنے لگیں۔

”بیٹا.....! پھر کیا سوچا تم نے.....؟ دانیال کی بھابھ بھی چکر لگا رہی ہیں۔ میں کب تک ان کے سامنے

باتیں بناتی رہوں گی.....؟ تم جواب دو تو میں.....“

”میرے پاس جواب نہیں ہے اماں.....! جب آپ اور ابا بے بس ہو گئے ہیں تو میں کیا کر سکتی

ہوں.....؟“

ثانیہ کے ناراض اور زوٹھے انداز پر اماں اسے دیکھ گئیں۔

”آپ ایسا کریں اماں.....! صرف ایک بیٹی کو سوچیں، صرف رابعہ کو یا صرف مجھے۔ پھر شاید آپ کے

لئے فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔“

اماں ابھی بھی کچھ نہیں بولیں۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اماں.....! ایک بیٹی کی طرف سے تو آپ کو دل پر پتھر کھنا ہی ہوگا۔“

اس نے پھر زور دے کر کہا تو اماں نے تنگ آ کر نوک دیا۔

”بس.....! چپ ہو جاؤ.....! میں نے تم سے جواب مانگا ہے، مشورے نہیں مانگے۔“

وہ سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی تو اماں نرم پڑ کر کہنے لگیں۔

”دیکھو بیٹا.....! ہم ماں باپ ہیں، ہمارے لئے دونوں بیٹیاں برابر ہیں۔ کسی ایک کی طرف سے دل پر

پتھر نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے تمہارے ابا نے فیصلہ تم پر چھوڑا ہے۔ تم صرف اپنا سوچو، رابعہ کا مت سوچو۔“

اماں کی آخری بات پر وہ ایک دم انہیں دیکھنے لگی۔

”یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تمہیں کوئی الزام نہیں دے گا۔“

اماں نے نظریں چرا کر کہا تو وہ دکھ سے بولی۔

”کوئی الزام دے یا نہ دے، خود اپنی نظروں میں تو مجرم ٹھہروں گی۔ نہیں اماں.....! مجھے معاف کر

دیں۔ میں مجرمانہ احساس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ آپ اور ابا جو مناسب سمجھیں، کریں۔ میں وعدہ کرتی

ہوں، کبھی آپ کو، ابا کو الزام نہیں دوں گی۔“

وہ اپنی بات ختم کرتے ہی تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اماں سر پکڑ کر رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

وہ گھر آیا تو سیما اکیلی اداس، گم سم بیٹھی تھی۔ وہ قدرے ٹھنکا، پھر ایک دم زوردار آواز میں سلام کیا تو سیما

چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے بھابی؟ آپ یوں اکیلی اداس بیٹھی ہیں، کوئی ٹریبیڈی فلم دیکھ لی ہے کیا؟“
اس نے فوراً ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔
”نہیں.....!“

سیمائی زبان سے زیادہ سر ہلاتھا۔
”پھر کیا بات ہے؟“
وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”کچھ نہیں.....! تم جاؤ، چنچ کر دو.....! میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔“
سیمائی کہہ کر اٹھنے لگی کہ اس نے صوفے کے بازو پر ہاتھ رکھ کر راستہ روک لیا۔
”کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی، پہلے میری بات کا جواب دیں۔ بھیا نے کچھ کہا ہے کیا؟ بچوں
نے تنگ کیا ہے یا کوئی اور بات ہے؟“

سیمائی یوں دیکھنے لگی جیسے بتائے نہیں؟
”ادو بھابی.....! اب بتا بھی دیں۔“
اس نے ٹوکا، تب وہ رک کر بولی۔

”وہ.....! دانیال.....! خواجہ صاحب کی طرف سے انکار ہو گیا ہے۔“
”کیا.....؟“

اسے ایک دم دھچکا لگا تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بھابی؟ کک..... کیوں انکار کیا ہے انہوں نے؟“
”وہ.....! اصل میں ثانیہ کے لئے اور بھی پرنسپل آئے ہوئے تھے۔ پھر ظاہر ہے، خواجہ صاحب کو جہاں
مناسب لگے گا، وہیں ثانیہ کی شادی کریں گے۔“

سیمائیوں بول رہی تھی جیسے اسے بہت زیادہ دکھ ہو۔
”آپ سے انہوں نے کیا کہا؟“

”یہی بتایا ان کی بیگم نے کہ ثانیہ کے لئے ان کی بڑی بیٹی کی سسرال سے رشتہ آیا ہوا ہے۔“
سیمائی پہلے سے سب سوچے بیٹھ تھی۔

”لیکن بھابی.....! ابھی کل ہی تو میری ثانیہ سے بات ہوئی تھی، اس نے تو کسی اور پرنسپل کا نہیں
بتایا.....؟“

وہ سیمائی کو جھٹلا نہیں رہا تھا، لیکن اسے یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔
”ہو سکتا ہے ثانیہ کے علم میں نہ ہو۔“

سیمائی ٹھنکی تھی، پھر فوراً بات بدل گئی۔

”میں جانتی ہوں، ثانیہ تمہاری محبت ہے، اور محبت چھن جانے کا دکھ سہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن
.....! ہال.....! تم خدا کے لئے، خود کو سنبھالو۔ میں تمہیں ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔“
وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تو سیمائی پریشان ہو گئی۔
”کہاں جا رہے ہو دانیال.....؟ میں پھر جاؤں گی، خواجہ صاحب کے ہاں، ان کی باتیں کرنی پڑیں تو وہ
میری لڑی لگی۔“

”نہیں بھابی.....! آپ نہیں جائیں گی۔“

وہ سختی سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ منزل
تاریب آتے آتے اچانک ڈور کیسے ہو گئی تھی.....؟ کتنی مریوہ بس ٹھٹھکتا رہا، کیونکہ ذہن بری طرح تنگ رہا تھا۔ پھر سیمائی
اس کے لئے چائے لے کر آ گئی تو وہ رک کر بولا۔

”آپ نے کیوں زحمت کی بھابی.....؟ مجھے پکار لیتیں۔“

”پکارا تھا، لیکن تم اپنے آپ میں بھی نہیں ہو۔“

سیمائی چائے کا کپ اسے تھمایا، پھر کہنے لگی۔

”مجھے تو پہلے ہی دن خواجہ صاحب اور ان کی بیگم کا ردیہ ٹھٹھکا تھا، اور شاید میں نے تمہیں بتایا بھی تھا۔
.....! ان کی مرضی.....! اب تم اپنے دل کو مت لگا لو۔“

وہ سیمائی کو دیکھ کر رہ گیا۔

”تمہارے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے دانیال.....! میں نے صبح تمہارے بھیا سے بات کی تھی۔ کل ہی
ہاں گی عذرا کے ہاں۔ اس کی بھانجیاں بڑی خوب صورت ہیں۔“

سیمائی اس کا دھیان بنانے کی غرض سے کہا، لیکن وہ سختی سے بولا تھا۔

”نہیں بھابی.....! ابھی آپ کہیں نہیں جائیں گی۔“

”کیوں.....؟ ابھی سے جانا شروع کروں گی، تب ہی تو کہیں جا کر بات بنے گی۔“

سیمائی نے رعب سے کہا تو وہ عاجزی سے بولا۔

”بھابی.....! پلیز، اس ٹاپک کو بھول جائیں۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔“

”ارے.....! تو میں کون سا ابھی کے ابھی تمہاری شادی کر رہی ہوں.....؟ میں تو تمہارا دھیان بنارہی
.....! میں نے تمہیں بچوں کی طرح پالا ہے دانیال.....! تم اگر پریشان، اداس ہو گے تو میں کیا آرام سے
.....! میں نے تمہیں بچوں کی طرح پالا ہے دانیال.....! تم اگر پریشان، اداس ہو گے تو میں کیا آرام سے

سیمائی نے کہا، پھر ایک دم جذباتی ہو گئی۔

”میں نے تمہیں بچوں کی طرح پالا ہے دانیال.....! تم اگر پریشان، اداس ہو گے تو میں کیا آرام سے

بیٹھ سکوں گی؟ نہیں دانیال..... تمہارا ڈکھیر اڈکھ ہے۔“

”میں جانتا ہوں بھابی..... لیکن میں کیا کروں؟ میں نے ثانیہ کے علاوہ کبھی کسی کو نہیں سوچا۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا، مر جاؤں گا۔“

وہ کچھ ٹوٹ رہا تھا۔

”اللہ نہ کرے.....! میں تمہارے دشمن۔ خبردار جو پھر کبھی ایسی بات منہ سے نکالی تو۔“

سیسے نظر ہر دہل کر اسے ٹوکا، تو وہ نادام ہو کر بولا۔

”آئی ایم سوری بھابی.....!“

”ہاں نہیں تو، جان ہی نکال دی تھی تم نے میری۔ چلو.....! نیچے چلو.....! کیلے بیٹھو گے تو ایسے ہی فضول سوچتے رہو گے۔“

”نہیں سوچوں گا، بلکہ اب میں سوؤں گا۔“

اس نے کہا، لیکن سیما بے غصہ تھی کہ اسے اکیلا نہیں چھوڑے گی۔ بڑی مشکل سے وہ اسے بھیج رکھا۔ پھر کہہ بند کر کے اس نے خواجہ صاحب کے گھر کا نمبر ڈال کیا اور خلاف توقع ثانیہ کی آواز سن کر اس نے بہت غجٹ میں اس سے اگلے دن ملنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ کیونکہ وہ فون پر اس سے باز پرس نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کہیں درمیان میں ہی وہ کسی خوف سے فون رکھ دیتی، اور بات اذھوری رہ جاتی۔ اس لئے اس نے ملنے کا کہا تھا۔

اور اسے یقین تو نہیں تھا کہ وہ آئے گی، پھر بھی اگلے دن وہ مقررہ وقت سے بہت پہلے مکملڈ پہنچ گیا تھا تو پھر وقت چھپے پھر گیا تھا۔ گلاس وال پر نظریں جمائے حقیقتاً اس کی آنکھیں پتھرائی گئی تھیں، جب ہی وہ دروازے سے داخل ہوتی نظر بھی نہیں آئی۔

”السلام علیکم.....!“

ثنانیہ نے قریب آ کر سلام کیا تو وہ ایک دم سر اودنچا کر کے اسے دیکھنے لگا۔

”کیوں مشکل میں ڈالتے ہیں مجھے.....؟“

وہ بیٹھتی ہی رونے لگی تو وہ مزید پریشان ہو گیا۔

”یہ..... تم کیا کہہ رہی ہو.....؟ رو کیوں رہی ہو.....؟ بتاؤ ثانیہ.....! کیا میری بھابی نے جو کہا ہے، وہ

سچ ہے.....؟“

”کک..... کیا کہا ہے آپ کی بھابی نے.....؟“

وہ رونا بھول گئی۔

”بہن کی تمہارے لئے تمہاری بڑی بہن کے سسرال سے پر پوزل آیا ہے.....؟“

وہ بتانے سے زیادہ پوچھ رہا تھا اور اس کے سر جھکانے پر بالکل ڈھس گیا۔ جب ثانیہ نے اس پر ساری

”تو حال واضح کر دی، اور جب یہ بتایا کہ اس پر ماں باپ کی طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے تو اسے غصہ آ گیا

”جب تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے تو پھر تم کیوں رو رہی ہو.....؟ اور فیصلہ کرنے میں کیوں ہچکچا رہی

؟ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے.....؟“

وہ خائف ہو کر اسے دیکھنے لگی تو غصہ پا کر بولا۔

”دیکھو.....! جو تم سوچ رہی ہو، ویسا کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری بہن کے سسرال والے صرف دھمکیاں دے

تلتے ہیں، اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

”آپ نہیں جانتے دانیال.....! وہ پہلے بھی رابعہ کو گھر سے نکال چکے ہیں۔“

ثنانیہ نے بتایا تو فوراً بولا۔

”اچھا.....! تو اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ بعد میں اپنی ایسی اچھی حرکتوں سے باز آ جائیں گے.....؟

میلو ثانیہ.....! میں یہ نہیں کہتا کہ تم اپنی بہن کا مت سوچو، لیکن اس طرح نہیں کہ خود کو قربان کر دو.....؟ اس سے کچھ

مائل نہیں ہوگا، بلکہ تمہاری بہن کے سسرال والے اور شیر ہو جائیں گے۔“

”پھر میں کیا کروں.....؟“

وہ بے بسی سے بولی تھی۔

”اب یہ بھی میں بتاؤں.....؟ بے وقوف لڑکی.....! منزل تمہارے سامنے موجود ہے اور تم ادھر ادھر

مٹل رہی ہو.....؟ ابھی جا کر اپنی اماں سے کہو کہ تم شادی کرو گی تو صرف دانیال حسن کے ساتھ۔ بس.....! اتنی سی

بات ہے۔“

وہ شاید خود ریلیکس ہو گیا تھا، جب ہی اتنے آرام سے بولا تھا۔

”اتنی سی بات سے رابعہ کی زندگی میں جو طوفان آئے گا.....“

وہ مزید خائف ہو گئی تھی۔

”کوئی طوفان نہیں آئے گا۔ میں کہہ رہا ہوں ناں.....! کچھ نہیں ہوگا۔“

وہ اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہنے لگا۔

”کوئی شخص اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ اپنے نکلے، آوارہ بھائی کی خاطر اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دے۔

تم اپنے دل سے یہ خوف نکال دو۔“

”لیکن.....“

وہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”بس.....! اب اس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔ کرنی ہے تو کوئی اچھی بات کرو۔ پتا ہے، میں کل پوری

رات ایک پل کے لئے بھی نہیں سو پایا۔

”تو میں کب سوئی ہوں؟“

اس کے رونگھے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ اسے اس شخص کی بات نہیں سننی چاہئے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، ماضی کا حصہ بن چکا ہے اور اسے دُہرائی کی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ اس خیال نے بھی دامن پکڑا کہ اگر جہانزیب کو کسی بات کی خبر ہوگئی تو اس کی ازدواجی زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک تو وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی جو انجانے میں اسے اپنا سب کچھ مان بیٹھا تھا، دوسرے وہ اسے یہ بھی پوچھنا چاہتی تھی کہ آخر اس نے اس کے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا؟ جب ہی دماغ کی مسلسل سرزنش کے باوجود وہ من مانی کر گئی۔

”جہانزیب کا فون ہوگا۔“

فون کی پہلی بیل پڑی وہ یہ کہتی ہوئی لابی کی طرف بھاگی۔ پیچھے سے بنگی نے پکار کر پتا نہیں کیا کہا، وہ سننے کے لئے رُک نہیں، جلدی سے آکر ریسیدور اٹھالیا۔

”ہیلو.....!“

”جانیہ.....!“

اس کی آواز سننے کے بعد ہی اس نے پکارا۔

”ہاں.....! میں جانیہ ہوں، تم کون ہو.....؟“

”جہانزیب.....!“

وہ اطمینان سے بولا۔

”نہیں.....! تم جہانزیب نہیں ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ، کون ہو تم؟“

”خفامت ہو جانیہ.....! یہی سب بتانے کے لئے میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔“

وہ لہجہ بھر زک کر بولا۔

”سنو.....! کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو.....؟“

”نہیں.....!“

اس کا لہجہ آپ ہی آپ سخت ہو گیا۔

”پلیز جانیہ.....! انکار مت کرو۔ بس ایک بار مجھ سے مل لو۔ میں تمہیں ہر بات صاف صاف بتانا چاہتا

ہوں۔“

وہ منت سے بولا۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہیں جو کہنا ہے، ابھی کہو۔“

”تم مجھے غلط تو نہیں سمجھو گی ناں.....؟“

”ان باتوں کو چھوڑو اور اصل بات کرو.....!“

”اصل بات.....؟“

اس کا لہجہ سوچنا ہوا سا تھا، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

”یہ کہانی وہیں سے شروع ہوئی تھی جانیہ.....! جب تم نے مجھ سے جہانزیب کے بارے میں پوچھا تھا اور میں نے محض شرارت کہا تھا کہ میں ہی جہانزیب ہوں۔ میرا خیال تھا تم میری بات کا برامانے ہوئے مجھے برا بھلا کہو گی، لیکن اس کے برعکس جب تم نے مجھے جہانزیب تسلیم کر لیا تو جہاں مجھے حیرت ہوئی، وہاں میں یہ بھی جان گیا کہ تم اس شخص سے صرف نام کی حد تک واقف ہو، پھر جس طرح تمہاری آنکھیں لمحہ بھر کو چمکیں اور تم گھبرا کر پلٹ گئیں تو اہین کرو، اس وقت مجھے اپنے آپ پر افسوس ہوا کہ میں جہانزیب کیوں نہیں ہوں.....؟ اور وہ.....“

”میں یہ ساری باتیں نہیں سننا چاہتی۔“

وہ ٹوک کر بولی۔

”میرا مقصد ان باتوں کو دُہرائنا نہیں ہے، بلکہ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم اوّل روز ہی سے میرے دل میں مگر گرتی تھیں اور اس کے بعد میں کوشش کے باوجود تمہارے خیال سے دامن نہیں بچا سکا۔ اس لئے جب تم ۱۱ مارچ مجھے ملیں تو میں نے قصداً اپنے آپ کو تم سے چھپایا، کیونکہ مجھے یہ خدشہ تھا کہ جب تمہیں معلوم ہوگا کہ میں جہانزیب نہیں ہوں تو تم مجھ سے دُور چلی جاؤ گی اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔“

”جانتے ہو جہانزیب کون ہے.....؟“

”ہاں.....! اس عرصے میں تمہاری باتوں سے میں بہت ساری باتیں از خود سمجھ گیا تھا۔ وہ تمہارا منگیترا تھا اور غالباً اب شوہر ہے۔“

اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

”مجھے غلط مت سمجھو جانیہ.....! میرا مقصد تمہیں دھوکہ دینا ہرگز نہیں تھا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور وہی محبت ہر غرض سے مبرا ہے۔ اوّل روز، میں جان گیا تھا کہ تم میری نہیں ہو سکتیں، پھر بھی میں تمہیں چاہتا رہا۔

اب اسے ساتھ گزارا ہر پل میرے لئے.....

”بس کرو.....!“

اس کی آنکھیں بے اختیار چمک گئیں، اور جب بولی تو آنسوؤں کی نمی آواز اور لمحے میں اُتر آئی تھی۔

”میں نے سوچا تھا، لیکن.....“

اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ محسوس کر کے اس نے گھبرا کر ریسوررکھ دیا اور جلدی جلدی ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”کیا ہوا جانیہ.....؟“

چٹکی اسے روتے دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگی۔

”جہانزیب بھائی ٹھیک تو ہیں ناں.....؟“

”ہاں..... انہیں.....!“

”کیا مطلب، ہاں.....؟ نہیں.....؟“

”میرا مطلب ہے، جہانزیب کا فون نہیں تھا۔“

وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”پھر.....؟“

”وہ..... صائمہ تھی۔“

فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی نام آیا۔

”صائمہ.....؟ اچھا، ہاں..... کیا ہوا ہے اسے.....؟“

”بس..... وہ..... وہ.....“

وہ گڑبڑا گئی، سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے.....؟

”اس بیچاری کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ رہتا ہی ہے۔“

”یہ بتاؤ، امی کیا کر رہی ہیں.....؟“

”کچن میں ہیں۔“

”کتنی بری بات ہے کہ وہ بیچاری اکیلی لگی ہوئی ہیں۔ چلو، وہیں چلتے ہیں۔“

اور محض اس خیال سے کہ چٹکی، صائمہ کے بارے میں مزید سوال نہ کرنے لگے، وہ جلدی سے کچن کی طرف جانے لگی کہ سامنے سے چھوٹے بھیا آ گئے۔

”ارے جانیہ.....! میں آج بڑی شدت سے تمہیں یاد کر رہا تھا۔“

”اچھا.....!“

چھوٹے بھیا کے منہ سے ایسی بات سن کر وہ خوش ہو گئی۔

”کس وقت سے آئی ہو.....؟“

”صبح آفس جاتے ہوئے جہانزیب چھوڑ گئے تھے۔“

”اچھا اچھا، آؤ، میرے کمرے میں آؤ.....!“

”جی.....؟“

وہ حیران ہو کر چٹکی کی طرف دیکھنے لگی تو وہ جلدی سے بولی۔

”تم بھیا کے پاس بیٹھو، میں امی کے پاس جا رہی ہوں۔“

اس نے چٹکی کو بھاگ کر جاتے دیکھا، پھر چھوٹے بھیا کے ساتھ ان کے کمرے میں آ گئی۔

”بیٹھو.....!“

انہوں نے کہا اور جیسے ہی وہ بیٹھی، بغیر کسی تمہید کے کہنے لگے۔

”جانیہ.....! تم امی ابو کو سمجھاؤ۔ وہ شاید تمہاری بات مان جائیں۔“

”کیا بات.....؟“

وہ بالکل نہیں سمجھی اور سمجھنے کے لئے پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”مجھے جاپان جانے کے لئے پیسہ چاہئے اور میں ابوجی سے کہہ رہا ہوں کہ یہ مکان بیچ دیں۔“

”کیا.....؟“

روکتے روکتے بھی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، جس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چھوٹے بھیا اپنی کہے۔

”کے۔“

”ابو اور امی دونوں میں سے کوئی میری بات سننے تک کوتاہی نہیں، جبکہ میں یہ یقین دلارہا ہوں کہ ایک

مال میں ہی ایسے دو مکان خرید دوں گا۔“

”کیسے.....؟“

”میں وہاں سے کما کر بھیجوں گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بھیا.....! لیکن آپ وہاں جا کر کریں گے کیا.....؟ میرا مطلب ہے، نہ تو آپ کے

اں اتنی تعلیم ہے اور نہ کوئی ہنر۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اگر وہاں کسی فیکٹری میں مزدوری بھی کروں گا، تب بھی اتنے پیسے

میں کے جو یہاں ایک سال میں نہیں کما سکتا۔“

وہ اتنے جوش سے بولے کہ وہ بمشکل خود کو تاسف کا اظہار کرنے سے باز رکھ سکی۔

”ابوجی مجھ پر اعتبار نہیں کر رہے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں یا تو پیسے اڑا دوں گا، یا یوں ہی دھکے کھا

ا، اہں آ جاؤں گا۔ حالانکہ نوکری کی گارنٹی کے ساتھ ویزہ مل رہا ہے اور تم کسی طرح امی ابو کو یہ بات سمجھاؤ۔“

”میں کوشش کروں گی۔“

اسے کہنا پڑا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر اس کے برعکس اس نے کچھ کہا تو چھوٹے بھیا بھی اس کے منہ پر

کہہ دیں گے کہ وہ بھی نہیں چاہتی کہ وہ کسی قابل ہوں۔

”تم آج ہی ابوسے بات کرنا۔ دیکھو، اگر یہ جانس مس ہو گیا تو.....“

وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی اور یوں ہی سر ہلاتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی۔ امی اور چکی بچن سے فارغ ہو کر کمرے میں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ چکی اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

”کیا کہہ رہے تھے چھوٹے بھیا.....؟“

”کوئی نئی بات نہیں تھی۔“

وہ گہری سانس لے کر امی کے پاس بیٹھی تو ان سے کہنے لگی۔

”آخر چھوٹے بھیا ایسے کیوں ہیں.....؟ انہیں ذرا بھی کسی بات کا احساس نہیں ہے۔ بس..... ایک جاپان جانے کی دھن سوار ہے۔“

”مکان بیچنے کو کہہ رہے ہوں گے.....؟“

چکی نے تلخ و طرا آمیز مہنہ کے درمیان کہا تو وہ قدر بیزاری سے بولی۔

”وہ ایسی ہی باتیں کر سکتے ہیں۔ خیر چھوڑو.....! اور اگر کھانا تیار ہو گیا ہے تو دسترخوان لگا دو، مجھے بھوک لگی ہے اور نیند بھی آرہی ہے۔“

”کھانا ضرور کھاؤ، لیکن میں تمہیں سونے نہیں دوں گی۔“

چکی اٹھتے ہوئے بولی۔

”کیوں.....؟“

”میں بور ہوں گی۔“

”اچھا جاؤ، پہلے کھانا کالو.....!“

امی کے ٹوکے پر چکی جلی جاتی تو اس نے اٹھ کر الماری سے دسترخوان نکالا اور وہیں بچھا دیا۔ اس کے بعد جا کر چھوٹے بھیا کو بلائی۔

پھر کھانا کھاتے ہی وہ لیٹ گئی۔ اسے دوپہر میں سونے کی عادت تھی اور اس وقت اس نے سوچا، جب تک امی نماز سے فارغ ہوں اور چکی برتن وغیرہ دھو کر آئے، تب تک وہ ایک نیند لے لے، لیکن جیسے ہی تنہائی ملی، اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ کچھ دیر پہلے ٹیلی فون پر ہونے والی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔

”تم اول روز ہی سے میرے دل میں گھر کر گئی تھی، اور پھر میں نے قصداً اپنے آپ کو تم سے چھپایا۔“

”جہانزیب.....!“

اس نے دل ہی دل میں اسے پکارا۔ پھر الجھ کر بولی۔

”وہ جہانزیب نہیں ہے، بہر حال جو بھی ہے، اس نے اچھا نہیں کیا۔ اگر وہ مجھے بتا دیتا تو شاید میں.....“

”میرا خیال تھا، تم سو گئی ہوگی۔“

چکی اسے جاگتے دیکھ کر بولی تو وہ سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کیا تم میری وجہ سے جاگ رہی ہو.....؟“

”ہاں.....! میں نے سوچا، کہیں تم مجھے نیند میں سے نہ اٹھا دو، اس لئے میں سوئی ہی نہیں۔“

”نہیں خیر.....! میں ایسا تو نہ کرتی۔“

چکی ہنستی ہوئی اس کے برابر آ لی۔

☆.....☆.....☆

رابعہ اپنی ماس اور دیویری سرگرمیاں دیکھ رہی تھی۔ وہ باقاعدہ محاذ بنا چکے تھے اور عباد بھی اس کی سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ماں کے کہنے میں اپنا گھرا جاڑنے پر ٹٹلا ہوا تھا۔ بچے کا بھی نہیں سوچ رہا تھا۔

اس وقت بچن میں کھڑی پیاز کاٹتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ وہ ایسا کیا کرے کہ اس کی ماس ٹانیہ کا خیال چھوڑ دیں.....؟ لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

”بھابی.....!“

اچانک اس کی آمد پر وہ جلدی سے آنسو پونچھ کر چھری تیز چلانے لگی۔

”اوہو.....! یہاں تو جل تھل کا سماں ہے۔“

اس نے اسے آنسو پونچھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”کیا چاہتے تھیں.....؟“

اس نے جتنے جیسے لمحے میں پوچھا، وہ اسی قدر لہک کر بولا۔

”تمہارا پیار.....! میرا مطلب ہے، کبھی تو پیار سے بات کر لیا کرو۔ ہر وقت انگارے چبانا اچھا نہیں

ہوتا۔“

”دیکھو ساند.....! میرے پاس فالتو باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ تمہیں جو چاہئے، جلدی بتاؤ.....!“

وہ چھری پھینک کر اسے دیکھنے لگی۔

”جتنی جلدی بتاؤں گا، اتنی جلدی دے دوگی.....؟“

اس کی ڈھٹائی کی حد نہیں تھی۔

”جاؤ.....! مجھے کام کرنے دو۔“

وہ پھر چھری اٹھانے لگی تھی کہ اس نے اس سے پہلے ہی جھپٹ لی۔

”لاؤ.....! میں تمہاری مدد کروں۔ تم اپنی آنکھوں پر ظلم نہ کرو۔“

پھر اسے دیکھ کر بولا۔

”اسی لئے کہتا ہوں، جلدی اپنی بہن کو لے آؤ یہاں، تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کھانا پکانا آتا ہے ناں

ٹائیہ کو.....؟“

”سب آتا ہے۔“

وہ دانت پیستی ہوئی پکن سے نکل آئی۔ پھر پہلے شوبی کو کمرے میں دیکھا تو وہ سکون سے سو رہا تھا۔ اس کے بعد عباد کے پاس آ بیٹھی اور اس کے ہاتھ سے ٹی وی کا ریوٹ لیتے ہوئے بولی۔

”عباد! میری بات سنیں.....!“

”سناؤ.....!“

ہمیشہ کا اکڑ عباد اس وقت جانے کس موڈ میں تھا کہ بڑے آرام سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”وہ..... عباد.....!“

وہ اس کی شکایت کرنے بیٹھی تھی، لیکن اچانک ایک خیال کے تحت غصہ دبا کر کہنے لگی۔

”وہ..... میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں خود یہی چاہتی ہوں کہ اس گھر میں کسی اور لڑکی کی بجائے میری اپنی

بہن آ جائے۔“

”پھر.....؟“

”پھر یہ کہ آپ اس کو بھی تو سمجھائیں ناں.....! میرا مطلب ہے، شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جاتی

ہیں، اور اس کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہے۔“

اس نے کہا تو عباد نے نیازی سے بولا تھا۔

”نہیں ہے احساس تو ہو جائے گا، جب سر پر پڑتی ہے تو خود ہی عقل ٹھکانے آ جاتی ہے۔“

”ایسا نہیں ہے عباد.....!“

وہ جھنجھلا کر بولی۔

”آپ کو ابھی اس کو سمجھانا پڑے گا، بلکہ یہی وقت ہے۔ آپ اس سے کہیں، اگر شادی کرنا چاہتے ہو تو

پہلے کچھ کم کر لاؤ۔ ابھی وہ شادی کے شوق میں کچھ کر بھی لے گا، بعد میں تو وہ آپ کی بات سننے کا بھی نہیں۔“

عباد کے چہرے کا تناؤ ڈھیل پڑ گیا تھا اور وہ اپنی بات کا اثر ہوتے دیکھ کر مزید گویا ہوئی۔

”دیکھیں.....! میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ اس کے بھٹکے کی ہی بات کر رہی ہوں۔ پھر آپ یہ بھی

دیکھیں، ابھی سارے گھر کی ذمہ داری آپ پر ہے، اگر اس کو احساس نہ دلایا گیا تو اس کے بال بچوں کی ضرورتیں بھی

آپ کو پوری کرنی پڑیں گی۔ کر سکیں گے آپ.....؟“

”میں کہاں سے کروں گا.....؟“

عباد فوراً بولا تھا۔

”جی لئے میں.....“

وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم نہ صرف خاموش ہوئی، بلکہ خائف بھی ہو گئی تھی۔ پردے کے اس طرف بتول

بیگم کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ ان کی جھلک دیکھ کر ہی وہ خاموش ہوئی تھی، اور وہ کوئی غلط بات تو نہیں کر رہی

تھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ بتول بیگم اس کی بات کو غلط رنگ ہی دیں گی، اور یہی ہوا۔ بتول بیگم نے اس پر کچھ جتنا تا تو

نہیں، لیکن جب وہ ان کے لئے کھانا لے کر گئی تو بڑے آرام سے بولی تھیں۔

”میں سوچ رہی ہوں بہو.....! کل تمہارے میکے کا چکر لگا آؤں۔“

”جی.....؟“

اس کا ”جی“ بے معنی تھا۔

”تم بھی چلی چلنا، ٹائیہ کے جوڑے کا ناپ بھی لے لینا۔ تمہیں پتا ہے آج کل درزیوں کے کتنے خزانے

ہیں۔“

بتول بیگم بظاہر کھانے کی طرف متوجہ تھیں۔

”جی امی.....! لیکن ابھی سے.....؟“

وہ حقیقتاً چکر اگتی تھی۔

”میرا مطلب ہے، پہلے شادی کے معاملات تو طے کر لیں۔ پتا نہیں ابا کا ارادہ کیا ہے.....؟“

”ارے.....! میں بیٹے کی ماں ہوں۔“

بتول بیگم ایک دم اوقات پر آ گئیں۔ سینے پر ہاتھ مار کر زور سے بولیں۔

”جو میں طے کروں گی، وہی ہوگا، اور مجھے اگلے مہینے اس کی شادی کرنی ہے، سمجھی.....؟“

”جی.....!“

وہ اس قدر کہہ کر جانے لگی کہ بتول بیگم پکا کر بولیں۔

”اور سنو.....! میکے کا کر زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی نوکری کا تم سے ضرور

پوچھیں گے، تمہارے اماں ابا۔ کیا کہو گی.....؟“

”وہی جو آپ نے کہا ہے۔“

وہ ضبط سے بولی تھی۔

”ہاں.....! اور یہ تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے.....؟ دیور کی شادی کی خوشی نہیں ہے کیا تمہیں.....؟“

ارے.....! بھاد جوں کو تو بڑا ارمان ہوتا ہے، دیوروں کی شادی کا، اور تمہارا تو ایک اگلو تا دیور ہے۔ اس کی خوشی

برداشت نہیں ہو رہی تم سے.....؟“

بتول بیگم اس کے لئے لینے سے باز نہیں آئیں۔
”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ میں بھلا کیوں خوش نہیں ہوں گی؟ میرے لئے تو ڈبل خوشی ہے۔ ادھر دیو رتو ادھر بہن!“

روکتے روکتے بھی اس کے ہونٹوں سے سکی نکل گئی تو وہ تیزی سے پلٹی تھی۔

☆ ☆ ☆

سیما بہت خوش ہو کر حنا کو اپنا کارنامہ بتا رہی تھی۔

”میں نے دانیال سے یہی کہا ہے کہ خواجہ صاحب نے اس کا پوپزل ریجیکٹ کر دیا ہے۔ اس سے دانیال بہت ڈس ہارٹ ہوا ہے۔ یعنی دل ٹوٹ گیا ہے بیچارے کا۔“

”تو اب مجھے اس بیچارے کے ٹوٹے دل کو دوبارہ جوڑنا ہے؟“
حنانے محفوظ ہو کر کہا۔

”ہاں!“

سیما بڑبڑاتی تھی۔

”بس! آپ فکر ہی نہ کریں آپا! یہ کام میں ابھی سے شروع کر دیتی ہوں۔“

حنانہ کہتے ہوئے دانیال کے کمرے میں جانے کے ارادے سے اٹھی تھی کہ سیما اس کا ہاتھ کھینچ کر بولی۔
”بیٹھو آرام سے، ابھی وہ گھر پر نہیں ہے۔“

”کہاں گیا ہے؟“

”ہاتھ نہیں! بیٹھا کسی دیرانے میں محبت کے اجڑنے کا ماتم کر رہا ہوگا۔“

سیما نے نخوت سے کہا تو حنا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ہائے آپا! مجھے تو اس پر ترس آ رہا ہے۔“

”ہا ہا ہا!“

سیما ہنسی، پھر کہنے لگی۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے حنا! ترس کھاؤ، اس پر ہمدردی جتاؤ، زیادہ سے زیادہ اس کے قریب رہو

تا کہ اسے تمہارا احساس ہو۔“

”ہوں!“

حننا جانے کیا سوچنے لگی۔

”سنو! میں ایسا کرتی ہوں، کچھ دنوں کے لئے بیمار پڑ کر بسترِ سنہال لیتی ہوں۔“

سیما نے کہا تو حنا کھجکھج کر اچھل پڑی۔

”یہ ٹھیک ہے آپا! آپ بسترِ سنہالیں، پھر میں اس کی ایسی سیوا کروں گی کہ وہ دُعا کرے گا، بھابی بھی بستر سے نہ اٹھیں۔“

”ہائیں؟“

سیما سے گھورنے لگی تو حنا ہنسنے ہوئے بولی۔

”مذاق کر رہی ہوں۔“

”بس! تم مذاق ہی کرتی رہنا۔ میں ہی پاگل ہوں جو تمہارے لئے اتنے پاؤ پتیل رہی ہوں؟“

”اوہو آپا! اب بندہ مذاق بھی نہ کرے؟ اچھا ٹھیک ہے! اب میں کچھ نہیں بولوں گی۔“

حنانے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی تو سیما سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جا کہاں رہی ہیں؟“

حنانے فوراً پوچھا۔

”لینے جا رہی ہوں۔ ابھی آجائیں گے تمہارے ڈیہا بھائی اور دانیال بھی۔ یہی بتانا انہیں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

سیما سے سمجھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس وقت خواجہ صاحب آفس سے نکل کر گھر جانے کے لئے بس اسٹاپ پر کھڑے تھے کہ اچانک شور کی آواز پر ادھر متوجہ ہوتے ہی سائے میں آگئے تھے۔ اسد دو تین لڑکوں کے ساتھ جھگڑ رہا تھا۔ اس کی زبان انتہائی غلیظ

گالیاں اُگل رہی تھی۔ پھر وہ ہاتھ پائی پر اُتر آیا تو خواجہ صاحب سے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ بس چھوڑ،

رکشہ میں بیٹھ گئے تھے اور پھر گھر میں داخل ہوتے ہی پکارنے لگے۔

”بیگم! بیگم!“

”الہی خیر!“

اماں کے پیچھے تانیہ بھی گھبرا کر کمرے سے نکلی تھی۔

”کیا ہوا مائیں!؟ سب خیریت تو ہے ناں؟“

”خیریت ہی ہے۔ تم ابھی دانیال کے ہاں فون کر کے کہہ دو کہ شادی کی تاریخ طے کر جائیں۔“

اتنے دنوں سے ڈاواں ڈول خواجہ صاحب نے اچانک فیصلہ کر لیا تھا۔

”ہائیں؟“

اماں حیران ہوئیں اور ثانیہ بے قابو ہوتے دل سے گھبرا کر وہیں سے واپس پلٹ گئی تھی۔
 ”تم کھڑی رہو، میں خود ہی.....“

خواب صاحب شاید خود خائف تھے کہ کہیں مجبوری آئے نہ آجائے۔ اس لئے خود ہی بڑھ کر فون اٹھالیا تھا۔ اتفاق سے دوسری طرف دانیال کے بڑے بھائی کمال حسن نے ان کا فون ریسیو کیا تھا۔ خواب صاحب نے دانیال کے رشتے کی ہا می بھر کر انہیں اسی وقت آ کر شادی کی تاریخ طے کرنے کو کہا تو وہ خوشی سے تیار ہو گئے، جس سے خواب صاحب اچانک ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ پھر جیران کھڑی بیگم کو دیکھ کر بولے۔

”تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو.....؟ جاؤ چائے پانی کا انتظام کرو۔ وہ لوگ آرہے ہیں۔“
 ”لیکن میاں.....! یوں آنا فانا.....“

”اللہ کو یہی منظور ہے۔ جاؤ جلدی کرو۔ میں مٹھائی وغیرہ لے کر آتا ہوں۔“

خواجہ صاحب اماں کو اسی طرح حیران چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

اور تقریباً گھنٹے بھر بعد ہی کمال حسن، سیما کے ساتھ موجود تھے۔ سیما اندر سے کتنی ہی حیران پریشان تھی، لیکن خود کو خوش ظاہر کر رہی تھی۔ اماں نے مٹھائی کی پلیٹ اس کے سامنے کی تو دو گلاب جاسن اٹھ کر بولی۔

”بھئی.....! بہت مبارک ہو آپ کو.....! اس دن تو میں بالکل مایوس ہو گئی تھی۔“

”بس.....! خواجہ صاحب کے فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

اماں نے کہا تو کمال حسن، خولجہ صاحب سے کہنے لگے۔

”آپ کے اچانک فیصلے نے ہمیں خوش کر دیا اور ایک بڑی ٹینشن سے بچا لیا۔“

خواجہ صاحب نا سمجھنے کے انداز میں دیکھنے لگے۔

”جی!.....! ہماری بیگم نے باقاعدہ بستر سنبھال لیا تھا۔ اصل میں یہ جب مایوس ہوتی ہیں تو پھر بہت دنوں تک ہمیں ان کی سیوا کرنی پڑتی ہے۔“

کمال حسن نے وضاحت کی۔ وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

”بس بھی کریں، آپ کو تو موقع چاہئے۔“

”تو ایسا موقع بار بار کہاں ملتا ہے.....؟“

کمال حسن حقیقتاً بہت خوش تھے۔

’ارے ہاں.....! آپ کی بڑی بیٹی نظر نہیں آرہی.....؟‘

یسا کواچا نک رابعہ کی غیر موجودگی کھٹکی تھی۔ اماں اندر سے پریشان ہو گئیں۔

’ہاں.....! وہ..... اصل میں اس کے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لئے آ نہیں سکی۔‘

”اچھا.....! ویسے یہ خوشی کا موقع بار بار تو نہیں آئے گا۔ ایک ہی بہن ہے اس کی۔“

سیا جتانے سے باز نہیں آئی۔ اماں بوکھلا کر خوابہ صاحب کو دیکھنے لگیں تو کمال حسنِ چوہیشن نہ سمجھ کر بھی ٹھٹھکڑے ہوئے۔

”اچھا خوبہ صاحب.....! اجازت دیجئے.....! اب تو انشاء اللہ آنا جا رہے گا۔“

”جی ہاں.....! کیوں نہیں.....؟ آپ کا اپنا گھر ہے، جب چاہے آئیں۔“

خوابہ صاحب خوش دلی سے بولے۔ پھر انہیں رخصت کر کے اپنے کمرے میں آئے تو بیگم کو فکر مند ہی سے سوچتے دیکھ کر ٹھک گئے۔

”اب کیا ہوا ہے.....؟“

”اب مجھے رابعہ کی فکر ستا رہی ہے میاں.....!“

اماں نے کہا تو وہ قدرے جھلا کر بولے۔

”خواہ مخواہ جی مت جلاؤ بیگم.....! جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“

”اللہ نہ کرے جو کچھ برا ہو۔“

اماں فوراً بولی تھیں۔

”ہاں..... بس یہی دُعا کرو.....!“

”رابعہ آئی بھی تو نہیں، جو پتا چلتا اس کی ساس کیا سوچے بیٹھی ہیں.....؟“

اماں کسی طرح خود کو رابعہ کی فکر سے آزاد نہیں کر پا رہی تھیں۔

”اب وہ جو بھی سوچیں۔“

خواجہ صاحب کے اطمینان پر اماں انہیں دیکھنے لگیں۔

”میاں.....! آپ نے تو لگتا ہے خود کو ہر بات کے لئے تیار کر لیا ہے.....؟“

”کیا چاہتی ہو تم.....؟“

خواہ صاحب بگڑ گئے۔

”دو گھڑی سکھ کا سانس بھی نہ لوں.....؟ ابھی سے کل کی فکر میں کیوں گھل رہی ہو.....؟ جو گھڑی سکھ کی

میر آئی ہے، اسے غنیمت جانو.....! خود بھی سواور مجھے بھی سونے دو۔“

اماں ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ اندر سے بہت ڈسٹرب تھی، پھر بھی بظاہر اپنے آپ کو بہت

سنہالے رکھتی تھی۔ زیادہ تر مصروف رہنے کی کوشش کرتی۔ صبح بجا اور جہانزیب آفس چلے جاتے، پھر اس کا دیور جہانگیر اگر اسے کہیں انٹرویو کے لئے جانا ہوتا تو کچھ دیر بعد وہ بھی چلا جاتا اور نہ سارا دن گھر میں رہ کر شام میں نیوش وغیرہ کے لئے نکلتا تھا۔ ویسے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ کیونکہ وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہتا تھا۔

البتہ اماں جن کے ساتھ اس کا سارا وقت گزرتا تھا، ان کا الگ مزاج و انداز تھا۔ کسی دن بہت مہربان اور کسی دن اچانک یوں اس کے خلاف ہو جاتیں جیسے رات میں تہیر کر کے سوئی ہوں کہ آج اسے صرف تنگ کرنا ہے۔ ابتداء کیونکہ ناشتے کی ٹیبل پر ہی ہو جاتی تھی، اس لئے جہانزیب آفس جانے سے پہلے اسے سمجھا دیتے کہ آج اماں کا موڈ ٹھیک نہیں ہے، تم خیال مت کرنا، وہ جو بھی کہیں چپ چاپ سن لینا۔

اور وہ ایسا ہی کرتی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ شام تک وہ آپ ہی آپ ٹھیک ہو جاتیں۔ ایک طرح سے اس گھر میں اسے کسی خاص مسئلے کا سامنا نہیں تھا۔ وہ بڑے آرام و سکون سے رہ سکتی تھی اور رہنا چاہتی تھی، لیکن دل میں جو ایک خلش سی تھی، وہ ہمہ وقت بے چین رکھتی۔ اکثر اپنے آپ سے اُٹھنے اور لڑنے لگتی کہ اس نے کیوں جہانزیب کو دیکھنے کی غلطی کی تھی؟ اور پھر دھوکہ کھایا، اور کمال تو اس شخص کا تھا جو اسے تو اسے، خود اپنے آپ کو بھی دھوکہ دیتا رہا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کسی اور کی امانت ہے، اس سے محبت کرتا رہا۔

☆ ☆ ☆

سیما کی ساری پلاننگ ناکام ہو گئی تھی۔ وہ بے حد تلملائی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کا کیا کیسے پلٹ گئی؟ دانیال کے سامنے تو وہ خوشی کا اظہار کرنے پر مجبور تھی، لیکن حنا کے سامنے معذور۔ کیونکہ حنا کو وہی اُکساتی رہی تھی، جب ہی اب دانیال کی بات سنی ہوئے کان کر دیتے تھے سے اُکھڑ گئی تھی۔

”میں یہ سب نہیں جانتی آپا! آخر یہ سب کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ مجھے بتائیں! میں اب کیا کروں؟ میرے سینے میں آگ لگی ہے اور یہ تب ہی بجھے گی، جب دانیال میرا ہوگا۔“

”اس کے لئے تو تمہیں بہت انتظار کرنا پڑے گا۔“

سیما جانے کیا سوچ کر بولی تھی۔

”مکروں گی، قیامت تک انتظار کر سکتی ہوں۔“

حنانے کہا تو سیما شٹا گئی۔

”پاگل مت ہونا۔! دانیال میں کوئی سرخاب کے پڑ نہیں لگے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا؟ آپ نے ہی تو مجھے دانیال کے خواب دکھائے، اور جب میری آنکھیں ان خوابوں کی عادی ہو گئیں تو آپ چاہتی ہیں میں اپنی آنکھیں پھوڑا دوں؟ نہیں۔! یہ کسی صورت ممکن نہیں ہو سکتا۔“

حنان کی ضد پر سیما پریشان ہو گئی۔

”پھر اب میں کیا کروں؟ یہاں تو آنا فنا سارے معاملات طے ہو گئے ہیں، شادی؟“

”اور طلاق۔!“

حنان فوراً بولی تھی۔

”طلاق۔!“

ایک لمحہ کو سیما کا دل کا نچا تھا۔ پھر حنا کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

اور اس رات سیما دیر تک اسی بیچ پر سوچتے ہوئے سوئی تھی۔ پھر صبح کمال حسن کو چائے دے کر وہ سیدھی دانیال کے کمرے میں آئی اور اسے اُٹھے دیکھ کر حیرت سے بولی۔

”ارے۔! آج تو نوشہ میاں جلدی اُٹھ گئے۔؟“

پھر کھڑکی سے پردے کھینچتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ابھی اُٹھے ہو یا خوشی کے مارے رات بھر سوئے ہی نہیں۔؟“

”آپ کو تو موقع چاہئے۔!“

دانیال جھینپ کر بولا تھا۔

”ہاں۔! تو ایسے موقعے بار بار تھوڑی آتے ہیں۔ پھر اب یہ چند دن تو ہیں، شادی کے بعد تو تم نظر ہی نہیں آؤ گے۔“

”کیوں؟ میں کہیں جا رہا ہوں کیا۔؟“

دانیال نے قہقہہ اُجھڑا کر ہنسا۔

”کیا پتا، چلے جاؤ۔؟“

سیما اسے آزماتی تھی۔

”آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں بھابی۔؟“

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور کچھ ناراض بھی، تو سیما اندر سے مطمئن ہو کر ٹوکتے ہوئے کہنے لگی۔

”بس۔! اب اموشل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وقت کم ہے اور میں اس وقت تمہیں یہ

تاناے آئی ہوں کہ میں آج سے شاپنگ شروع کر رہی ہوں۔ تم ساتھ چلو گے یا میں اپنی پسند سے لے لوں سب

ملہ۔؟ میرا مطلب ہے، کہیں بعد میں تمہیں اعتراض نہ ہو کہ میں کیسے کھراٹھالائی ہوں۔؟“

”ارے نہیں بھابی۔! مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔ ہاں۔! اگر ممکن ہو تو ثانیہ کو ساتھ لے

ہاں۔“

ثانیہ نے ٹال کر پوچھا۔

”ہاں.....! تمہارے جانے کے بعد ہی چلی گئی تھی۔ میں بھی ابھی آ رہی ہوں۔“

اماں نے بتایا تو وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”اچھا.....! کیسی ہے رابعہ.....؟ آپ اسے اپنے ساتھ ہی لے آئیں ناں.....؟“

”ہاں.....! گئی تو میں بھی اسی ارادے سے تھی کہ رابعہ کو ساتھ لے آؤں گی، لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟ اس کی ساس نے نہیں آنے دیا ہوگا.....؟“

ثانیہ نے بے مبری سے اماں کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”نہیں.....! اس کی ساس سے تو ملاقات بھی نہیں ہو سکی۔ کہیں گئی ہوئی تھیں۔“

اماں اس کے سوالوں سے تنک پڑنے لگیں۔

”پھر آپ نے رابعہ سے کب آنے کو کہا ہے.....؟“

”آجائے گی، جب اس کا میاں اور ساس اجازت دیں گی تو آجائے گی۔“

اماں نے جھنجھلا کر کہا تو وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی، پھر پکار کر پوچھنے لگی۔

”اماں.....! رابعہ ابابا کے فیصلے سے خوش تھی.....؟“

”ہاں.....! وہ تو خوش تھی، لیکن اس کے سرال والے جب سنیں گے تو شاید وہ خوش نہیں ہوں گے۔“

”ان کے خوش نہ ہونے سے ہمیں کیا.....؟“

وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی، اور اماں بیچ منہ ہار میں آن کھڑی ہوئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ سیمہ اور حنا کے ساتھ جا کر بہت پیچھتائی تھی۔ کیونکہ آگے سیمانے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی اور ہر چیز حنا کی پسند سے خریدتے ہوئے اس پر جتنا ہی رہی تھی کہ دانیال اور حنا کی پسند ایک ہے۔ جانے اس کا کیا مقصد تھا.....؟ وہ بہر حال ہرٹ ہوئی تھی، اور اس رات دانیال کا فون آیا تو اس کا دل چاہا اس سے حنا کے بارے میں پوچھے، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اب کچھ ہی دنوں کی بات ہے، اس نے دل کو سمجھالیا اور اس سے بولی تھی۔

”اب آپ کو فون نہیں کرنا چاہئے۔“

”کیوں.....؟ اب ایسی کیا بات ہو گئی ہے.....؟“

دانیال نے شوخی سے پوچھا تو وہ نروس ہو گئی۔

”مجھے نہیں پتا.....!“

”کیا کروں.....؟ مجھے یہ چند دن گزارنا بہت مشکل لگ رہے ہیں۔ دل چاہتا ہے، آنکھیں بند کروں،

میر کھولوں تو تم سانسے ہو۔“

دانیال نے اپنی کیفیت بتائی تو وہ ذرا سی ہنسی کے ساتھ پوچھنے لگی۔

”اچھا.....! اور کیا دل چاہتا ہے.....؟“

”بیٹا دوں.....؟ فون بند تو نہیں کرو گی۔“

اس نے کہا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”میں ابھی بند کر رہی ہوں۔“

یہ بے ایمانی ہے، جب حال دل سننا نہیں تھا تو پوچھا کیوں تھا.....؟“

”غلطی ہو گئی۔“

”غلطی کی سزا تو ملے گی۔“

دانیال اس کی گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے معظوظ ہو رہا تھا۔

”کیا سزا دیں گے.....؟“

”آنکھیں بند کرو.....!“

اس نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔

”اب تم آنکھیں کھولو گی تو مجھے اپنے سانسے دیکھو گی، بالکل پاس.....!“

اس کے لہجے کی گھمبیر تاسے گھبرا کر اس نے فوراً آنکھیں کھولیں اور پھر ایک دم فون رکھ دیا تھا۔ اس کا

دل بڑی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اور پھر یہ چند دن پڑ لگا کر اڑ گئے۔ خولید صاحب نے رابعہ کی مجبوری سمجھتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کر لیا اور بیٹی داماد کو بھی بلاوا نہیں دیا، اور ثانیہ کو زرخشت کر دیا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ چاند چڑھتا ہے، تو دنیا دیکھتی ہے، تو یہاں آوارہ گرد اسد نے اپنے چاند کو زرخشت ہوتے دیکھ کر گھر جا کر ماں اور بھائی کو ایسا بھڑکایا کہ عین اس وقت جب خولید صاحب ثانیہ کو زرخشت کر کے سکون کا سانس لے رہے تھے، رابعہ شوخی کو سینے سے لگائے سانسے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا آجڑا روپ دیکھ کر اماں تو دل تمام کر رہ گئیں، لیکن خولید صاحب جیسے خود کو ہر بات کے لئے تیار کر چکے تھے، جب ہی بہت ضبط سے پوچھنے لگے۔

”انہوں نے واپسی کا راستہ چھوڑا ہے کہ نہیں.....؟“

”نہیں.....!“

رابعہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ اسے چپ کراتے کراتے اماں بھی رونے لگی تھیں۔ خولید صاحب سر ہموک کر بیٹھ گئے تھے۔ کتنی دیر بعد ان کے کانوں میں اماں کی آواز آئی تھی جو رابعہ کے آنسو پوچھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”مت خود کو پکان کر بیٹا! یہ روٹا تو اب عمر بھر کا ہے۔“
”نہیں!“

خواجه صاحب ایک دم سروا نچا کر کے غصے سے بولے تھے۔
”یہ عمر بھر کا روٹا نہیں ہے بیگم! بلکہ عمر بھر رونے سے نجات مل گئی ہے اے۔“
”ابا...؟“

رابعہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹا! یوں سمجھو، تمہاری سزا ختم ہو گئی۔ اب یہ رونے کا نہیں، شکر کا مقام ہے۔
روئیں گے وہ جنہوں نے تمہاری قدر نہیں کی۔“

”ارے...! انہیں تو اللہ ایسی سزا دے گا کہ دنیا عبرت پڑے گی۔“
اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالیں؟

”بس بیٹا! تم صبر کرو۔ تمہارے لئے زندگی ختم نہیں ہو گئی۔ ہمت سے کام لو۔ تمہارے بچے کو
تمہاری ضرورت ہے۔“

خواجه صاحب رابعہ کا سر تھپکتے ہوئے بولے تھے۔

”ابا...! میں نے بہت کوشش کی، شوہر اور ساس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“
رابعہ کی ہلکی بندھ گئی تھی۔

”میں جانتا ہوں بیٹا! اور تمہیں میں الزام تو نہیں دے رہا۔ الزام تو میں قسمت کو بھی نہیں دے سکتا۔
کیونکہ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ اس میں بھی کوئی بہتری ہوگی۔“

خواجه صاحب کی آواز بھرانے لگی تھی، تب اماں سے بولے۔

”جاؤ...! بیٹی کو کھانا دانا کھلاؤ...!“

”ہاں...! اٹھو رابعہ! منہ ہاتھ دھولو۔ میں کھانا لاتا ہوں۔“

اماں زبردستی رابعہ کو اٹھا کر لے گئیں۔ خواجه صاحب کی نظریں شوبی پر جا بھری تھیں۔

☆ ☆ ☆

”سارا وقت اماں کے ساتھ رہ کر تم بالکل ان ہی کی طرح ہوتی جا رہی ہو۔“

اس روز جہانزیب ہلکے ہلکے انداز میں اسے چھیڑتے ہوئے بولے۔

”کیسے؟“

وہ پوچھنے لگی۔

”مہربان ہو تو بہت مہربان، پھر اچانک اجنبی سی بن جاتی ہو، جیسے اماں کرتی ہیں۔“
وہ ہنس پڑی۔

”ظاہر ہے، جس کے ساتھ زیادہ رہو گی، اسی کا زیادہ اثر قبول کروں گی ناں...!“
”تو ایسا کرو، اماں کا مہربانی والا اثر ضرور قبول کرو، لیکن...“

”میرا خیال ہے، کبھی کبھی اجنبی بن جانا چاہئے۔“

”کیوں...؟“

انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا اور وہ جانے کہاں کھو گئی، پھر اسی طرح کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔
”اچھا لگتا ہے، ایک ہی انداز سے گزرتی زندگی میں ہلچل سی مچ جاتی ہے، کچھ وا ہے، کچھ خدشے
اچانک دل کی طرف لپک کر دھڑکنوں کو“ اب کیا ہوگا...؟“ کاراگ الا اپنے پر مجبور کرنے لگتے ہیں۔“

”ہاں...!“

وہ اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر بولے۔

”لیکن میں پل بھر کے لئے بھی کسی وا ہے میں نہیں گھبرا جاتا۔“

”اچھا...!“

اس نے یوں ہی پلکیں جھپکیں کہ تصور ٹوٹ گیا۔ گھبرا کر اپنے اطراف میں دیکھا اور پریشان ہو گئی کہ بتا

نہیں انجانے میں کیا کہہ گئی ہے...؟

”کیا بات ہے...؟“

وہ کیونکہ اسی پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، اس لئے اس کی بدلتی ہوئی کیفیت نظر انداز نہیں کر سکے۔

”سک... کچھ نہیں...!“

”تم پریشان کیوں ہو گئیں...؟“

”شاید اماں نے آواز دی ہے۔“

وہ بات بدلتے ہوئے بولی اور پھر سننے کی کوشش کرنے لگی۔

”اماں نے تو آواز نہیں دی، البتہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ جاؤ دیکھو کون ہے...؟ اور اگر میرا فون

ہو تو منع کر دینا۔“

وہ جلدی سے اٹھ کر آگئی اور ریسیور کان سے لگاتے ہی جو آواز سنا توں سے ٹکرائی، اس سے وہ چلا کر

رہ گئی۔ بے شکل تمام خود کو سنبھالا اور آواز دیا کر بولی۔

”تمہیں یہاں کا نمبر کیسے معلوم ہوا...؟“

”ارے...! جانیہ...؟“

وہ پہلے حیران ہوا، پھر فوراً کہنے لگا۔

”نمبر معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے؟“

”لیکن تمہیں یہاں فون نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”میں سمجھتا ہوں جانیہ! لیکن میں کیا کروں؟“ دل کی بے قراری چہین نہیں لینے دیتی۔ تم پلیز! ایک بار مجھ سے مل لو۔“

”نہیں! یہ ممکن نہیں ہے، اور سنو! آئندہ کبھی مجھے فون مت کرنا۔“

”اتنی سنگ دل مت بنو۔ میں تمہارے بغیر۔“

اس نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا، پھر پہلے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کیا، اس کے بعد ریسپورڈر کے کچن میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

جملہ عروسی میں سر جھکائے جھکائے اس کی گردن میں درد ہونے لگا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ پہلے سیما اسے یہاں بٹھا کر یہ کہتے ہوئے گئی تھی کہ وہ دانیال کو بھیجتی ہے، اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ کچلی نظروں سے وہ یہ کتنی بار سارے کمرے کا جائزہ لے چکی تھی اور اب تو اسے ہر شے یاد ہو چکی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے بتا سکتی تھی، کیا چیز کہاں رکھی ہے؟

”زندگی کا پہلا سبق!۔۔۔۔۔!“

وہ سوچتے ہوئے بے ساختہ ہنسی تھی، جب ہی دروازے پر آہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے فوراً اپنی پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی۔ پھر آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

”اب تم آنکھیں کھولو گی تو مجھے اپنے سامنے دیکھو گی، بالکل پاس!۔۔۔۔۔!“

دانیال نے اس کے کان کے قریب سر گھٹی میں اپنی بات دہرائی تو وہ مزید سٹ گئی۔

”جینک یو ٹائیہ!۔۔۔۔۔!“

دانیال اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

”تم نے میری بات مان لی!۔۔۔۔۔!“

”کون سی بات؟“

وہ بے ساختہ پوچھ گئی۔

”ارے! اتنی جلدی بھول گئیں؟ کیا تم میری بات مان کر یہاں تک نہیں پہنچیں؟“

دانیال نے ذرا سانس کر کہا، لیکن وہ ابھی بھی نہیں سمجھی۔

”اوہو بھئی!۔۔۔۔۔! میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ گھر جا کر کہہ دو کہ تم شادی کرو گی تو صرف دانیال حسن سے؟“

دانیال نے خول ہی یاد دلا یا تو اس کے ہونٹ خود بخود مسکراہٹ کے انداز میں سکڑ گئے۔

”مجھے اچھا لگا، تم نے میرے لئے اسٹینڈ لیا۔“

دانیال نے خوشی کا اظہار کیا تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اگر وہ ایسا سمجھ رہا تھا تو اسے یہی سمجھنا چاہئے۔ اور نہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ بانی اچانک اس کے حق میں کیسے فیصلہ سنا دیا تھا۔؟

”خیر!۔۔۔۔۔! اب تم میری ہو۔ میری زندگی کی ساتھی!۔۔۔۔۔!“

وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

”اور میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ماں باپ کے بعد میرے لئے سب سے محترم میرے بھائی اور بھابی ہیں۔ میں ان کی بے حد عزت کرتا ہوں اور تم سے بھی میں یہی چاہوں گا۔“

”میری طرف سے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

اس نے کہا تو وہ اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر بولا تھا۔

”مڈلڈ!۔۔۔۔۔!“

پھر صبح اس سے پہلے کہ سیما اس کے کمرے میں آتی، وہ دانیال کے کہنے پر ہی اس کے ساتھ ڈائننگ روم میں آگئی۔ سیما ناشتہ لگا رہی تھی۔ ان دونوں نے سلام کیا تو پہلے حیرت سے دیکھا، پھر ایک دم سنبھل کر مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”خوش رہو!۔۔۔۔۔! آبا درو!۔۔۔۔۔! میں ابھی تم دونوں کو بلانے کے لئے آ رہی تھی۔“

”بس!۔۔۔۔۔! اب آپ کی پریذیمت ہوئی بھابی!۔۔۔۔۔!“

دانیال نے یہ کہتے ہوئے جانیہ کے لئے چیئر کھینچی، جب ہی کمال حسن آگئے اور ان دونوں کو دیکھ کر

بولے۔

”ماشاء اللہ!۔۔۔۔۔!“

”السلام علیکم!۔۔۔۔۔!“

جانیہ نے انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!۔۔۔۔۔! بیٹھو بیٹا!۔۔۔۔۔!“

وہ کہتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئے۔

”ارے بھائی! یہ سب آپ نے بنایا ہے؟“

دانیال ناشتے کے لوازمات دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگا۔

”کیا بات کرتے ہو دانی؟ اپنی پوری زندگی میں کبھی تمہیں ناشتے میں پراٹھا ملا ہے؟“
کمال حسن نے کہا تو میرا اندر ہی اندر تلملا کر بولی۔

”نہیں دانیال! یہ سب تمہارے سرال سے آیا ہے۔ خواجہ صاحب دے گئے ہیں۔“

”ارے! تو آپ نے خواجہ صاحب کو روکا نہیں کیا؟“

وہ ایک نظر ثانیہ پر ڈال کر بولا تھا۔

”بہت روکا تھا بھی! یہ بھی کہا کہ ہمارے ساتھ ناشتہ کر لیں، لیکن انہیں جانے کس بات کی جلدی

تھی؟ خیر! تم لوگ ناشتے کے بعد جا کر مل آنا ان سے۔ لوٹنا ٹانیہ! باتیں تو ہوتی رہیں گی، تم ناشتہ شروع کرو۔“

سیرا نے یہ کہتے ہوئے ڈش اٹھا کر ٹانیہ کے سامنے رکھی پھر جیسے اچانک یاد آنے پر پوچھنے لگی۔

”ہاں ٹانیہ! رات شادی میں تمہاری بہن نظر نہیں آئی؟“

وہ ہرگز بھی اس بات کے لئے تیار نہیں تھی، جب ہی پریشان ہو گئی۔

”ارے بھائی! آپ نے نہیں دیکھا رابعہ کو؟“

دانیال نے اس کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ موجود تو تھی۔

”اچھا! آئی تھی کیا؟“

سیرا مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”لیجئے! اس کے بغیر شادی ہو سکتی تھی بھلا؟“

دانیال نے اسے مشکل سے نکال لیا تھا۔ وہ ممنونیت کے احساس میں گھر کر بجلی نظروں سے اسے دیکھتی

رہی تھی۔

پھر ناشتے کے بعد ہی دانیال اسے اس کے سینکے لے آیا تو گوکہ اماں ابان دونوں کو دیکھ کر خوش ہو گئے

تھے، پھر بھی ان کے چہروں پر فکر مند کی وہ محسوس کر رہی تھی۔ دانیال، ابا کے ساتھ باتیں کرنے لگا اور وہ اشارے سے

اماں سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا ہوا ہے؟ تب ہی اندر سے شوہن کے رونے کی آواز سن کر وہ چونک کر بولی۔

”اماں! رابعہ؟“

”ہاں! رابعہ اندر ہے، جاؤ ملو!“

اماں نے کن اکھیں سے دانیال کو دیکھ کر کہا تو وہ فوراً اٹھ کر اندر آ گئی۔

”رابعہ!“

اس کے انداز میں بے قراری تھی۔

”ارے ٹانیہ!“

رابعہ نے اسے گلے لگا لیا، پھر اس کا چہرہ دیکھ کر بولی۔

”ماشاء اللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔“

”تم؟ اس وقت؟“

اس نے رابعہ کی بات جیسے ہی نہیں۔

”میرا مطلب ہے، شادی میں تو تم نہیں آئیں؟“

”ہاں! بس، ہم بیٹھوٹاں! دانیال بھی آیا ہے؟“

رابعہ اسے دیکھ کر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”ہاں! وہ ابا کے ساتھ بیٹھے ہیں۔“

”چلو! پھر تم بھی ادھر ہی جاؤ! دانیال کی نظریں تمہیں تلاش کر رہی ہوں گی۔“

رابعہ نے لہجے میں شوہن سموتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم اس کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگی۔

”رابعہ! سب ٹھیک تو ہے ناں؟“

”ہاں ہاں! سب ٹھیک ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو؟“

رابعہ کی ڈھی مسکراہٹ نے اسے مزید پریشان کر دیا۔

”کیونکہ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ بتاؤ رابعہ! تمہیں میری قسم! بتاؤ! کیا ہوا ہے؟“

رابعہ کی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ کچھ بول نہیں پائی تو کارزمیل کی دراز سے ایک

پتھر نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے تاجی کے عالم میں پیپہ کو، پھر رابعہ کو دیکھا۔ رابعہ آنسو پونچھتے ہوئے

زرخ موڑ گئی تو اس نے جلدی سے پیپہ کھول کر دیکھا تو جیسے آسمان سر پر آن گرا تھا۔

”طلاق؟“

”ہاں! شاید ہمارے ماں باپ کی قسمت میں ہی نہیں تھا کہ وہ دونوں بیٹیوں کو ایک ساتھ آباد

دیکھیں۔“

رابعہ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹ رہی تھی، اور وہ سناٹے میں کھڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

دانیال محسوس کر رہا تھا کہ سینکے سے آکر وہ چپ چپ ہے۔ صبح الوہی خوشی نے اس کے چہرے کو جو

تابناکی بخشی تھی، اس کا نشان تک باقی نہیں تھا۔ آنکھوں سے فکر آمیز ادا سی چمک رہی تھی۔ کتنی دیر وہ انتظار کرتا رہا کہ

کوئی بات ہوگی تو وہ خود ہی بتائے گی، لیکن وہ اس کی باتوں کا جواب بھی ”ہوں، ہاں“ میں دے رہی تھی۔ آخر اسے

خود ہی پوچھنا پڑا۔ محبت سے اس کے کندھے تھام کر بولا تھا۔

”کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟ خوشی کے ان لمحات میں تمہاری آنکھوں کی قدیلیں ماند کیوں پڑ گئی ہیں؟ کوئی سانحہ ہوا ہے یا ایک ہی رات میں، میں تم سے بہت دور ہو گیا ہوں؟“

”نہیں دانیال!“

وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”ٹانیہ! ٹانیہ! پلیز!“

وہ پریشان ہو گیا۔

”ٹانیہ! میں بہت پریشان ہو رہا ہوں۔ پلیز! اس طرح مت رو۔“

”مہم! مجھے معاف کر دیں دانیال! میں نے آپ کو پریشان کیا۔“

وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔

”کیا میں تم سے رونے کا سبب ہو چکا ہوں؟“

اس نے کہا تو وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی۔ پھر زکے ہوئے بولی تھی۔

”راہبہ کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہے۔“

”واٹ؟“

دانیال واقعی شاکدہ ہوا تھا۔

”میں نے کہا تھا ناں! وہ لوگ بہت ظالم ہیں۔“

اس کے آنسو پھر چھلک گئے۔

”پھر بھی تم رو رہی ہو؟ یعنی راہبہ ساری زندگی ان کے ظلم سہتی رہتی، جب ٹھیک تھا؟ نہیں

ٹانیہ! یہ اچھا ہوا ہے کہ جلدی اس کی جان چھوٹ گئی۔“

وہ خود پر قابو پا کر اسے سمجھانے لگا۔

”میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ تم خود سوچو! راہبہ کی طرف سے تمہارے ماں باپ ہر وقت فکر مند

رہتے تھے یا نہیں؟“

”لیکن دانیال! لوگ جو باتیں بتائیں گے، اس سے اماں ابا کو تکلیف نہیں ہو گی کیا؟“

”یہ اس تکلیف سے کم ہو گی جو راہبہ کو سسرال کے مظالم سہتے دیکھ کر انہیں ہو رہی تھی۔ پھر یہ چند دن کی

تکلیف ہے۔ بہت جلد لوگوں کو اور موضوع مل جائے گا، سبھی؟“

اس نے ٹانیہ کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی، پھر اس کے زخماں پر ٹھہرا آنسو اپنی انگلی کی پور پر رکھ کر اسے

دکھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اُس کی قیمت جانتی ہو؟“

وہ ایک نظر اس کی انگلی پر چپکتے قطرے پر ڈال کر پھر اسے دیکھنے لگی۔

”میری جان سے بڑھ کر ہے۔“

اس نے مسکرا کر اس کا آنسو اپنے ہونٹوں سے چھوا، پھر اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر بولا۔

”بہت بری ہوتی! سارا دن ایسے ہی پریشان ہوتی رہیں؟“

”آئی ایم سوری!“

وہ دھیرے سے بولی تھی۔

”چلو! اب سو جاؤ! تاکہ تمہارے تھکے ہوئے دماغ کو آرام ملے۔“

اس نے یہ کہتے ہوئے نگہ سیدھا کیا تو وہ بے بسی سے بولی۔

”مجھے نیند نہیں آنے گی دانیال! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”وہ تو ہو گا ہی، میں چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لاتا ہوں۔“

وہ زبردستی اسے لٹا کر کمرے سے نکل آیا۔ آگے سیما کچن سے نکل کر آ رہی تھی، اسے دیکھ کر تعجب سے

پوچھنے لگی۔

”تم ابھی تک سوئے نہیں؟ بارہ بج رہے ہیں۔“

”جی! وہ بس۔“

وہ یہی کہہ سکا۔

”کیا بس؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟ سچ بتاؤ! تمہارے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔“

سیما ایک کائیاں تھی، اور وہ اسے اپنا سب سے بڑا اہم دروازہ خیر خواہ سمجھتا تھا۔

”اصل میں بھابی! ٹانیہ مینٹلی بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں اس کے

لے چائے بنانے آیا تھا۔“

”ارے! تو مجھ سے کہو! میں بنا دیتی ہوں چائے، لیکن ٹانیہ! میرا مطلب ہے، وہ کیوں

ڈسٹرب ہے؟ ایسی کیا بات ہو گئی؟“

سیما نے لگاؤٹ کا اظہار کر کے پوچھا۔

”وہی بتانے آیا ہوں آپ کو۔“

اس نے کہا تو سیما فوراً بولی۔

”ہاں ہاں! بولو!“

”وہ! بھابی! آپ نے بتایا تھا ناں کہ ٹانیہ کے لئے راہبہ کی سسرال سے پر پوزل آیا تھا؟“

”ہاں ہاں! پھر؟“

سیما کی بے صبری وہ محسوس ہی نہیں کر سکا۔

”پھر بس.....! وہ لوگ دھاندلی کر رہے تھے کہ اگر ان کے بیٹے کا پر پزل رنجیکٹ ہو، تو وہ رابعہ کو طلاق دے دیں گے، اور انہوں نے طلاق دے دی ہے۔“

وہ بے حد افسوس سے بتا رہا تھا۔

”ارے.....! یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟ کیا جج.....؟“

سیما نے پریشانی ظاہر کی۔

”جی.....! اسی لئے ثانید ڈسٹرب ہے۔ آپ پلیز.....! اس کا خیال رکھیں۔ میرا مطلب ہے، اس کی

خاموشی اور اداسی کو اس پر جتائیے گا نہیں، وہ بہت پریشان ہے۔“

”ارے نہیں.....! اچھا ہوا تم نے مجھے بتا دیا۔ میں خیال رکھوں گی۔ اب تم جاؤ اس کے پاس.....! اکیلا

مت چھوڑو اسے، میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔“

سیما کہتے ہوئے تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی تو وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆.....☆.....☆

خوبہ صاحبہ کو ایک تو پہلے ہی گھر سے نکلنے میں دیر ہو گئی تھی، اوپر سے ان کے روٹ کی وین آ کے نہیں

دے رہی تھی۔ وہ انتہائی کوفت کا شکار تھے۔ مزید اسد دلوڑ کوں کے ساتھ ان کے سامنے آں کھڑا ہوا اور ڈھٹائی کے

ساتھ فاتحانہ انداز میں بولا تھا۔

”السلام علیکم انکل.....!“

خوبہ صاحبہ نے آواز پر ہی اسے دیکھا اور پھر فوراً منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

”ناراض لگتے ہیں بڑے صاحب.....؟“

ایک لڑکے نے کہا تو دوسرا بھی فوراً بول پڑا۔

”سلام کا جواب بھی نہیں دیا.....؟“

”شاید انہیں پتا نہیں ہے کہ سلام کا جواب دینا فرض ہے.....؟“

پہلے لڑکے نے پھر کہا تو اسد اسے دیکھ کر بولا۔

”اے نہیں.....! سب پتا ہے انہیں، کچے مسلمان ہیں، پانچوں وقت مسجد جاتے ہیں۔“

”اچھا.....! پھر بے چارے گو ننگے بہرے ہوں گے.....؟“

”گو ننگے نہیں، گنگ.....! اچانک مدے نے بٹی گم کر دی ہے بڑے صاحب کی۔“

اسد نے تمسخر اڑایا۔ خوبہ صاحبہ اس کے منہ نہیں لگتا چاہتے تھے۔ غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں کبھی

اور.....! مجھے کبھی ادھر۔

”جج.....! ایسا کون سا پہاڑو بنا جو بے چارے کو اپنے پرانے کی پہچان ہی نہیں رہی.....؟“

لڑکے نے اسد سے پوچھا تو وہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”اے.....! تجھے نہیں پتا.....؟“

پھر دوسرے لڑکے سے۔

”اے.....! اسے نہیں پتا چلا، تو بتا اسے، پوری داستان سنانا۔“

اور اس سے پہلے کہ وہ داستان سنانا شروع کرتا، خوبہ صاحبہ نہ آنے والی وین پر لعنت بھیج کر تیز

لڑیوں سے واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ پیچھے وہ تینوں بلند آواز میں ہنس رہے تھے۔ ان کی مکروہ ہنسی گھرنیک

لہ لہ صاحبہ کا تعاقب کرتی آئی تھی۔

”کم بخت.....! بد ذات.....! ناہنجار.....!“

خوبہ صاحبہ گھر میں داخل ہوئے تو ان کے منہ سے ایسے ہی الفاظ نکل رہے تھے۔

”ہائیں.....؟ یہ کسے گالیاں دے رہے ہیں.....؟“

اماں ان کا غصے سے سرخ چہرہ دیکھ کر خائف ہو کر بولیں۔

”کسے دوں گا.....؟ سارے شہر میں ایک ہی تو بد ذات ہے۔ کم بخت نے راستہ چلنا مشکل کر دیا ہے۔

اتے جاتے آوازیں کستا ہے۔“

خوبہ صاحبہ پھٹ پڑے تھے۔

”کون.....؟ اسد.....؟“

اماں کا دھیان اسی کی طرف گیا تھا۔

”میری بیٹی کو طلاق دلو اگر کبھی چین نہیں ملا اسے.....؟ اور اب آپ کیوں اس کی بدتمیزیاں برداشت

رہتے ہیں.....؟ پہلے تو رابعہ کی وجہ سے مجبور تھے، اب کیا مجبوری ہے.....؟“

”سب سے بڑی مجبوری اپنی رہی سہی عزت بچانا ہے۔ کیا کروں.....؟ وہ بھی خاک میں ملا دوں

ایا.....؟ وہ تو بچ ہے، جو منہ میں آتا ہے بکے چلا جاتا ہے۔ پتا نہیں رابعہ نے کیسے تین سال اس گھر میں گزارے

ہیں.....؟ اسے تو بہت پہلے خود ہی چھوڑ کر آ جانا چاہئے تھا۔“

”بس.....! اب آگئی ہے ناں.....! چپ ہو جائیں۔“

اماں نے رابعہ کو آتے دیکھ کر کہا۔

”ہاں بس.....! اب یہی سزا ہے ہماری۔ چپ چاپ، گو ننگے بہرے بن جائیں، اچھی سزا ہے۔“

”اماں.....!“

رابعہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

”ابا! میں نے جتنا چاہا کہ میری ذات سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، اتنا ہی میں آپ کے لئے دکھ تکلیف کا باعث بن گئی ہوں۔“

”ارے نہیں بیٹا!“

خوجہ صاحب ایک دم نرم پڑے گئے۔

”ہم اپنی قسمت کے دکھ بھیل رہے ہیں۔ تمہارا کوئی تصور نہیں!“

”میرا تصور نہیں، میرے بچے کا تصور نہیں، پھر ہمیں اتنی بڑی سزا کیوں ملی.....؟“

وہ رونے لگی۔

”سزا مت کہو بیٹا! آ آزمائش ہوتی ہے۔ اللہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔“

خوجہ صاحب کی آواز بھرا گئی تھی۔

”پیارے بندوں کو ناں! مگر میں تو بہت بری ہوں ابا!.....!“

”کون کہتا ہے تم بری ہو؟ تمہارے جیسی بیٹی نصیب والوں کو ہی ملتی ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں

بیٹا! مجھے فخر ہے تم پر۔ تمہاری ذات سے مجھے اور تمہاری اماں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی، البتہ تمہارا رونا ہمیں تڑپاتا ہے۔“

خوجہ صاحب نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا تو وہ جلدی سے اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

”میں اب نہیں روؤں گی، کبھی نہیں روؤں گی۔“

”شباباش! تم میری بہادر بیٹی ہو۔ تمہیں بہادری سے حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ کرو گی ناں.....؟“

خوجہ صاحب اس کا چہرہ دیکھنے لگے تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے زبردستی کسائی، پھر پوچھنے لگی۔

”ابھی اسد نے آپ سے کیا کہا ہے؟“

”کچھ نہیں! تم جاؤ، اپنے بچے کو دیکھو!“

خوجہ صاحب، رابعہ کو ناں کر بیگم سے مخاطب ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

ایک تو اس کے لیے میں آ زرد گی، دوسرے یہ خوف کہ اگر اس گھر میں کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو اس کی

لبا عزت رہ جائے گی.....؟ مختلف کیفیات کی بدولت اس کا ذہن بری طرح متاثر تھا۔ کسی کام میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ جیسی کرنا کچھ چاہتی اور کچھ جانی تھی۔

اس وقت بھی جہانزیب کو کہیں جانا تھا اور وہ بڑی غلت میں اسے اچھڑا کپڑے استری کرنے کا کہہ کر

نہانے چلے گئے اور جب وہ نہا کر نکلے تو وہ بڑے انہماک سے ان کے جوتے پالش کر رہی تھی۔ وہ یہی سمجھے کہ وہ کپڑے پر لیس کرنے کے بعد یہ کام کر رہی ہے۔ جیسی ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”میرے کپڑے کہاں رکھے ہیں.....؟“

”کپڑے.....؟“

وہ جوتے رکھ کر کھڑی ہو گئی، پھر الماری کھول کر ان سے پوچھنے لگی۔

”کون سے کپڑے نکالوں.....؟“

”کیا مطلب.....؟ ابھی تک تم نے کپڑے نہیں نکالے.....؟“

وہ پہلے حیران ہوئے، پھر جھنجھلا کر آگے بڑھے اور کپڑے نکال کر خود ہی پر لیس کرنے لگے۔

”لائیے! میں کر دیتی ہوں۔“

”نہیں! ارہنے دو۔“

انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گئی اور ابھی ان کے روئے پر غور کر رہی تھی کہ وہ

کپڑے لے کر ہاتھ روم میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد نکلے تو بڑی غلت میں جوتے پہنے، بالوں میں برش کیا اور اسے

نظر انداز کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

”جہانزیب!“

وہ چونک کر ان کے پیچھے لپکی، لیکن وہ باہر نکل چکے تھے۔ اس کے دل کو ٹھیس سی لگی اور بہت سوچنے پر بھی

سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات پر خفا ہو کر گئے ہیں.....؟

☆.....☆.....☆

رابعہ کو اب اپنے اُڑنے کا غم نہیں تھا۔ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ کی فکر تھی، اور ان کی خاطر ہی اس

نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ رونا، کلوہنا چھوڑ کر وہ ایک نئے عزم سے اپنا اور اپنے بچے کا سوچنے لگی تھی۔ اس وقت وہ

اخبار اپنے سامنے پھیلائے ”ضرورت ہے“ کا کام لے دیکھ رہی تھی کہ اماں اسے پکار کر بولیں۔

”رابعہ بیٹا! یہ تمہارے ابا دے گئے ہیں۔ شوہنی کے دودھ وغیرہ کے لئے رکھ لو۔“

”کیا.....؟“

عجیب مشکل میں پڑ گئی تھی وہ کہ اب جبکہ وہ خود کو سمجھانے میں کامیاب ہو چکی تھی تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

یعنی ہر دوسرے دن اس کا فون آ جاتا۔ پہلے اپنی بے قراری کی داستان سنانے کی کوشش کرتا اور پھر ملتے پھر اصرار، جبکہ

وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ وہ پہلے ہی اپنی غلطی پر تادم تھی اور اب دوسری غلطی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اسے صاف لفظوں میں منع تو کر دیتی، لیکن پھر اس کا اپنا اطمینان بھی رخصت ہو جاتا تھا۔

اس نے اماں کے ہاتھ میں پیسے دیکھے، پھر شرمندگی میں گھر کر بولی۔
”نہیں اماں! آپ ہی رہیں، مجھے الگ سے شوہی کے لئے کچھ نہیں چاہئے۔ جو گھر میں ہوگا، شوہی بھی وہی کھانی لے گا۔“

”ارے! اتنا سا بچہ کیا کھانی سکتا ہے دودھ بسکٹ کے علاوہ.....؟ یہ لو، رکھ لو!“
”اماں! نہ مجبور کریں مجھے۔ پہلے ہی مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں۔“
اس نے کہا تو اماں ناراضگی سے بولیں۔

”ایسا تم کہو! بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں۔“
”بیابانی بیٹیاں آج کر واپس سیکے آجائیں تو بوجھ ہی ہوتی ہیں اماں! اماں باپ اپنے منہ سے بے شک نہ کہیں، لیکن سچ یہی ہوتا ہے، اور میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ اس لئے میں نے سوچا ہے کہ میں جاب کروں گی۔ اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ کال پٹی کال ہوں میں۔“
اس کی بات سن کر اماں پریشان ہو گئیں۔

”میں جانتی ہوں، لیکن بیٹا! تم ابھی سے جاب کرنے کا مت سوچو۔“
”کیوں؟“

اسے اماں کی پریشانی سمجھ نہیں آئی۔

”کیونکہ ہم لوگوں کی زبانیں نہیں پکڑ سکتے۔ ابھی اتنی باتیں بنا رہے ہیں لوگ، تمہارے جاب کرنے پر تو انہیں اور موقع مل جائے گا کہ چار دن ہم بیٹی کو بٹھا کر نہیں کھلا سکے۔“
”ہاں! انہیں کھلا سکے۔“
وہ ترخ کر بولی تھی۔

”کہہ دیں آپ لوگوں سے کہ میرا اور میرے بچے کا بوجھ آپ نہیں اٹھا سکتے، پھر کیا کریں گے لوگ؟ نہیں گے؟ ہنس لیں جتنا ہنس سکتے ہیں۔“

”بس! چپ ہو جاؤ! تمہیں جو کرنا ہو، پہلے اپنے ابا سے پوچھو۔“
اماں نے اسے چپ کر دیا تو وہ قدرے رُک کر پوچھنے لگی۔

”اب منع کریں گے کیا؟“

”مجھے نہیں پتا!“

اماں اتنا کہہ کر چلی گئیں تو وہ بے دلی سے اخبار سینے لگی۔ لیکن اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ لوگوں کی باتوں سے ڈر کر بیٹھ نہیں رہے گی۔ جب ہی رات میں وہ خواجہ صاحب کے پاس آ بیٹھی۔
”ابا! ایک بات کہنی تھی۔“

”ہاں! اکو بیٹا! کچھ کچھ کیوں ہو.....؟ جو کہنا ہو، بلا جھجک کہہ دیا کرو۔“
خواجہ صاحب نے بڑے پیار سے اس کی بہت بندھائی تو اس نے ایک نظر اماں کو دیکھا، پھر بھی رُک کر

ہلکی سی۔

”وہ..... ابا! اگر آپ اجازت دیں تو میں جاب کر لوں.....؟“
”جواب؟“

خواجہ صاحب چند ٹاپے کو خاموش ہوئے، پھر کہنے لگے۔
”بیٹا! مجھے اعتراض تو نہیں ہے، لیکن تم جاب کیوں کرنا چاہتی ہو.....؟ میرا مطلب ہے، اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تم ہم پر بوجھ بن گئی ہو تو یہ بے کار سوچ اپنے ذہن سے نکال دو۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں ابھی اتنا دم خم ہے کہ میں تمہاری اور شوہی کی ضرورتیں پوری کر سکوں۔“

”بات صرف ضرورتوں کی نہیں ہے ابا! احساس کی بھی ہے۔ میں اگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں گی تو پھر شاید میرے اندر سے ہر ذمہ داری کا احساس مٹ جائے گا۔ مجھے اپنی ذمہ داری خود اٹھانے دیں۔“

اس بات پر خواجہ صاحب خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگے.....؟
”ابا! اگر آپ نہیں چاہتے تو.....“

”نہیں نہیں بیٹا!.....“

خواجہ صاحب فوراً بولے تھے۔

”میں کیوں نہیں چاہوں گا؟ تم اگر ایسا سوچتی ہو، اپنے احساس کو زندہ رکھنا چاہتی ہو تو اچھی بات ہے۔“

”ایسا ہی ہے ابا! اماں! آپ کو تو اعتراض نہیں ہے ناں.....؟“

اس نے ایک دم اماں سے بھی پوچھ لیا۔

”اب میں کیا کہوں؟ تمہاری اگر یہی مرضی ہے تو میں کیا اعتراض کر سکتی ہوں.....؟ میں شوہی کا دشمن ہی ہوں۔ سارا دن رہ لے گا تمہارے بغیر.....؟“

اماں نے اس طرف اس کی توجہ دلائی، لیکن وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔

”کچھ دن تنگ کرے گا آپ کو، پھر عادی ہو جائے گا۔“

خواجہ صاحب اس کی بات پر ہنسنے لگے تھے۔

اور پھر اگلے دن ہی وہ جاب کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔ اخبار سے دو تین ایڈریس اس نے نوٹ کر لئے تھے اور ابھی وہ ایک جگہ سے ہی انٹرویو دے کر نکلی تھی کہ اسد اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اور تسخارنا انداز میں بولا تھا۔
”کیا اماں ابا نے بھی نکال دیا.....؟“

”تم.....؟“

اس کے اندر دھیروں تعجب بھر گیا تھا۔

”خاکسار کو اسد کہتے ہیں۔“

اسد ڈھٹائی سے سرخم کر کے کہنے لگا۔

”بھی آپ کا چیتا دیور ہونے کا شرف بھی حاصل ہو چکا ہے۔“

”دیکھو.....!“

وہ انتہائی غصے سے انگلی اٹھا کر بولی۔

”اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ وہ حشر کروں گی تمہارا کہ.....“

”اوہو.....! بڑا بولنا آگیا ہے.....؟“

وہ اس کی بات کاٹ گیا۔

”یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔“

”یہ جس دھمکی نہیں ہے اسد.....! سوچ لو، میں اب تمہارا قطعاً لحاظ نہیں کروں گی۔ کیونکہ اب تم میرے

چہیتے دیور نہیں رہے۔“

”دیور نہیں رہا تو کیا ہوا.....؟ کچھ اور تو بن سکتا ہوں۔“

اسد کی مزید ڈھٹائی پر وہ بھی بالکل آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ راستے کا خیال کئے بغیر اس کے منہ پر

زوردار طمانچہ مار کر غرائی تھی۔

”اپنی اوقات میں رہنا غنڈے، موالی.....! آئندہ میرے سامنے آنے تو منہ توڑ دوں گی تمہارا۔“

”کیا ہوا.....؟ کیا ہوا.....؟“

ادھر ادھر سے لوگ جمع ہونے لگے تو اسد ڈم دبا کر بھاگ گیا اور وہ اب کہیں اور جانے کے قابل نہیں

رہی تھی۔ گھر جانے والی روٹ کی وین دیکھ کر اس میں بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

دانیال صبح آفس جاتے ہوئے اس سے کہہ کر گیا تھا کہ وہ جلدی آجائے گا، تو اسے اماں کے گھر لے

جائے گا۔ پھر ابھی اس کا فون آگیا کہ وہ بس آفس سے نکلنے والا ہے۔ تب وہ فوراً اٹھ گئی اور جلدی جلدی اپنا سوٹ

پریس کر رہی تھی کہ سیما اس کے لئے چائے لے کر آگئی۔

”ارے بھابی.....! آپ نے کیوں زحمت کی.....؟“

وہ سچ سچ شرمندہ ہو گئی۔

”بس.....! اب ان تکلفات میں مت پڑو۔ میرا تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے

۱۲ سال نہیں کریں گے تو کون کرے گا.....؟“

سیما نے کہا تو وہ ممنونیت سے مسکرائی۔

”آپ واقعی بہت اچھی ہیں۔“

”بس.....! اب مجھے چڑھاؤ مت، چائے پیو.....!“

پھر اسے استری کا پلک آف کرتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کہیں جاری ہو گیا.....؟“

”جی.....! وہ دانیال آنے والے ہیں۔ اماں کے گھر جاؤں گی۔“

اس نے بتایا۔

”اچھا اچھا.....! ارے ہاں.....!“

سیما جیسے اچانک خیال آنے پر کہنے لگے۔

”مجھے دانیال نے بتایا تھا۔ تمہاری بہن رابعہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔“

”جی.....! بس.....!“

وہ خود افسردہ ہو گئی۔

”تو پتہ.....! کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں.....؟ ذرا ذرا سی بات کو آنا کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔ بے چاری

۱۳ اہل کا کیا تصور جو اس کے ہاتھ میں طلاق تھادی۔ بچے کا بھی خیال نہیں کیا ظالموں نے.....؟ ہاہ بائے.....!“

سیما بظاہر افسوس کر رہی تھی۔

”تمہارے اماں ابا تو بہت پریشان ہوں گے.....؟“

”جی ہاں.....!“

”بڑا ظلم ہے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ۔ اللہ کسی کو ایسے ڈکھ نہ کھائے۔ بے چاروں کی کمرٹ مٹی۔

میں بھی کسی دن جاؤں گی ان کے پاس۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو اسے تیار ہونے کا کہتے ہوئے وہ چلی گئی۔ لیکن اسے مضحل کر گئی تھی۔

۱۴ دانیال آیا تو وہ تیار تو تھی، لیکن ست لگ رہی تھی۔ کہیں جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ دانیال سے

لپکتی.....؟ ناچار اس کے ساتھ چل پڑی۔

آگے اماں اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں تو اس کے دل سے بوجھ سرکنے لگا۔

”بیٹھو بیٹا.....! کھڑے کیوں ہو.....؟ ٹائیپ.....! دانیال کے لئے کرسی ادھر لے آؤ.....!“

اماں، دانیال سے کہتے ہوئے ٹائیپ سے مخاطب ہوئیں۔

گی۔

”بس آئی۔! میں ابھی ایک کام سے جا رہا ہوں۔ پھر آؤں گا تو بیٹھوں گا۔“

دانیال نے خوجہ صاحب کو موجود نہ پا کر بیٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس سے بھی ضروری کام کا بہانہ کر کے چلا گیا، تب اماں اس کا چہرہ دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”تم سناؤ! ٹھیک تو ہونا؟ گھر میں سب کیسے ہیں؟“

”اچھے ہیں اماں! سب اچھے ہیں۔“

”اللہ کرے اچھے ہی رہیں۔ رابعی کی طرف سے دھچکا لگا ہے تو اب دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔“

اماں نے کہا تو وہ ان کا ہاتھ تمام کر بولی۔

”ارے اماں! سب ایک جیسے تھوڑی ہوتے ہیں۔ میری طرف سے تو آپ اطمینان ہی رکھیں۔“

تب ہی رابعی کمرے سے نکل کر آئی اور اسے دیکھ کر خوشی اور حیرت سے بولی۔

”ارے! تم کب آئی ہو؟ دانیال نہیں آیا کیا؟“

”دانیال ہی چھوڑ گئے ہیں۔“

وہ کہتے ہوئے اٹھ کر رابعی کے گلے لگ گئی۔

”کیسی ہو؟“

”اچھی ہوں۔! آج ایک جگہ جاب کے لئے گئی تھی۔“

رابعی نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بتایا تو وہ بولی۔

”تو تم اب جاب کرو گی؟“

”ہاں ثانیہ! ڈعا کرو کی اچھی جگہ جاب مل جائے۔“

”مل جائے گی۔ اگر تم کہو تو میں دانیال سے بات کروں۔! وہ تمہیں اچھی جاب دلا دین گے۔“

اس نے کہا تو رابعی فوراً بولی تھی۔

”نہیں ثانیہ! میں سفارش سے نہیں جانا چاہتی۔ میں اب ہر مشکل سامنا خود کروں گی، اگر ابتداء ہی

میں کسی کا سہارا لے لیا تو پھر مجھ میں کانفیڈنس نہیں آئے گا۔ تم میری بات کا برتا مانتا۔“

”ارے نہیں! اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ بلکہ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے بہت

باندھ لی۔“

وہ واقعی خوش ہو گئی تھی۔

”روئے گوہنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ خیر چھوڑو مجھے، تم اپنی سناؤ، تم نے تو میدان مار لیا۔ کیسا لگ

رہا ہے؟“

رابعی نے اچانک شوخ ہو کر اس کے پیلو میں چٹکی کاٹی تو وہ اماں کی طرف اشارہ کر کے رابعی کو گھورنے

”اچھا! یہ دانیال کیوں چلا گیا؟“

رابعی نے پوچھا۔

”اصل میں اب نہیں ہیں ناں! اور وہ ہم عورتوں میں بیٹھ کر کیا کرتے؟“

اس نے کہا تو اماں تعجب سے بولیں۔

”ہائیں! دانیال اس لئے چلا گیا کیا؟“

وہ اور رابعی بے ساختہ ہنسی تھیں۔

☆ ☆ ☆

عباد نے ماں بھائی کے اُکسانے پر رابعی کو طلاق تو دے دی تھی، لیکن پھر چند دنوں میں ہی اسے حقیقتا دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ نہ وقت پر کھانا ملا، نہ پکڑے۔ اس وقت وہ آفس سے آیا تھا۔ راستے کی جام ٹریفک نے ایسے ہی دماغ خراب کیا ہوا تھا۔ مزید بچن میں کھانے کو کچھ نہیں ملا، سالن کی پتیلی خالی پڑی تھی، ہاٹ پاٹ میں روٹی نہ تھی۔ وہ غصے میں ہاٹ پاٹ پنچ کروڑوں سے چلاتے ہوئے بتول بیگم کے پاس آ کر پوچھنے لگا۔

”امی! امی! آج کھانا نہیں پکا کیا؟“

”پکا تھا، سب پکا تھا۔“

بتول بیگم اس کے تہوردیکھ کر خود بھی اٹھ کر بولی۔

”پھر؟ کہاں گیا؟ سالن کی پتیلی خالی پڑی ہے اور روٹی بھی نہیں ہے۔“

”کہاں سے ہو گی روٹی؟ چار چار منٹوں کے آگے تھے کھانے کو، تیرے بھائی نے اٹھا کر کھلا دیا سب

انہیں۔“

بتول بیگم نے بتایا تو وہ مزید تلملا گیا۔

”کیوں؟ حرام کتا ہوں میں جو ایسے لٹا رہا ہے؟ خود مکائے تو پتا چلے؟ اور آپ کو بھی

اساس نہیں ہے۔ آفس سے تھکا ہارا آ رہا ہوں میں، اب بتائیں! کیا کھاؤں گا میں؟“

”آئے تو شور کیوں چار ہے ہو؟ آرام سے کب، بھوک لگی ہے۔ روٹی ڈال دیتی ہوں۔“

”خالی روٹی کا کیا کروں گا؟ سالن بھی چاہئے، اور سمجھا دیں اپنے جیتے کو، میں نے اسے اور اس

کے آوارہ دوستوں کو پالنے کا ٹھیک نہیں لے رکھا ہے۔ کسی کام دھنے سے لگے، نہیں تو نکل جائے اس گھر سے۔“

اس کی آخری بات پر بتول بیگم کو پتہ لگ گئے۔

”ایں؟ کیوں نکل جائے؟ یہ گھرا کیلے تمہارے باوا کا نہیں ہے، وہ بھی برابر کا حصے دار ہے۔“

پھر ابھی تو میں زندہ کھڑی ہوں۔ تم کون ہوتے ہو اسے نکالنے والے؟“
بتول بیگم کی اسد کی ناجائز طرف داری پر وہ حیرت اور دکھ کی تصویر بن گیا۔

”میں کون ہوتا ہوں؟ میں کون ہوتا ہوں؟“ ٹھیک ہے..... میں کچھ نہیں ہوں، تو میں ہی چلا جاتا ہوں۔“

اس کے دل پر ایسی چوٹ پڑی تھی کہ پھر بتول بیگم روکتی رہ گئیں، لیکن وہ گھر سے نکل گیا تھا۔ پھر پہلے قریبی ریسٹورینٹ میں کھانا کھایا، اس کے بعد چائے پیتے ہوئے اسے شدت سے احساس ہونے لگا کہ ماں بھائی کی ناجائز باتیں مانتے ہوئے وہ اپنا ایسا نقصان کر گیا ہے جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔ اسے شدت سے رابعہ اور اپنا بچہ یاد آنے لگے۔ اس کے ناروا سلوک کے باوجود وہ لڑکی اس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی۔

”رابعہ.....!“

اس کا دل چیخ چیخ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ چائے کے ساتھ سگریٹ پر سگریٹ جلاتے ہوئے وہ رات گئے تک وہیں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ ریسٹورینٹ بند ہونے لگا، تب نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گھر آ گیا۔ لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جلدی اپنا الگ انتظام کر لے گا۔

”عباد.....!“

بتول بیگم اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئیں۔

”کہاں چلے گئے تھے؟ میں تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ کھانا بھی نہیں کھایا؟“

”کھانیں اپنے لٹاؤ لے کے ساتھ.....! میرے انتظار میں کیوں بیٹھی ہیں؟“

وہ نرموٹھے پن میں بولا تھا۔

”ارے.....! وہ لاڈلا ہے تو، تو کون ہے؟ تو بھی میرے پیٹ کی اولاد ہے۔ تیرے لئے جتنی جان ماری ہے میں نے، اس سے کے لئے نہیں ماری۔ جیسی تو آوارہ پھرتا ہے وہ۔ تجھے بھی چھوڑ دیتی تیرے حال پر تو، تو بھی اسی جیسا ہو جاتا۔ آج کسی قابل ہے تو میرا احسان مان.....!“
بتول بیگم بولے چلی گئیں۔

”احسان مان کر ہی تو آپ کے اشاروں پر چلتا رہا ہوں۔ لیکن آپ کو میری بالکل پرواہ نہیں ہے۔ چھوٹے کے سامنے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتی ہیں مجھے، اور یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔“

”ابساتم کو بیٹا.....! چھوٹے کی بدتمیزیاں میں بھی تو برداشت کر رہی ہوں۔ کیا کروں؟ کچھ کہتی ہوں تو اُلٹا مجھے پٹھاتا ہے۔ مجھے بھی کہاں کچھ بھتا ہے؟“
بتول بیگم رونے لگیں۔

”سوچا تھا شادی کر دوں گی اس کی، تو جان چھوٹے گی میری۔ لیکن میری قسمت ہی خراب ہے۔ کوئی لمحہ نہیں لکھا نصیب میں۔ اب تو بھی چھوڑ کر جا رہا ہے مجھے.....؟“
”اڈو امی.....!“

وہ جھنجھلا گیا۔

”کہیں نہیں جا رہا ہوں میں، آپ جائیں کھانا کھا کر سونیں۔“

”اور تو.....؟ تو نہیں کھائے گا کیا.....؟“

بتول بیگم اس کے نہ جانے کا سن کر مطمئن ہو گئیں۔

”میں کھا آیا ہوں، آپ جائیں، میں اب سوؤں گا۔“

وہ زبردستی انہیں بھیج کر پٹنگ پر ڈھکے گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ان کی واپسی رات بہت دیر سے ہوئی تھی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے جا چکے تھے۔ کا زی کا ہارن سن کر گیٹ اسی نے کھولا اور ان کے پیچھے چلتی ہوئی اندر آئی تو یوں ہی پوچھنے لگی۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“

”کیوں.....؟“

وہ ناگواری سے بولے تو وہ ٹپٹا گئی۔ پھر قدرے تاخیر سے بولی۔

”کھانا لاؤں.....؟“

”نہیں.....! کھانا میں کھا چکا ہوں۔ البتہ چائے.....“

انہوں نے اسی قدر کہا تھا کہ وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”سنو.....!“

انہوں نے پکار لیا اور اس کے پلٹ کر دیکھنے پر بولے۔

”ذرا دھیان رکھنا، میں نے چائے کے لئے کہا ہے، دودھ مت لے آنا۔“

”جی.....!“

وہ جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔ ان کی وجہ سے اس نے کھانا نہیں کھایا تھا اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس لئے چائے کا پانی رکھ کر چولہا دھیمہ کر دیا اور وہیں کھڑی ہو کر جلدی جلدی کھانا کھانے لگی۔ ساتھ ساتھ ان کی خشکی جب بھی سوچتی جا رہی تھی۔
”تم نے کھانا نہیں کھایا تھا.....؟“

”تم محسوس مت کرنا۔ اصل میں آج زوہیب نے عجیب سی بات کہی ہے۔ کہنے لگا، جو بیویاں اپنے شوہروں کا حد سے زیادہ خیال رکھتی ہیں، وہ درحقیقت اپنا خیال رکھ رہی ہوتی ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

وہ اچانک سناٹوں میں گھر گئی۔

”یعنی اس کا مطلب تھا، اپنی لغزشوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ایسا کرتی ہیں۔“

”میرے خدا.....!“

وہ اپنے آپ کو انتہائی کمزور اور بے بس محسوس کرنے لگی اور کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہیں بول سکی۔

”تمہیں شاید میری بات بری لگی۔“

وہ اس کو ہونٹ کاٹنے دیکھ کر بولے تو اس نے پہلے نفی میں سر ہلایا، پھر کہنے لگی۔

”آپ کی باتیں، زوہیب کی باتیں بری لگی ہیں، اور جیسا کہ آپ نے اس کے بارے میں بتایا تھا تو اس

جیسا بندہ ایسی ہی باتیں کر سکتا ہے۔“

”ہاں.....! یہ تم ٹھیک کہتی ہو۔“

انہوں نے تائید کی تو اس کا دل چاہا کہ اب آئندہ زوہیب سے مت ملے گا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر

خاموش ہو رہی اور نیند کا بہانہ کر کے کروٹ بدل گئی۔

پھر ایک تو وہ پہلے ہی پریشان تھی، دوسرے اب زوہیب کی بات نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔ غالباً

یہ خدشہ تھا کہ جہانزیب اس کی باتوں کو بخجندی سے سوچتے ہوئے کہیں اس کے ماضی کو نہ کرید نے لگیں۔ وہ بالکل نہیں

سمجھ پارتی تھی کہ وہ اپنے ان مسائل کو کس کے ساتھ شیئر کرے.....؟

خود ہی سوچتی اور ابھرتی تھی۔ جیسی دل کا بوجھ بڑھتا چلا گیا۔ پھر ان ہی دنوں اس کی طبیعت خراب رہنے

لگی۔ پہلے وہ یہی سمجھی کہ مسلسل سوچتے رہنے کی وجہ سے سر چکرانے لگتا ہے اور دل متلا یا متلا یا سار جتا ہے، لیکن اس

روز جب وہ ناشتے کی ٹیبل سے اٹھ کر بھاگی تو اماں کو اسی وقت شب ہو گیا اور اسی روز وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں

جہاں اماں کے شبکی تصدیق ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اس پر یوں مہربان ہوئیں کہ اسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی

تھیں جبکہ وہ اس صورت حال سے پریشان ہو گئی، کیونکہ ایک مصروفیت ہی تو تھی جو اسے پریشان سوچوں سے دور

رکھتی تھی اور اب بالکل فارغ ہو کر تو وہ بوکھلا گئی تھی۔

”جہانزیب.....!“

میں کچھ دنوں کے لئے امی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“

اسے فرار کا یہی راستہ نظر آیا۔

”کچھ دنوں کے لئے.....؟“

وہ مزید سوچ انداز میں بولے۔

”ہاں.....! اگر آپ اجازت دیں تو.....؟“

”میں منع نہیں کر رہا۔“

وہ فوراً بولے تو وہ اسی وقت بیگ نکال کر اس میں اپنے کپڑے رکھنے لگی۔

☆.....☆.....☆

سیما زبردستی دانیال پر یہ جتنی تھی کہ ٹائیڈ اُداس ہے، ڈسٹرب ہے۔ اس نے رابعہ کی طلاق کا گہرا اثر لیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ابھی بھی اس نے ایسی ہی باتیں کر کے ٹائیڈ کو آؤٹ تنگ پر لے جانے کو کہا تھا کہ وہ بہل جائے اور پھر اپنے بچوں کو بھی ان دونوں کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر حنا کو فون کرنے لگی تھی کہ کمال حسن آگئے۔

”آج آپ نے بہت دیر کر دی.....؟“

سیما نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بس.....! آؤٹ چل رہا ہے، اس لئے دیر ہو گئی۔“

کمال حسن تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئے تو اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں کھانا لگاتی ہوں۔“

”ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ شام میں چائے کے ساتھ سینڈویچ لئے تھے۔“

انہوں نے کہا تو وہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

”چلیں پھر بچے آجائیں تو ساتھ ہی کھالیں گے۔“

”بچے.....؟ بچے کہاں گئے ہیں.....؟“

”وہ..... دانیال اور ٹائیڈ جا رہے تھے تو ان کے ساتھ۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے کمال حسن نے ٹوک دیا۔

”کیوں جانے دیا تم نے بچوں کو.....؟ میرا مطلب ہے، ڈیہا ڈیہن کے گھونٹے پھرنے کے دن ہیں،

بچے تنگ کریں گے انہیں۔“

”بھئی.....! میں نے تو بہت روکنے کی کوشش کی، لیکن رد اچل گئی۔ پھر دانیال کا آپ کو پتا ہے، بچوں کا

رونا برداشت نہیں کرتا۔ میرے منع کرنے کے باوجود لے گیا دونوں کو۔“

”اچھا.....! میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ اگر سو جاؤں تو کھانے پر مت اُٹھانا۔“

کمال حسن یہ کہتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تب اس نے ریسیور اُٹھا کر حنا کا نمبر ڈائل

”باقی تھیں، مگر کینسل ہو گئی ہیں۔ چلیں اب آپ بچوں کو اسکول کے لئے تیار کریں، میں ناشتہ بناتی ہوں۔“

اس نے سیما کے ہاتھ سے بریڈ کا پکٹ لے لیا۔

”نہیں بھئی! تم ابھی سے چوہا ہانڈی کے پتھر میں مت پڑو۔ ابھی تمہارے گھونٹنے پھرنے کے،

آرام کرنے کے دن ہیں۔“

سیما نے اوپر سے دل سے کہا ورنہ وہ خوش ہو گئی تھی۔

”بس! بہت آرام کر لیا بھابی!.....! آج پوچھیں تو میں بور ہو گئی ہوں۔“

اس نے کہا تو سیما نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”ہیں!؟ ابھی سے!.....!“

”میرا مطلب ہے، فارغ بیٹھ بیٹھ کر۔“

”اچھا!.....! میں سمجھی دانیال سے۔“

سیما خود بھی ہنسی۔

”چلو پھر تم انڈے فرائی کر کے چائے دم کر دو، میں بچوں کو دیکھتی ہوں۔“

”جی!.....!“

وہ سیما کے جاتے ہی انڈے فرائی کرنے لگی۔ ساتھ ہی چائے کا پانی بھی رکھ دیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ پہلے دن دانیال ناشتے میں پراٹھے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا، تو وہ جلدی جلدی اس کے لئے پراٹھا بنانے لگی۔ تب ہی دانیال تیار ہو کر کچن کے دروازے تک آ کر زک گیا اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد ناٹھ کر اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو اسے دیکھ کر بولی۔

”بس!.....! ناشتہ تیار ہے۔ آپ جائیں، میں لے کر آتی ہوں۔“

”میں کہاں جاؤں؟ زندگی تو یہاں ہے۔“

وہ قریب آ گیا تو وہ ایک دم گھبرا گئی۔

”کیا کر رہے ہیں!؟ ابھی بھابی آ جائیں گی۔“

”آنے دو!.....! میں کوئی چوری تو نہیں کر رہا ہوں۔“

دانیال نے عقب سے اس کے کندھے پر اپنی ٹھوڑی لگا لی تھی کہ سیما کی آواز سن کر خود ہی گھبرا کر بھاگ گئی۔ وہ بمشکل ہنسی روک کر چائے دم کرنے لگی۔

آج وہ جاب کے لئے بے حد خواہش ہوئی تھی۔ دو تین جگہ انٹرویو دے کر گھر لوٹی تو تھکن سے زیادہ مایوسی نے اسے غڑھا ل کر دیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا، سیدھی کمرے میں جا کر لمبی تان کر سو جائے۔ لیکن اماں سامنے برآمدے میں ہی بیٹھی تھیں۔

”کیا کر رہی ہیں اماں!؟ شوبی کہاں ہے!؟“

اس نے اماں کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”شوبی ابھی سویا ہے۔“

اماں نے بتایا۔

”آپ کو تنگ تو نہیں کیا شوبی نے!؟“

وہ پیروں سے سینڈل اُتارتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ارے نہیں بیٹا!.....! اب تو مجھ سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ کھیلتا رہتا ہے۔ مجھے بھی بہلاتے رکھتا

ہے۔“

اماں کے لہجے میں شوبی کے لئے محبت اُتر رہی تھی۔

”اچھا!.....!“

”چلو!.....! تم منہ ہاتھ دھو لو، میں تمہارے لئے کھانا گرم کرتی ہوں۔“

اماں کہتے ہوئے اٹھنے لگیں کہ وہ روک کر بولی۔

”آپ بیٹھی رہیں اماں!.....! میں لے لوں گی کھانا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو اماں اچانک یاد آنے پر بولیں۔

”ارے ہاں!.....! رابعہ! تمہارے نام خط آیا ہے۔“

”کیسا خط!؟“

وہ تھکی تھی۔ اماں نے چادر کے نیچے ہاتھ ڈال کر لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا تو اس نے جھپٹ کر

لفافہ کھولا اور اس میں سے پیپر نکال کر دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔

”اماں!.....! مجھے جاب مل گئی۔ یہ میرا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔“

”شکر ہے!.....!“

اماں نے کہا۔

وہ پھر بیٹھ گئی۔

”اچھی جگہ سے اپائنٹمنٹ آیا ہے، ورنہ آج تو میں مایوس ہی ہو گئی تھی۔“

”بیٹا!.....! تمہیں ہی شوق ہے، ورنہ ایسی کوئی مجبوری تو نہیں تھی۔ تمہاری دو وقت کی روٹی ہم پر بھاری تو

آیا تو.....؟

”اتنی ہمت نہیں کر سکتا اماں.....! وہ۔“

وہ تھلا کر بولی تھی۔

”دروازے پر تو چیخ چلا سکتا ہے، سارا محلہ سنے گا اس کی بکواس۔“

اماں نے کہا تھا کہ اس وقت ڈور تیل بجتے لگی۔

”وہی نامراد ہوگا۔ کیا کروں.....؟ تمہارے ابا کو فون کروں.....؟“

اماں یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ڈھے جائیں گی، جب وہ سختی سے بولی۔

”نہیں.....! ابا کو فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جائیں، اسے اندر بٹھائیں۔ میں آتی ہوں۔“

”جی.....؟“

اماں اسے یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ کیا کہہ رہی ہے.....؟

”جائیں اماں.....! کچھ نہیں ہوگا۔ میں منٹ لوں گی اس سے۔“

وہ زبردستی اماں کو بھیج کر ٹپٹنے لگی۔ کچھ دیر بعد جب اماں واپس آئیں تو وہ ان سے کچھ کہنے بغیر تیزی سے

ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

”آداب عرض.....!“

اسد نے اسے دیکھتے ہی فرضی سلام کہا تو وہ بہت ضبط سے بولی۔

”کیوں آئے ہو یہاں.....؟“

”بیٹیجی کی محبت کھینچ لائی ہے۔“

وہ ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔

”اچھا.....؟“

اس کے لہجے میں بلا کر طنز تھا۔

”جب بھتیجا تمہارے گھر میں تھا، تب تو کبھی تمہیں اس پر پیار نہیں آیا تھا.....؟ اب کیسے محبت جاگ

گئی.....؟“

”خون کبھی بھی جوش مار سکتا ہے۔ لے کر تو آؤ، کہاں ہے میرا بھتیجا.....؟“

پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”دل تڑپ رہا ہے، اسے سینے سے لگاؤں گا تو چین آئے گا۔“

”بندر کو اپنی یہ بکواس.....!“

اس نے ضبط کا دامن چھوڑ دیا۔

”میں تمہاری چال بازیاں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ باپ کا دل تو تڑپا نہیں بیٹے کے لئے، تمہارا دل

بڑھ رہا ہے.....؟ تم باپ سے بڑھ کر ہو کیا.....؟“

”نہیں.....! میں باپ سے بڑھ کر کیسے ہو سکتا ہوں.....؟ بس.....! اپنا اپنا دل ہے، اور میرا دل تو جب

میں بیٹیجی کی محبت میں تڑپے گا، میں اس سے ملنے آؤں گا، تم مجھے نہیں روک سکتی۔“

”روکوں گی تو جب تمہیں دوبارہ آنے کے قابل چھوڑ دوں گی۔“

وہ انتہائی غصے میں بلکہ غوغوار ہو کر اس پر جھپٹ پڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسے امی کے گھر آئے ہوئے چوتھا دن تھا، جب اس کا فون آیا اور اس بار تو اس نے حد کر دی تھی، یعنی

مہلی نے فون ریسیور کیا اور اس نے اسی سے کہہ دیا کہ جانیہ سے بات کرنی ہے اور جب پنکئی نے اسے بتایا کہ تمہارا

فون ہے تو اس نے اٹھتے ہوئے یوں ہی پوچھ لیا۔

”کون ہے.....؟“

”پتا نہیں.....! شاید تمہارا دیویر.....؟“

پنکئی لا پرواہی سے کہتی ہوئی چلی گئی۔

”جہانگیر کا فون ہے.....؟“

اسے اچھٹے ہوا۔ جلدی سے آکر ریسیور کان سے لگاتے ہی بولی۔

”کون.....؟ جہانگیر.....؟“

”نہیں.....! یہ میں ہوں۔“

دوسری طرف وہ اطمینان سے بولا تو اس کی اتنی جرأت پر وہ دنگ رہ گئی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں.....؟“

وہ اسی طرح حیرت میں گھر کر بولی۔

”تمہارے گھر فون کیا تھا، وہاں سے معلوم ہوا۔“

”کیا.....؟“

وہ بے اختیار رنجی۔

”کم آن جانیہ.....! اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔ بس یوں سمجھو، مجھے خود ہی آگاہی ہو جاتی

ہے۔“

اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

”کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔“

”بس! میرے ساتھ اب گھر چلو۔ میں اس حالت میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”خاک ٹھیک ہو.....؟ آئینہ دیکھو، برسوں کی مریض نظر آ رہی ہو، اور اماں دیکھیں گی تو مجھ پر خفا ہوں گی۔“

”ایک دو دن بعد چلوں گی۔“

”نہیں! آج ہی۔“

وہ حتیٰ انداز میں بولے تو وہ خاموش ہو رہی۔

پھر شام تک اس نے کافی حد تک خود کو سنبھال لیا، کیونکہ جانتی تھی کہ جہانزیب اسے ساتھ لے کر ہی جائیں گے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اماں اسے بیمار حالت میں دیکھیں۔ جس وقت وہ اپنا بیگ ٹھیک کر رہی تھی، بچی چائے لے کر آگئی۔

”جہانزیب کہاں ہیں.....؟“

وہ اس سے پوچھنے لگی۔

”وہ برآمدے میں چھوٹے بھیا کے ساتھ بیٹھے ہیں۔“

”چلو! میں بھی وہیں آ رہی ہوں۔“

اس نے بیگ بند کیا اور بچی کے ساتھ برآمدے میں آگئی۔ جہانزیب چھوٹے بھیا کو سمجھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”اس طرح کہیں بھی جانے میں صرف خوری ہے، آپ کچھ نہ کریں، بس سال ڈیڑھ سال کا کمپیوٹر کا کورس کر لیں۔ اس کے بعد یہیں آپ کو بہت اچھی جا بل جائے گی۔“

وہ اور بچی حیران ہو کر چھوٹے بھیا کو دیکھنے لگیں جو کسی چھوٹے بچے کی طرح بڑی سعادت مندی سے سر ہلارہے تھے۔

”سال دو سال گزرتے پتا نہیں چلتا۔ بجائے اس کے کہ آپ مزید دو سال یہ سوچنے میں گزار دیں کہ جاپان کیسے جاؤں.....؟ اتنے عرصے میں آپ یہ کورس مکمل کر لیں گے، پھر آپ کو تو اس گھر سے دور جانے کا سوچنا بھی نہیں چاہئے، کیونکہ آپ کے بڑے بھیا پہلے ہی الگ ہو چکے ہیں، جانیہ اپنے گھر کی ہے، پھر بچی کی شادی کے بعد امی ابو کے ساتھ آپ ہی کو رہنا ہے۔ اگر آپ بھی کہیں باہر نکل گئے تو امی ابو.....“

جہانزیب دانستہ خاموش ہو گئے، تب چھوٹے بھیا کہنے لگے۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس بچہ پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“

”بس! اب سوچنے کی بجائے کل ہی کسی اشنٹیوٹ میں داخلہ لے لیں، بلکہ آپ ایسا کریں، کل میرے پاس آ جائیں، میں آپ کو لے چلوں گا۔“

”جی ضرور! میں آ جاؤں گا۔“

چھوٹے بھیا نے ہامی بھری تو اس نے مسکرا کر بچی کو دیکھا، پھر جہانزیب سے کہنے لگی۔

”چلیں.....؟“

”ہاں چلو! پہلے ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”لیکن اب تو میں ٹھیک ہوں۔“

”پھر بھی چیک آپ کروالینے میں کیا حرج ہے.....؟“

امی نے بھی ان کی تائید کی تو وہ خاموش ہو رہی۔ پھر اندر سے اپنا بیگ اٹھا لائی اور سب سے مل کر ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔

”آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔“

وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی جہانزیب سے کہنے لگی۔

”کس بات کا.....؟“

وہ بالکل نہیں سمجھتے۔

”یعنی چھوٹے بھیا کو قائل کر لیا، ورنہ ہم سب تو انہیں سمجھا سمجھا کر تھک کر ہار چکے تھے۔“

”اچھا!..“

وہ احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے بولے۔

”سمجھانے اور الزام دینے میں بہت فرق ہے جانیہ! اور اکثر لوگ اس فرق کو محسوس نہیں کرتے۔ اب جبکہ تم ماں بننے والی ہو تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ میرا خیال ہے، اب تک تم لوگ چھوٹے بھیا سے یہ کہتے رہے ہو کہ وہ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے اور یہ بات ایک تو بندے کے اندر ضد پیدا کرتی ہے، دوسرے وہ سب کچھ ایک ساتھ حاصل کر لینا چاہتا ہے، تاکہ لوگوں کو بتا سکے کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا.....؟ اور ظاہر ہے، سب کچھ ایک ساتھ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ پھر چھوٹے بھیا کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ بیچارے زیادہ پڑھ نہیں سکے۔ اگر اسی وقت جب انہوں نے تعلیم چھوڑی تھی، انہیں کسی ٹیکنیکل لائن میں ڈال دیا جاتا تو وہ اب تک یوں بیکار نہ پھر رہے ہوتے۔ بہر حال، اب انشاء اللہ وہ جلد ہی کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“

انہوں نے کلیٹک کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہلکے سے مسکرائی۔ پھر انہوں نے خود ڈاکٹر کو اس کی تمام کیفیات کے بارے میں بتایا اور خاص طور سے پوچھا کہ وہ اتنی کمزور کیوں ہوتی جا رہی

ہے۔۔۔۔۔؟

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ابتدائی دنوں میں ایسا ہو جاتا ہے۔“

ڈاکٹر نے انہیں اطمینان دلایا، پھر کہنے لگیں۔

”میں ٹانگ وغیرہ لکھ کر دے رہی ہوں۔ یہ باقاعدگی سے استعمال کروائیں اور فی الحال ان کے لئے

ریسٹ بہت ضروری ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔!“

انہوں نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے نسخہ لیا اور شکر یہ کہہ کر اسے ساتھ لے کر باہر نکلے تو کہنے لگے۔

”اب تم اپنی طرف سے لا پرواہی نہیں کرو گی۔“

”میں لا پرواہ نہیں ہوں۔“

”پھر کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔؟“

اسی وقت کسی نے پیچھے سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تو جہاں وہ پلٹے وہاں اس نے بھی دیکھا تو

جیسے روح فنا ہو گئی۔ بالکل غیر ارادی طور پر جہانزیب کے بازو پر اس کی انگلیوں کی گرفت سخت ہوتی چلی گئی۔ اتنی

جلدی وہ اپنی بات کو سچ ثابت کرنے چلا آیا تھا۔

”کیا ہوا جانیہ۔۔۔۔۔؟“

اپنے بازو میں چھین محسوس کر کے جہانزیب نے اسے دیکھا۔ پل میں وہ زرد پڑ گئی تھی۔ جیسی تشویش سے

پوچھنے لگے۔

”تم ٹھیک تو ہو۔۔۔۔۔؟“

اس نے کچھ کہنے کے لئے ابھی صرف ہونٹ کھولے تھے کہ وہ کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے، یہ مجھے دیکھ کر ڈر گئی ہیں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

جہانزیب ہنس کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”میری شکل ہی اتنی خوفناک ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔! میں نے بھی غور نہیں کیا۔“

جہانزیب نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالا، پھر اس سے کہنے لگے۔

”جانیہ! یہ زوہیب ہے، جس کے بارے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا۔“

”زوہیب۔۔۔۔۔؟“

اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور وہ بے حد تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اور یہ غالباً تمہاری سزن ہیں۔ بھئی۔۔۔۔۔! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

وہ اس کی پڑتاسف نظروں کے باوجود ڈھٹائی سے ہنس کر بولا تو اس کے اندر آلاؤ دیکھنے لگا۔ دل چاہا

ابھی بڑھ کر اس کا منہ نوچ لے۔ بمشکل تمام خود پر قابو پا کر جہانزیب سے کہنے لگی۔

”چلیں جہانزیب۔۔۔۔۔؟“

اور جہانزیب سے پہلے وہ بول پڑا۔

”میرے ساتھ چلو۔۔۔۔۔! میں تم دونوں کو کسی اچھی جگہ ڈنر کراؤں گا۔“

”نہیں جہانزیب۔۔۔۔۔! امیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آپ گھر چلیں۔“

وہ سرگوشی میں بولی تو جہانزیب اس کا خیال کر کے زوہیب سے کہنے لگے۔

”ابھی نہیں زوہیب۔۔۔۔۔! ہم پھر کسی دن تمہارے گھر آ جائیں گے۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔۔۔!“

پھر اسے دیکھ کر بولا۔

”بھولے گا نہیں۔۔۔۔۔!“

”فکرت کرو۔ یہ بھول بھی گئیں تو مجھے یاد رہے گا۔“

جہانزیب نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، پھر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

”تم میرے ساتھ ساتھ اپنے دوست کو بھی دھوکہ دیتے رہے ہو۔ تھف ہے تم پر۔۔۔۔۔!“

وہ زبردستی سے کہہ کر جہانزیب کے پیچھے چلی گئی۔

اس رات وہ ایک پل کے لئے نہیں سو سکی تھی۔ زوہیب جس طرح بے نقاب ہوا تھا، اس سے اس کی

پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر انجانے میں وہ اس کے ساتھ یہ کھیل کھیل رہا ہوتا، تب تو

جہانزیب کا سامنا ہونے پر اسے شرمندہ ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ انجان نہیں تھا، بلکہ شروع دن سے جانتا تھا کہ وہ

جہانزیب کی سنگت ہے اور جب اس نے اپنے دوست کا خیال نہیں کیا تو اس کا کیا خیال کرے گا۔۔۔۔۔؟

اور وہ دوست نہیں تھا، اسے دوست کہنا دوتی کی توہین تھی۔ ایسے شخص کے سامنے منت سماجت کا بھی کوئی

فائدہ نہیں تھا، نہ ہی اس سے کوئی اچھی توقع رکھی جاسکتی تھی۔

”پتا نہیں اس کا مقصد کیا تھا۔۔۔۔۔؟“

بہت سوچنے پر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا اور اس کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو، وہ بری طرح پھنس چکی تھی۔

یوں کہ اب اپنے دفاع کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”میں کیا کروں۔۔۔۔۔؟“

اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ کتنی دیر تک وہ بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔ قریب

ہی جہاز زیب بے خبر سو رہے تھے اور کیسی ستم ظریفی تھی کہ وہ جو زندگی کا ساتھی تھا، وہ اس سے اپنا احوال نہیں کہہ سکتی تھی، بلکہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی کہ اگر انہیں خبر ہوگئی تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔
صبح اس کی آنکھیں رت جگے اور شدت گریہ کے باعث سرخ اور سوجی ہوئی تھیں، جنہیں دیکھ کر جہاز زیب تشویش سے کہنے لگے۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں.....؟ تمہاری آنکھیں بھی اتنی لال ہو رہی ہیں.....؟“

”رات میں ٹھیک طرح سے سو نہیں سکی۔“

وہ یہی کہہ سکی۔

”تو مجھے اٹھا دیا ہوتا۔“

”آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے۔“

”اب تو جیسے میں پریشان نہیں ہو رہا.....؟“

وہ گڑنے لگے۔

”آخر تم کیوں مجھے پریشان کرتی ہو.....؟“

”میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی۔“

وہ رونے لگی تو وہ نرم پڑتے ہوئے بولے۔

”عجیب بے وقوف لڑکی ہوتی.....! مجھے بتاؤ، تم کیا محسوس کرتی ہو.....؟“

”پتا نہیں.....!“

وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”چلو اٹھو.....! ناشتہ کرلو، پھر سو جانا۔“

وہ اسے اٹھا کر ڈائننگ روم میں لے آئے۔ وہ بہت خاموشی سے سر جھکا کر ناشتہ کرنے لگی۔

”مجھے جانیہ ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

اماں اسے بغور دیکھ کر بولیں تو جہاز زیب کہنے لگے۔

”ہاں.....! طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ کل ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا، اس نے دوا دی ہے اور آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔“

”میں خود اسے آرام کرنے کا کہتی ہوں۔“

”بس.....! اب آپ ہی اس کا خیال رکھئے، یہ خود تو.....“

وہ یوں ہی بات آنسوؤں میں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ بھی جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے ان کے پیچھے

”میں آفس جا رہا ہوں۔ اگر کوئی پرالیم ہو تو مجھے فون کر لینا۔“

”جی.....!“

”چلو.....! اب آرام سے سو جاؤ۔“

”جی.....!“

”کیا جی.....؟ چلو فوراً لیٹو.....!“

انہوں نے رعب سے کہا تو وہ جلدی سے بیڈ پر آگئی اور کچھ سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ بے

ساختہ نہس پڑے۔

”اگر ایسی نظروں سے دیکھو گی تو میں آفس نہیں جاؤں گا۔“

اس نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

”اوکے.....! میں چلوں۔“

انہوں نے کہا تو وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

”اللہ حافظ.....!“

پھر انہیں جاتے ہوئے محسوس کیا، اس کے بعد پچیس منوں میں۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی، اس لئے پل

میں بے خبر ہوگئی۔

اماں کو غالباً جہاز زیب منع کر گئے تھے، اس لئے انہوں نے اسے اٹھایا نہیں۔ البتہ دوپہر کے کھانے کے

لئے اٹھانے کے لئے آگئیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسے زیادہ دیر تک بھوکا نہیں رہنا چاہئے تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو

کر کمرے سے نکلی تو فون کی تیل کی کرلا بی کی طرف آگئی۔ دوسری طرف روہیب تھا۔ اس کی آواز سننے ہی وہ کہنے

لگا۔

”سنو.....! اپنی امانت لینے کب آ رہی ہو.....؟“

اس کا اشارہ غالباً تصویر کی طرف تھا اور وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

”کبھی نہیں.....!“

”ٹھیک ہے.....! تو میں جہاز زیب کو دے دیتا ہوں۔“

وہ اطمینان سے بولا۔

”نہیں.....! تم ایسا نہیں کرو گے۔“

”کون روک سکتا ہے مجھے.....؟“

”میں جاتی ہوں، تمہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن.....“

وہ قصداً خاموش ہوگئی، پھر اماں کے پکارنے پر جلدی سے ریسپور کھ کر برآمدے میں آگئی جہاں تخت

پر دسترخوان بچھا کر انہوں نے کھانا رکھ دیا تھا۔

”جہانگیر کہاں ہے؟“

وہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”جہانگیر کو خیر سے نوکری مل گئی ہے۔“

”اچھا!“

اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

”جہانزیب نے مجھے نہیں بتایا۔“

”بھول گیا ہوگا۔“

”ہاں!“

اس کے سینے سے یوں ہی گہری سانس خارج ہوئی۔ پھر وہ کھانے میں مصروف ہو گئی۔

”یہ چٹنی لو! تمہارے لئے بنائی ہے۔“

اماں نے پلیٹ اس کے آگے رکھی تو وہ تادم ہی ہو کر بولی۔

”اماں! آپ مجھے اٹھا دیتیں، اکیلے ہی سب کام کرتی رہیں۔“

”تمہارے آنے سے پہلے بھی تو کیا کرتی تھی اور میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو بہوؤں کے

آتے ہی پلنگ سنہال لیتی ہیں۔ مجھ سے تو فارغ بیٹھا ہی نہیں جاتا اور پھر گھر کا کام ہی کتنا ہوتا ہے؟“

”پھر بھی۔“

”بس! تمہیں ابھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خیر سے فارغ ہو جاؤ، پھر سب تمہیں ہی کرنا

ہے۔“

پھر گئے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بولیں۔

”اللہ بخشے میری ساس کو، بہت نیک خاتون تھیں۔ جہاں بہوئیں اُمید سے ہوئیں، وہ نازخراے اٹھاتیں

کی کیا بتاؤں۔؟“

”اماں! آپ بھی تو میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔“

وہ غلوں سے بولی۔

”میری ساس کے مزاج میں نرمی تھی، غصہ تو انہیں آتا ہی نہیں تھا۔“

”اماں! آپ بھی تو۔۔۔۔۔“

”نہیں دلہن! مجھے غصہ بہت آتا ہے۔“

اماں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑیں۔

”کتنی بار تم پر گہڑ چکی ہوں۔ یوں کہو کہ تم اچھی ہو جو میرے گڑنے کا برا نہیں مانتیں۔“

اگر کوئی اس وقت ساس، بہو کی باتیں سن لیتا تو اپنی بے ساختہ ہنسی کو کبھی نہیں روک سکتا تھا۔ دونوں بڑی

ایمانداری اور صاف گوئی سے اپنی غلطیوں اور دوسرے کی اچھائیوں کا اعتراف کر رہی تھیں۔

ویسے بھی ساس بہو کے درمیان رنجش کا باعث کوئی تیسرا فرد ہوتا ہے اور خوش قسمتی سے یہاں ایسا کوئی

تیسرا تھا ہی نہیں۔ کھانے کے بعد اماں اسے پھر آرام کرنے کی تاکید کرتے ہوئے خود نماز کی تیاری کرنے لگیں اور وہ

ان کے کہنے پر اپنے کمرے میں آ تو گئی، لیکن سونے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ویسے بھی ابھی سو کر اٹھنی تھی۔

کچھ دیر تک یوں ہی کمرے میں ادھر سے ادھر بھٹکتی رہی، پھر ٹیبل سے میگزین اٹھا کر بیڈ پر آ بیٹھی۔

اصل میں تنہا ہوتے ہی ذہن اُلجھنے لگتا تھا۔ زد و ہیبت کی باتوں کو وہ محض دھمکی پر محمول نہیں کر سکتی تھی۔ جس طرح وہ کمینگی

پر اتر آتا تھا، اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ تصویر جہانزیب کو دکھا کر کوئی ایسی داستان سنائے جس سے جہانزیب اس

سے متفرق ہو جائیں۔

”میں کیا کروں۔؟“

وہ اس وقت تنجیدگی سے اس مسئلے کا حل سوچنا چاہتی تھی کہ جہانزیب آگئے۔ یہ ان کے آنے کا وقت

نہیں تھا، اس لئے وہ کچھ چونک کر ٹوٹتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری۔؟“

انہوں نے پوچھا تو وہ قدرے مطمئن ہو کر بولی۔

”ٹھیک ہوں۔!“

”میرے جاتے ہی کام سے تو نہیں لگ گئی تھیں۔؟“

”نہیں بھئی۔۔۔۔۔ اس وقت کی سوئی ابھی اٹھی ہوں۔ آپ کھانا کھائیں گے۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔!“

وہ کپڑے لے کر باتھ روم میں چلے گئے۔ اور جب کپڑے تبدیل کر کے واپس آئے تو اس کے برابر

لیٹتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”کیا پڑھ رہی تھیں۔؟“

”ابھی تو لے کر بیٹھی ہوں۔“

وہ گھٹنوں پر سر رکھے میگزین کے صفحات اُلٹتے ہوئے بولی۔

”اب تم تو سوؤ گی نہیں۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔!“

”اچھا! تو میں سو رہا ہوں۔ مجھے پانچ بجے اٹھادینا۔“

”کہیں جاتا ہے کیا؟“
وہ یوں ہی پوچھ گئی۔

”ہاں.....! زوہیب نے بلایا ہے۔ اسی کی طرف جاؤں گا، بلکہ تم بھی چلنا۔“

زوہیب کی طرف جانے کا سن کر ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس لئے کوئی جواب نہیں دے سکی اور وہ اس کی خاموشی کو راضا مندی سمجھ کر روٹ بدل گئے۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح گم سم بیٹھی رہی، پھر پہلے کن اکیوں سے انہیں دیکھا، اس کے بعد نظر اھر کھلے میگزین پر نظریں دوڑانے لگی گوکہ ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا پھر بھی نظریں ”آپ کے مسائل“ پر ٹھہر گئیں۔ کبھی وہ یہ کالم بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتی تھی۔ خاص کر ایسے خطوط جن میں لڑکیاں اسی جیسے مسائل سے دوچار ہوتی تھیں۔

اسے یاد آیا، وہ ایسے خطوط پڑھ کر لڑکیوں کو بہت برا بھلا کہا کرتی تھی کہ وہ کیوں لڑکوں کو خط لکھنے اور تصویریں دینے کی غلطیاں کرتی ہیں اور اب انجانے میں ہی سہی، وہ خود یہ غلطی کر گئی تھی تو اسے اپنی طرح وہ ساری لڑکیاں بے قصور نظر آنے لگیں۔

”پتا نہیں کس کے ساتھ کیا حالات رہے؟“

وہ سوچتی ہوئی اس کالم کو سرسری انداز میں پڑھنے لگی، لیکن تیسرے خط نے اس کی پوری توجہ سمیٹ لی۔
پہلے گزشتہ محبت یا غلطی کا اعتراف تھا، پھر لکھا تھا۔

”اب میری شادی ہو چکی ہے، لیکن وہ اب بھی میرا چچا نہیں چھوڑتا۔ مجھے دھمکیاں دیتا ہے۔ اگر میں نے قطع تعلق کر لیا تو وہ میرے خطوط اور تصویریں میرے شوہر کو دکھا دے گا۔ مجھے بتائیے باجی.....! میں کیا کروں.....؟ کیا ایک بار اس سے مل لوں؟“

جواب میں لکھا تھا۔

”اس سے ملنے کی غلطی مت کیجئے، بلکہ اپنے شوہر کو اعتماد میں لے کر انہیں تمام حالات بتا دیجئے۔“

اس جواب پر وہ خاصی مایوس ہو کر جہانزیب کی طرف دیکھنے لگی۔ گوکہ اس نے انہیں ہر لحاظ سے بہت اچھا پایا تھا، لیکن اب تو اس خیال سے ہی اس کی جان جاتی تھی کہ
”اگر کبھی انہیں خبر ہو گئی تو؟“

اور اس ”تو.....؟“ کے آگے تو وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔

”آخر خاتون نے اتنا احتقانہ مشورہ کیوں دیا.....؟“

وہ مایوس ہوئی تو جل کر سوچنے لگی۔

”مرد میں اتنا ظرف اور حوصلہ کہاں ہوتا ہے بھلا.....؟ اپنی شخصیت کو کتنا ہی نکھار کر پیش کریں، اندر سے ایسے ہی کھوٹے ہوتے ہیں۔“

”سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

اس کے اندر سے آواز آئی تھی۔

”لیکن میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔“

وہ عاجزی سے بڑبڑائی۔

”یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ زوہیب اپنی طرف سے کوئی داستان گھڑ کر سنائے، تم سب کچھ سچ بتا دو۔ اس طرح معافی کا کچھ امکان ہے، ورنہ اگر پہل زوہیب کی طرف سے ہو گئی تو پھر جہانزیب تمہاری کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔“

”ہوں.....! یہ تو ہے.....!“

اس نے پڑ سوچ انداز میں سر ہلایا پھر وہیں سے میگزین نیکل پر پھینک کر لیٹ گئی۔ سامنے وال کلاک پر نظر پڑی۔ ابھی صرف تین بجے تھے اور جہانزیب نے پانچ بجے اٹھانے کے لئے کہا تھا۔ اس دوران اس نے ایک تو فو کو جہانزیب سے بات کرنے کے لئے مکمل طور پر تیار کیا، دوسرے آریا پار سوچتے ہوئے ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے اپنے اندر حوصلہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ پھر شام میں جب جہانزیب تیار ہونے لگے تو وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔

”کہاں جا رہے ہیں؟“

”بتایا تو تھا کہ زوہیب کے پاس جاتا ہے۔ تم بھی ساتھ چلو.....! تھوڑی آؤ ٹنگ ہو جائے گی۔“

انہوں نے کہا تو وہ سوچ کر بولی۔

”آؤ ٹنگ کے لئے میں ضرور جانا چاہتی ہوں، لیکن زوہیب کے گھر نہیں۔“

”کیوں.....؟“

”بس.....!“

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے، پھر ہلکے سے کندھے جھٹک کر بولے۔

”تو ایسا کرتے ہیں، آؤ ٹنگ کے لئے کل چلیں گے۔ آج کیونکہ اس نے بلایا ہے تو.....“

”نہیں.....!“

وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

”آپ وہاں نہیں جائیں گے۔“

”کم آن جانیہ.....! میرا ایک ہی تو دوست ہے۔“

”اسی لئے تو آپ کو دوستوں کی پہچان نہیں۔“

”کیا مطلب؟ یعنی اب تم مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ.....“

”زوہیب دوست نہیں، آستین کا سانپ ہے۔“

اس نے فوراً ان کی بات مکمل کی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، اپنے کپڑے لے کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ کپڑے تبدیل کر کے واپس آئی تو وہ جیسے انتظار میں بیٹھتے تھے، اسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے، تم رواجی بیوی بن رہی ہو۔“

”کیا مطلب.....؟“

”تمہیں اگر میرا زوہیب سے میل جول پسند نہیں ہے تو صاف کہو، لیکن اس کے بارے میں ایسی باتیں

مت کرو۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔“

”چلیں.....؟“

وہ ان کی بات نظر انداز کر کے اپنے سر اپنے پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”کہاں چلو گی.....؟“

وہ یوں بولے جیسے جبراً اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوئے ہوں۔

”کہیں بھی، کسی ایسی جگہ جہاں زیادہ شور و ہنگام نہ ہو۔“

وہ بظاہر خوش گوار لہجے میں بولی اور ان سے پہلے ہی کمرے سے نکل آئی۔ وہ اس کی خواہش پر اسے ساحل پر لے آئے۔ کچھ دیر تک تو ان کا موڈ یوں ہی بگڑا بگڑا سا رہا، لیکن پھر آپ ہی آپ ٹھیک ہو گئے۔ شاید اس لئے کہ وہ اچانک بھیجی بھیجی نظر آنے لگی تھی اور وہ یہی سمجھ کر ان کے روئے کو محسوس کر رہی ہے۔

”تھک گئی ہو.....؟“

وہ اسے رکتے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”ہاں.....! آئیے، وہاں بیٹھتے ہیں۔“

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”میرا خیال ہے، کیفے چلتے ہیں، وہاں چائے بھی پی لیں گے۔“

”چلیں.....!“

وہ ان کے ساتھ چل پڑی۔ پھر چائے آنے تک وہ یوں ہی میز کی شفاف سطح پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی رہی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں اور کچھ اضطرابی کیفیت میں ہونٹ کبھی نیم وا ہوتے اور کبھی وہ سختی سے بھیجی لیتی، اور اس وقت پہلی بار انہوں نے سرسری انداز کی بجائے یقین سے سوچا کہ وہ اوّل روز سے ان کے لئے معہ بنی ہوئی ہے اور وہ اب تک اسے سمجھنے سے قاصر رہے

ہیں۔

”چائے لوٹا.....!“

انہوں نے متوجہ کیا تو وہ ذرا سی چونک کر سیدھی ہو بیٹھی، پھر چائے کا کپ اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔

”آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں نے زوہیب کو آستین کا سانپ کیوں کہا.....؟“

”کیا واقعی تم اسے ایسا سمجھتی ہو.....؟“

انہوں نے منجھب ہو کر پوچھا۔

”صرف سمجھتی نہیں ہوں، بلکہ.....“

”دیکھو جانیہ.....!“

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”زوہیب جیسا بھی ہے، میرا دوست ہے۔ اس کی تمام خامیاں میری نظر میں ہیں اور میں نے تمہیں بھی

بہت پہلے بتا دیا تھا کہ میرے اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ اپنی رنگین مزاجی

کے باعث کچھ اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ لیکن اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر تمہیں یہ خدشہ ہے کہ اس کی صحبت

میں کہیں میں نہ بگڑ جاؤں تو میری جان.....! جب میں بگڑنے والی عمر میں نہیں بگڑا تو اب.....“

وہ قصد آبات اُدھوری چھوڑ کر سکرانے تو وہ اُلجھ کر بولی۔

”آپ پہلے میری بات تو سنیں.....!“

”زوہیب کے متعلق کچھ نہیں سنوں گا۔“

وہ جتنی انداز میں بولے اور اس کے خاموشی اختیار کر لینے پر قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”تمہاری زوہیب سے بس سرسری ملاقات ہی تو ہوئی ہے، کبھی آرام سے اس سے بات کر کے دیکھنا۔

میں محسوس کرتا ہوں، اس کے اندر ایک اچھا انسان موجود ہے۔“

”ہوگا۔“

وہ اُکٹا کر بولی اور ٹھنڈی چائے ایک ہی سانس میں پی کر اپنے اطراف یوں دیکھنے لگی جیسے اچانک دل

اُچاٹ ہو گیا ہو۔

”چلیں.....؟“

انہوں نے اس کی بے زاری کو فوراً محسوس کر لیا۔

”ہاں.....!“

اس نے اُٹھنے میں دیر نہیں کی۔

واپسی کا تمام راستہ خاموشی سے کٹا۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ وہ تو اندر ہی اندر جزبہ ہوتی رہی

کاب جبکہ اس نے اپنے آپ کو سب کچھ بتانے پر تیار کر لیا تھا تو وہ سننے پر آمادہ کیوں نہیں ہو رہے؟ اور ان کی خاموشی جتانے والی تھی تاکہ آئندہ وہ زوہیب کے خلاف کوئی بات نہ کرے، اور اس روز کے بعد سے وہ خاصی محتاط ہو گئی۔ وہ خود سے زوہیب کا ذکر کرتے تو بس سن لیتی، جبکہ زوہیب کا وہی معمول تھا۔ ہر دوسرے دن فون کرنا نہ بھولتا۔ یوں جیسے یہ بھی اس کے معمولات میں شامل ہو۔ وہی پرانی باتیں دہراتا، پھر ملنے پر اصرار اور اس کے انکار پر دھمکی۔ ابھی تک اس نے اپنی دھمکی پر عمل نہیں کیا تھا۔ جس سے اب وہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ محض اسے دھمکاتا ہے، ورنہ اس میں اتنی جرأت نہیں ہے۔

اور اب ایک طرح سے وہ مطمئن سی ہونے لگی تھی کہ اسی روز وہ جہانزیب کے ساتھ گھر تک آ گیا۔ خاصے بے تکلفانہ انداز تھے اس کے، جس سے وہ سمجھ گئی کہ وہ پہلے بھی یہاں آتا رہا ہے۔ وہ کھانے میں سب کے ساتھ شریک ہوا۔ اس کے بعد جہانزیب اسے چائے کا کپہہ کر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ اس نے انتہائی بے دلی سے چائے بنائی اور جب لے کر ڈرائنگ روم میں آئی تو ناگواری کا اظہار اس کے ہر انداز سے ہو رہا تھا۔

”چینی؟“

اس نے پیشانی پر مزیں شکنوں کا اضافہ کر کے زوہیب سے پوچھا تو وہ جہانزیب کا خیال کئے بغیر بولا۔

”نہ بھی ڈالیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”اس کی باتوں کا براست ماننا چاہیے! یہ ایسا ہی ہے۔“

جہانزیب فوراً اس کی طرف داری میں بول پڑے۔

”ایسا ہی سے کیا مراد ہے آپ کی؟“

وہ چائے بنانے میں مصروف رہ کر بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”شوخ اور بذلہ رخ!“

”اچھا!“

وہ استہزائیہ ہنسی۔ پھر ذرا سی گردن موڑ کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

”اور کیا کیا خوبیاں ہیں تم۔ میرا مطلب ہے آپ میں؟“

”اب میں خود اپنی کیا تعریف کروں خاتون محترمہ؟“

وہ انکساری کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا تو جہانزیب ہنس پڑے۔

”ویسے میں تمہاری کافی تعریف کر چکا ہوں۔“

”جی ہاں! جہانزیب نے مجھے آپ کے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے۔“

وہ چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”بس! یہ واحد شخص ہے جو میری تعریف کرتا ہے، ورنہ تو لوگ مجھے دُور سے دیکھ کر ہی راستہ بدل

جاتے ہیں۔“

گو کہ اس نے اپنے بارے میں سچ بولا تھا، لیکن انداز جہانزیب کی ہمدردی سمیٹنے والا تھا، جس میں وہ

کا مایاب رہا۔ جہانزیب اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔

”چھوڑو یار! کتنی بار کہا ہے، لوگوں کی پرواہ مت کیا کرو۔“

”کس قدر مکار ہے۔“

اس نے جل کر سوچا اور اٹھ کر جانے لگی تو جہانزیب نے پکار لیا۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“

وہ کچھ نہیں بولی، بس سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”بیٹھ جاؤ! زوہیب خاص طور سے تم سے ملنے آیا ہے۔“

”مجھ سے؟“

اس نے بے تحاشہ دھڑکتے دل پر بے اختیار ہاتھ رکھا۔

”جی! اس روز تو آپ سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔“

وہ اس کی بدلتی رنگت دیکھ کر محظوظ ہو کر بولا، تو وہ محض خود کو سہارا دینے کی خاطر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

تب وہ کہنے لگا۔

”میں نہ صرف آپ سے ملنے، بلکہ آپ کو دعوت دینے آیا ہوں۔ کل رات کا کھانا آپ دونوں۔“

”نہیں!“

وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بے اختیار بول پڑی تو وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر جہانزیب کو

دیکھنے لگا۔

”اصل میں جانیہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

جہانزیب کا معذرتی لہجہ اسے قطعاً پسند نہیں آیا، پھر یہاں سے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ جہانزیب

اُٹھتے ہوئے بولے۔

”بہر حال، مجھے تمہاری دعوت جی جان سے قبول ہے۔ البتہ تم جانیہ کو آمادہ کرلو۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”سگریٹ۔۔۔ غالباً کمرے میں رکھ آیا ہوں۔“

وہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے تو وہ اسے دیکھ کر خاصی بے تکلفی سے مسکرایا۔

”کس قدر ذلیل انسان ہو تم۔؟“

وہ تلخ ہو کر تاسف سے بولی۔

”اس شخص کو دھوکہ دے رہے ہو، جو تمہارے بارے میں کوئی غلط بات سننا ہی نہیں چاہتا۔“

”گویا تم اسے میرے خلاف بہکانے کی کوشش کر چکی ہو.....؟“

وہ اتنی ڈھٹائی سے ہنس کر بولا کہ اس کا دل چاہا کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

”میں ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گی، البتہ کسی دن انہیں تمہارا اصلی روپ ضرور دکھاؤں گی۔“

”کسی دن کیوں.....؟ آج ہی، بلکہ ابھی۔“

”شٹ اپ!“

وہ دبی دبی آواز میں چیخنی۔

”اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔“

اس پر رتی برابر اس کی باتوں کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس وہ جیسے اس کی حالت زار کا لطف لے

رہا تھا۔

”اور اس وقت تو میں تمہارا مہمان ہوں۔ کم از کم مہمان کے ساتھ تو ایسا سلوک نہ کرو، اور کچھ نہیں تو مسکرا

کر دیکھ ہی لو۔“

”میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر!“

اس وقت جہانزیب آگے اور کیونکہ وہ دروازے ہی سے کچھ کہتے ہوئے آئے تھے، اس لئے اس کی

بات سن نہیں سکے، نہ ضرور پوچھتے کہ کس پر لعنت بھیج رہی ہو.....؟“

”تمہاری بیوی مجھ سے خاصی تنفر ہے جہانزیب! لگتا ہے تم نے انہیں میرے بارے میں کچھ زیادہ

ہی بتا دیا ہے۔“

اس کی بات سن کر جہانزیب تنبیہی نظروں سے اسے دیکھنے لگے تو وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر بولی۔

”میں کیوں تنفر ہونے لگی.....؟“

”اگر تنفر نہیں ہیں تو میری دعوت قبول کر لیجئے۔“

جہانزیب نے اسے اشارہ بھی کیا کہ مروتا ”ہاں“ کہہ دے، لیکن وہ نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے

اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی، اور وہ اٹھ کر آ تو گئی تھی، لیکن اب اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ کیونکہ وہ صوبہ سے کچھ

بعید نہیں تھا کہ وہ بد میں اسی وقت اپنی دھکیوں پر عمل کر ڈالتا۔

کچھ دیر تک وہ اضطرابی کیفیت میں کمرے میں ٹھہرتی رہی، پھر ایک میزین اٹھا کر بیڈ پر آ بیٹھی اور

بظاہر اس کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔ لیکن اس کا سارا دھیان جہانزیب کی طرف تھا کہ وہ کب آتے

ہیں.....؟

اور جہانزیب کافی دیر بعد غالباً زویب کو رخصت کر کے آئے تو کن اکھیوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”مجھے تم سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔“

انہوں نے فحشی بھرے لہجے میں کہا تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر بھی ہمت کر کے ان کی طرف

دیکھا تو وہ کہنے لگے۔

”آخرا اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ تم بے شک اس کے گھرنہ جانتیں، میں کل اس سے کوئی بہانہ کر سکتا تھا۔

لیکن اس وقت اگر تم ہامی بھر لیتیں تو تمہارا کیا جاتا.....؟ بیچارہ اتنا مایوس اور آزرده ہو کر گیا ہے۔“

”ہونہید.....! بیچارہ.....؟“

اس نے سوچا اور دوبارہ میگزین دیکھنے لگی۔

”بہر حال، میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ کل ہم ضرور آئیں گے۔“

وہ اپنی جگہ پر لیٹنے تو جتنی انداز میں کہہ کر اس کی طرف سے منہ موڑ کر لیٹے۔

☆.....☆.....☆

دانیال کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ نومی اور ردا اس کے پاس آ بیٹھے۔ دونوں

بچے اس سے کافی مانوس ہو گئے تھے۔ وہ بھی ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتی تھی۔ پھر لچچی سے ان کی باتیں سنتی

اگلی پوچھنے لگی۔

”یہ بتاؤ.....! اپنی کلاس میں فرسٹ کون آتا ہے.....؟“

”میں!“

ردا نے فوراً ہاتھ اٹھایا۔

”چاچی.....! میں فرسٹ آتی ہوں۔“

”اچھا.....! اور تم.....؟“

وہ نومی کو دیکھنے لگی۔

”یہ تو حق بھی نہیں آتا چاچی.....! کبھی 6th اور کبھی 7th۔“

ابھی بھی ردا نے جواب دیا۔

”کیوں نومی.....؟ تم بڑے جتنے نہیں ہو کیا.....؟“

اس نے نومی سے پوچھا تو وہ منہ بنا کر بولا۔

”پڑھتا ہوں چاچی.....! ردا سے زیادہ پڑھتا ہوں۔“

”پھر فرسٹ کیوں نہیں آتے.....؟“

”کیونکہ میں اسکول ٹائم کے بعد پھر سے ٹیوشن نہیں پڑھتا۔ اس لئے پھر مجھے کم نمبر دیتی ہیں۔“
نوی کی بات سن کر وہ حیران رہ گئی کہ اتنا سا بچہ بھی یہ باتیں سمجھتا ہے۔

”یہ تو زیادتی ہے۔“

اس نے کہا، تب ہی دانیال آگیا۔

”السلام علیکم۔۔۔!“

دانیال کی نظریں اس پر تھیں۔

”چاچو آگئے۔۔۔! چاچو آگئے۔۔۔!“

نوی اور دانیال پر اچھلنے لگے۔

”ہاں۔۔۔! چاچو آگئے۔ بہت تھکے ہوئے آئے ہیں، ابھی آرام کریں گے۔ چلو جاؤ۔۔۔!“

دانیال نے دونوں بچوں کو اٹھا کر بیڈ سے اُتارا اور ان کے احتجاج کرنے کے باوجود انہیں کمرے سے

بھیج کر دروازہ بند کر کے پلٹ کر شرارت سے ثانیکو دیکھا تو وہ بھیچپ کر بولی۔

”یہ کیا حرکت ہے۔۔۔؟“

”ارے بیوی۔۔۔!“

وہ آکر اس کے زانوں پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

”ہا۔۔۔! سچ آج آرام مل گیا۔ تمہارا چہرہ دیکھ کر سارے دن کی تھکن اُتر گئی۔“

”اچھا۔۔۔!“

وہ ذرا سانس کر بولی۔

”پھر تو میں سیدھی جنت میں جاؤں گی۔“

”وہ کیسے۔۔۔؟“

دانیال نے قصداً انجان بن کر پوچھا۔

”وہ ایسے کہ جس عورت کا شوہرا سے دیکھ کر خوش ہو جائے، تو وہ عورت جنت میں جائے گی۔“

اس نے کہا تو وہ مظلوظ ہو کر پوچھنے لگا۔

”اور جس مرد کو دیکھ کر اس کی بیوی خوش ہو جائے۔۔۔؟“

”تو بھی بیوی جنت میں جائے گی۔“

وہ فوراً بولی تھی۔

”اور مرد۔۔۔؟“

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔

”جناب۔۔۔! جنت میں مردوں کا کیا کام۔۔۔؟“

اس کی برجستگی پر وہ بے ساختہ ہنسنے لگا اس پر چھٹنا چاہتا تھا کہ وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔

☆ ☆ ☆

فون کی تھنی مسلسل بج رہی تھی۔ عباد اسی وقت آفس سے آیا تھا، جوتے اُتار رہا تھا اور پتا نہیں بتول بیگم

اور اسد کہاں تھے جو کوئی فون نہیں اٹھا رہے تھے۔؟ آخر اسی کو آنا پڑا۔

”ہیلو۔۔۔!“

”راہجہ بات کر رہی ہوں۔“

ادھر سے راہجہ کی آواز سن کر عباد ایک دم ڈھیل پڑ گیا۔

”ہاں راہجہ۔۔۔! کیا بات ہے۔؟ سب ٹھیک تو ہے ناں۔۔۔؟ میرا مطلب ہے، شوبی۔۔۔؟“

”شوبی بالکل ٹھیک ہے۔“

وہ بے حد سہاٹ تھی۔

”پھر۔۔۔؟“

”پھر یہ کہ آپ اپنے بھائی کو لگام ڈال کر رکھیں۔ جب سارے رشتے ختم ہو گئے تو پھر وہ کس تعلق سے

میرے گھر آنا چاہتا ہے۔۔۔؟“

راہجہ نے کہا تو وہ بلا ارادہ پوچھ گیا۔

”کون۔۔۔؟ اسد۔۔۔؟“

”اسد کے علاوہ بھی آپ کا کوئی بھائی ہے۔۔۔؟“

وہ اچانک جھج گئی تھی۔

”میں اسد ہی کی بات کر رہی ہوں۔ پہلے میرا سترہ روکا اور آج گھر چلا آیا۔۔۔؟ آخر کیوں۔۔۔؟“

”سوری راہجہ۔۔۔! مجھے نہیں معلوم کہ وہ گھر سے باہر کیا کرتا پھرتا ہے۔۔۔؟“

وہ واقعی پکرا گیا تھا۔

”اب تو معلوم ہو گیا ناں۔۔۔؟“

وہ تیکھے انداز میں بولی تھی۔

”ہاں۔۔۔! میں کوشش کروں گا اسے سمجھانے کی۔ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی اس نے تمہارے

ساتھ۔۔۔؟“

”وہ اور کبھی کیا سکتا ہے۔۔۔؟ نہ صرف میرے ساتھ، بلکہ راستے میں ابا کو بھی نہیں چھوڑا اس نے، اور

یہ آخری بار ہے عابد..... اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“

رابعہ نے اپنی بات کہہ کر فون پٹخ دیا تھا۔ وہ کتنی دیر وہیں کھڑا کھولتا رہا۔ خود پر قابو پانا چاہا لیکن یہ ممکن نہیں ہوا تو بتول بیگم کو پکارا۔

ہوئے ان کے کمرے میں آیا اور اسد کو ان کے ساتھ بیٹھ دیکھ کر غصے سے کہنے لگا۔

”امی.....! پوچھیں اس سے، یہ رابعہ کے گھر کیوں اور کیا کرنے گیا تھا.....؟“
 ”ہائیں.....؟“

بتول بیگم اُچھل پڑیں۔ اسد کو دیکھا تو وہ شپٹا کر بولا۔

”مم..... میں کیا کرنے جاؤں گا.....؟ ہاں.....! شوبی کی یاد آ رہی تھی، اس سے ملنے گیا تھا۔“

”شوہنی کا باپ میں ہوں، میں.....! تم کون ہوتے ہو.....؟“

عباد و دھار ا تھا۔

”چا چا ہوں میں.....!“

”کوئی چاچا و اچا نہیں ہے اس کا۔“

عباد بالکل ہی آپ سے باہر ہو گیا تھا۔

”امی.....! آپ سمجھالیں اسے۔ میں نے صرف اس کی وجہ سے اپنے بچے کو خود سے دُور کیا ہے۔ میں

”ہیں چاہتا اس کا سایہ بھی اس پر پڑے۔“

”سن رہی ہیں اماں.....! اب میں اتنا گیا گزرا ہوں.....؟“

اسد نے ماں کی ہمدردی حاصل کرنی چاہی۔

”ہاں.....! ہوم کئے نذرے۔ میں نے کہہ دیا ہے رابعہ سے، تمہارے خلاف جو چاہے کارروائی

لڑے۔ آپ ہی سن میں امی.....! اٹھوں نے لونی چوڑیاں بیس پہن ریس، حوالات میں بند کروادیں گے اسے، پھر مجھ سے مت کہئے گا۔“

وہ پیر پختا ہوا چلا گیا۔ بتول بیگم کڑے تیوروں سے اسد کو دیکھنے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

لے اسے یہ خوش خبری بتائی کہ وہ باپ بننے والا ہے تو وہ چکرائی ضرور، لیکن اس کے سامنے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے

”سچ.....! سچ کہہ رہے ہوں؟“

”بالکل سچ.....!“

وہ بے حد خوش تھا۔

”مبارک ہو.....! ثانیہ کہاں ہے.....؟“

سیما کو ایک دم ثانیہ کا خیال آیا۔

”ثانیہ کو اس کی اماں نے روک لیا ہے بھابی.....! اصل میں ڈاکٹر نے انہی بہت احیاء کرے لوہا ہے
 جھک کر دیکھو۔“

اپنی دلیہ بھال لریں گی۔

”اگلا گھر گھر“

پاپس ہوئے ہو.....! وہ بوری کورت پیدا دیکھ بھاس کرے.....! کے تراوا کے.....!

وہ شکر و پنج میرا

”چلو.....! کل لے آتا،

۔ ڈاکٹر نے بتایا ہوگا، پھل جو سبز وغیرہ۔“

”جی جی.....! یہی کہا ہے ڈاکٹر نے۔“

”تو بھی.....! ہم خواجہ صاحب پر بوجھ“

راجہ صاحب بے چارے کیا کیا کریں گے.....؟“

سیما جس خلوص کا مظاہرہ کر رہی تھی، اس پر وہ شبہ کر

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی.....!“

”پھر ثانیہ کا کچھ کھانے کو دل چاہے گا، تو وہ

سر آرام بھی اپنے ہی گھر میں ملتا ہے۔

سیمائے مزید لہا لو وہ فاس ہو سرائی وقت ثانیہ کو یسے پہل پڑا تھا، اور اس نے جاتے ہی اس کے سنا کو

”سندھ اور بلوچستان منصف اور چھوٹے ہیں بڑی سی۔“

”ٹھک رہا ہوں۔ آج رات سوئے گا۔“

اس نے غفلت میں کہہ کر فون بند کر دیا

7 8 9 10 11 12 13 14 15 16 17 18 19 20 21 22 23 24 25 26 27 28 29 30 31 32 33 34 35 36 37 38 39 40 41 42 43 44 45 46 47 48 49 50 51 52 53 54 55 56 57 58 59 60 61 62 63 64 65 66 67 68 69 70 71 72 73 74 75 76 77 78 79 80 81 82 83 84 85 86 87 88 89 90 91 92 93 94 95 96 97 98 99 100 101 102 103 104 105 106 107 108 109 110 111 112 113 114 115 116 117 118 119 120 121 122 123 124 125 126 127 128 129 130 131 132 133 134 135 136 137 138 139 140 141 142 143 144 145 146 147 148 149 150 151 152 153 154 155 156 157 158 159 160 161 162 163 164 165 166 167 168 169 170 171 172 173 174 175 176 177 178 179 180 181 182 183 184 185 186 187 188 189 190 191 192 193 194 195 196 197 198 199 200 201 202 203 204 205 206 207 208 209 210 211 212 213 214 215 216 217 218 219 220 221 222 223 224 225 226 227 228 229 230 231 232 233 234 235 236 237 238 239 240 241 242 243 244 245 246 247 248 249 250 251 252 253 254 255 256 257 258 259 260 261 262 263 264 265 266 267 268 269 270 271 272 273 274 275 276 277 278 279 280 281 282 283 284 285 286 287 288 289 290 291 292 293 294 295 296 297 298 299 300 301 302 303 304 305 306 307 308 309 310 311 312 313 314 315 316 317 318 319 320 321 322 323 324 325 326 327 328 329 330 331 332 333 334 335 336 337 338 339 340 341 342 343 344 345 346 347 348 349 350 351 352 353 354 355 356 357 358 359 360 361 362 363 364 365 366 367 368 369 370 371 372 373 374 375 376 377 378 379 380 381 382 383 384 385 386 387 388 389 390 391 392 393 394 395 396 397 398 399 400 401 402 403 404 405 406 407 408 409 410 411 412 413 414 415 416 417 418 419 420 421 422 423 424 425 426 427 428 429 430 431 432 433 434 435 436 437 438 439 440 441 442 443 444 445 446 447 448 449 450 451 452 453 454 455 456 457 458 459 460 461 462 463 464 465 466 467 468 469 470 471 472 473 474 475 476 477 478 479 480 481 482 483 484 485 486 487 488 489 490 491 492 493 494 495 496 497 498 499 500 501 502 503 504 505 506 507 508 509 510 511 512 513 514 515 516 517 518 519 520 521 522 523 524 525 526 527 528 529 530 531 532 533 534 535 536 537 538 539 540 541 542 543 544 545 546 547 548 549 550 551 552 553 554 555 556 557 558 559 560 561 562 563 564 565 566 567 568 569 570 571 572 573 574 575 576 577 578 579 580 581 582 583 584 585 586 587 588 589 590 591 592 593 594 595 596 597 598 599 600 601 602 603 604 605 606 607 608 609 610 611 612 613 614 615 616 617 618 619 620 621 622 623 624 625 626 627 628 629 630 631 632 633 634 635 636 637 638 639 640 641 642 643 644 645 646 647 648 649 650 651 652 653 654 655 656 657 658 659 660 661 662 663 664 665 666 667 668 669 670 671 672 673 674 675 676 677 678 679 680 681 682 683 684 685 686 687 688 689 690 691 692 693 694 695 696 697 698 699 700 701 702 703 704 705 706 707 708 709 710 711 712 713 714 715 716 717 718 719 720 721 722 723 724 725 726 727 728 729 730 731 732 733 734 735 736 737 738 739 740 741 742 743 744 745 746 747 748 749 750 751 752 753 754 755 756 757 758 759 760 761 762 763 764 765 766 767 768 769 770 771 772 773 774 775 776 777 778 779 780 781 782 783 784 785 786 787 788 789 790 791 792 793 794 795 796 797 798 799 800 801 802 803 804 805 806 807 808 809 810 811 812 813 814 815 816 817 818 819 820 821 822 823 824 825 826 827 828 829 830 831 832 833 834 835 836 837 838 839 840 841 842 843 844 845 846 847 848 849 850 851 852 853 854 855 856 857 858 859 860 861 862 863 864 865 866 867 868 869 870 871 872 873 874 875 876 877 878 879 880 881 882 883 884 885 886 887 888 889 890 891 892 893 894 895 896 897 898 899 900 901 902 903 904 905 906 907 908 909 910 911 912 913 914 915 916 917 918 919 920 921 922 923 924 925 926 927 928 929 930 931 932 933 934 935 936 937 938 939 940 941 942 943 944 945 946 947 948 949 950 951 952 953 954 955 956 957 958 959 960 961 962 963 964 965 966 967 968 969 970 971 972 973 974 975 976 977 978 979 980 981 982 983 984 985 986 987 988 989 990 991 992 993 994 995 996 997 998 999 1000 1001 1002 1003 1004 1005 1006 1007 1008 1009 1010 1011 1012 1013 1014 1015 1016 1017 1018 1019 1020 1021 1022 1023 1024 1025 1026 1027 1028 1029 1030 1031 1032 1033 1034 1035 1036 1037 1038 1039 1040 1041 1042

تھیں، لیکن اس کا ذہن مسلسل کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔

جب دانیال، ثانیہ کے ساتھ آیا تو وہ ایک دم متحرک ہو گئی۔ اُٹھ کر ثانیہ کو گلے لگا کر مبارکبادی کہہ کر وہ ماں بننے والی ہے، پھر ان دونوں کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی اور باقاعدہ ہدایات جاری کرنے لگی۔
”بس ثانیہ! اب تمہیں آرام کرنا ہے۔ سڑھیاں اترنے چڑھنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، جو چیز تمہیں چاہئے ہوگی، سہیل مل جائے گی۔ سن رہی ہو ناں؟“
”جی!۔۔۔“

ثانیہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دانیال کو دیکھا تو وہ کہنے لگا۔
”صرف سننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بھابی کی باتوں پر عمل بھی کرنا ہے۔“
”بس!۔۔۔ تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ثانیہ میری بات مانتی ہے۔“
سیانے دانیال کو ٹوکا تو وہ مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

”ہاں بس!۔۔۔ آپ کی ہی مانتی ہے، مجھ بے چارے کی تو سنتی بھی نہیں ہے۔“
”ہاں!۔۔۔ بڑے بے چارے! خیر دار جو اسے تنگ کیا تو۔۔۔؟“
”میں کہاں تنگ کرتا ہوں؟ یہ مجھے تنگ کرتی ہے۔“

”اچھا بس! زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ثانیہ! تم آرام کرو۔ میں تمہارے لئے دودھ لاتی ہوں، پینا ضرور!۔۔۔“

”فکرمات کریں بھابی! میں پلا دوں گا۔“
دانیال فوراً بولا وہ اسے گھورتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کسی صورت زوہیب کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی، لیکن جہاز زیب کو بھی غالباً ضد ہو گئی تھی، جب ہی اس کا کوئی عذر نہیں سنا اور شام میں اس کے موڈ خراب کر لینے کے باوجود اسے اپنے ساتھ لے گئے، اور وہ جہاز زیب کے ساتھ اسے دیکھ کر یوں فاتحانہ انداز میں مسکرایا کہ اسے کم مانگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ کچھ روشنی روشنی سی جہاز زیب کے پہلو میں بیٹھ گئی تو وہ کہنے لگا۔

”یقین کریں، مجھے آپ کے آنے سے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔“

”بکومت!۔۔۔“

وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

”ارے!۔۔۔ آپ تو ڈانٹنے لگیں۔ خیر! آپ کو یہ حق حاصل ہے۔ میں قطعی برائیاں مانوں گا،

ہاں تو تھپڑ مار لیں۔“

اس کی ڈھٹائی پر وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی، پھر بھی کافی حد تک خود پر قابو پا کر پوچھنے لگی۔

”گھر کے باقی افراد کہاں ہیں؟“

”فقط ایک ملازم ہے جو کچن میں مصروف ہے۔“

”کیا مطلب؟“

وہ اس کی بجائے جہاز زیب کی طرف دیکھنے لگی تو انہیں بتانا پڑا۔

”اس کے والدین حیات نہیں ہیں۔ دو بڑے بھائی ہیں اور دونوں ہی ملک سے باہر ہیں۔“

”اور شادی میں نے ابھی تک کی نہیں۔“

جس طرح وہ فوراً بولا، اس طرح اس نے فوراً پوچھا۔

”کیوں؟“

”شاید اس لئے کہ میرے بارے میں سوچنے اور فکر کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ والدین کے بعد یہ کام ہماروں کو کرنا چاہئے تھا، لیکن وہ دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں مست و مگن ہیں۔ ہاں!۔۔۔ البتہ کوئی بہن ہوتی تو وہ ضرور سوچتی۔“

بات کے اختتام پر وہ ہلکے سے مسکرایا تو بس ایک پل کو اسے اس کی مسکراہٹ کے پیچھے ایک ڈکھ کی بھٹ نظر آئی تھی جو غالباً جہاز زیب نے بھی محسوس کی، جیسی کہنے لگے۔

”یار!۔۔۔ میں ہوں ناں!۔۔۔ کہو تو ابھی بینڈ بجا دیتا ہوں۔“

”اچھا!۔۔۔“

وہ ہنسا۔

”صرف بینڈ بجانے سے بات نہیں بنتی، اس کے لئے ایک لڑکی کا ہونا بھی ضروری ہے۔“

”لڑکیوں کی کیا کمی ہے؟۔۔۔ البتہ اگر تم نے کوئی آئیڈیل بنا رکھا ہے، تب مشکل ہے۔“

”آئیڈیل تو نہیں بنایا، بس سوچتا ہوں کہ لڑکی اچھی سلجھی ہوئی ہو۔“

وہ بات کرتا ہوا اُٹھ کر دیوار کے ساتھ رکھے شوکیس کے پاس چلا گیا۔ اس کی دراز میں سے غالباً

گرہٹ کا بیگ نکالا اور جب پلٹنا تو پوچھنے لگا۔

”کیا تمہاری کوئی سالی وغیرہ نہیں ہے؟“

”زوہیب!۔۔۔؟“

وہ پوری قوت سے چیخ کر تنبیہ کرنا چاہتی تھی، لیکن آواز کہیں حلق میں ہی اٹک گئی۔

”ہاں ہے!۔۔۔“

جہانزیب بڑے اطمینان سے اس کی بات کا جواب دے کر کہنے لگے۔
”مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ چکی واقعی بہت اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے اور تمہارے لئے موزوں بھی

ہے۔“

”جہانزیب.....!“

اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں یہاں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ٹک سکتی۔ پلیز، گھر چلیں۔“

”کیا ہو گیا ہے تمہیں.....؟“

جہانزیب نے اس کی کلائی تھامنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا، لیکن وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”بس.....! آپ چلیں۔“

”آخر کیوں.....؟“

”مجھ سے پوچھ رہے ہیں، کیا آپ کو ذرا احساس نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟ ایک آوارہ اور لوفر

شخص کے ساتھ میری بہن کا نام لیتے ہوئے آپ.....“

”جانیہ.....!“

انہوں نے ٹوک دیا۔

”کہنے دو یار.....! ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔“

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا تو وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے جہانزیب سے کہنے لگی۔

”آپ یہاں بیٹھنا چاہیں تو شوق سے بیٹھیں، لیکن میں جاری ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل آئی۔ گیٹ سے نکل رہی تھی کہ جہانزیب تیز قدموں سے چلتے

ہوئے اس کے پیچھے آ گئے۔

”تم انتہائی بدتمیز عورت ہو۔“

یہ کہتے ہوئے انہوں نے گاڑی کا لاک کھولا، پھر کافی دُور آنے کے بعد کہنے لگے۔

”میں نے کوئی ایسی معیوب بات تو نہیں کی تھی جو تم یوں آپ سے باہر ہو گئیں۔ وہ بھی زوہیب کے

سامنے، کیا سوچتا ہو گا وہ.....؟“

وہ اس وقت ضبط کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ جانتی تھی کہ بولے گی تو آنسو بھی چمک پڑیں گے اور پھر

کوئی بات ڈھنگ سے نہیں کی جاسکے گی، اس لئے ہونٹ بھیج کر دوسری طرف شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ جس کا بدلہ

انہوں نے یوں اُتار کر گھر کے سامنے اسے اُتار کر بغیر کچھ بتائے وہیں سے جانے کس طرف نکل گئے.....؟ اس نے

ان کی گاڑی کو موڑ مڑتے ہوئے دیکھا، پھر پوچھل قدموں سے اندر آ گئی۔

”ہائیں.....؟ ابھی تو تم گئی تھیں۔“

اس کی اتنی جلد واپسی پر اماں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے.....!“

”اور جہانزیب کہاں ہے.....؟“

”وہ کسی کام سے گئے ہیں۔“

وہ مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے زوہیب کی اتنی جرأت پر

حیرت کے ساتھ شدید غصہ بھی تھا، جبکہ جہانزیب کی باتوں اور رویے نے بے حد تکلیف پہنچائی تھی، جس سے وہ رو

رہی تھی اور رونے کے علاوہ کبھی کیا سکتی تھی.....؟

فوری طور پر ذہن کچھ بھی سوچنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بس رہ رہ کر ایک ہی خیال کہ زوہیب اس کے بعد اب

اس کی بہن کو فریب دینا چاہتا ہے اور یہ خیال ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے جھٹک سکتی۔

”میرے ساتھ جو ہوا سو ہوا، لیکن میں چکی کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

اس نے سوچا۔

رات کو اماں کھانے کے لئے بلانے آئیں اور جہانزیب کا پوچھا تو ان کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر

کے اس نے سہولت سے کھانے کو بھی منع کر دیا۔

”کچھ اچھا لگے نہ لگے، کھا ضرور لیا کرو۔ ایسی حالت میں پیٹ خالی رہے تو دل زیادہ مثلاً تا ہے۔“

اماں نے جاتے جاتے کہا۔

”جب بھوک لگے گی تو کھا لوں گی۔“

وہ بے زار سے لہجے میں بولی۔

”اچھا.....! اور ہاں، تمہارے جانے کے بعد تمہاری امی کا فون آیا تھا۔“

اماں نے اچانک یاد آنے پر بتایا۔

”کیا کہہ رہی تھیں.....؟“

”تمہاری خیریت معلوم کر رہی تھیں اور یہ کہ بہت دنوں سے تم ان کے پاس گئی نہیں۔“

”جاؤں گی کسی دن۔“

اماں کو اس کا سرسری انداز عجیب سا لگا۔ یعنی میکے کے نام پر بھی کوئی اشتیاق ظاہر نہیں ہوا تھا۔ تب قیاس

کرتے ہوئے بولیں۔

”تم بہت جلد گھبرا جاتی ہو، بہن.....! اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرو، تبھی تو طبیعت سننے لگی۔ اور یہ

جہانزیب آ جاتے تو میں اس سے کہتی ہوں کہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر تمہیں گھبراہٹ لے جائے۔“

اس نے بہت خاموشی سے ان کی بات سنی تھی۔ پھر انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔

نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا چپ چاپ کیوں میں سر چھپا کر سو جائے، لیکن وہ سوچ چکی تھی، خواہ کچھ بھی ہو، اسی وقت جہانزیب کو زور و جہیب کا اصل روپ دکھائے گی۔ اسی لئے جہانزیب کے انتظار میں بیٹھی رہی اور وہ نصف شب کے بعد آئے۔

☆ ☆ ☆

راجہ کو آفس جوائن کئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور اس مصروفیت نے اس پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اسے پراگندہ سوچوں سے نجات مل گئی تھی اور اب اسے خود پر حیرت بھی ہوتی تھی کہ اس نے کیسے بٹول بیگم کے مظالم برداشت کر لئے؟ اسے تو بہت پہلے خود ہی اسٹینڈلے لینا چاہئے تھا۔ بہر حال اب وہ مطمئن تھی۔ اس وقت آفس سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چل رہی تھی کہ اسد نے بائیک اس کے سامنے لا کر روکی۔

”کہاں تک پیدل چلو گی؟ آؤ میں چھوڑ دوں!“

وہ اس کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔ وہ ناگواری سے سر جھٹک کر سائیڈ سے نکل کر پھر چل پڑی، لیکن وہ ایک ڈھیٹ پھر بائیک قریب لے آیا۔

”بڑا خرہ ہے۔۔۔ ایک تو میں تم پر ترس کھا رہا ہوں۔“

”مجھ پر ترس کھانے کی بجائے اپنے آپ پر ترس کھاؤ۔ تمہاری بد معاشیاں تمہیں کہاں لے جائیں گی، کبھی سوچا ہے؟“

وہ چنچا کر بولی تھی۔

”سوچنے کے لئے دماغ چاہئے اور میرے پاس تو دماغ ہی نہیں۔“

اسد نے انتہائی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو دانت پیستے ہوئے اس نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

”ارے۔۔۔ سنو تو!“

وہ بائیک پر تھا۔

”تم نے کیا سوچ کر بھائی سے میری شکایت کی؟ بھائی تو خود مجھ سے ڈرتا ہے۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے؟ بھائی ڈرتا ہے تو میں بھی ڈر جاؤں گی؟ اپنا راستہ لو ورنہ۔۔۔“

”ورنہ شور مچا دو گی؟“

وہ اس کا تسخیر آڑے ہونے زور زور سے ہسنے لگا تو وہ واقعی پریشان ہو گئی۔ تب ہی ایک گاڑی اس کے بالکل قریب آن رکی۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹی، پھر گاڑی میں دانیال کو دیکھ کر فوراً دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”کون ہے؟“

دانیال نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ۔۔۔“

وہ رکتے ہوئے بولی۔

”میرا سابقہ دیور۔۔۔!“

”اوہ۔۔۔!“

دانیال سمجھ کر پوچھنے لگا۔

”پریشان کرتا ہے آپ کو؟“

”بس۔۔۔ ایسا ہی ہے۔ آپ پلیز! گھر میں ذکر مت کیجئے گا۔ اماں پریشان ہو جاتی ہیں۔“

اس نے کہا تو دانیال خاموش ہو رہا۔ پھر بقیہ راستہ خاموشی میں کٹا۔ گھر پر اترتے ہوئے اس نے دانیال کو اندر آنے کو کہا، لیکن وہ پھر آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ وہ اندر آ گئی۔ اماں شو بی کو دیکھ کر ہی تھیں۔ خواجہ صاحب وہیں

”ہو رہے تھے۔ وہ سلام کرتے ہوئے ان کے پاس بیٹھی تو وہ پوچھنے لگے۔

”بیٹا۔۔۔ تمہیں آنے جانے میں یا آفس میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“

”نہیں بابا۔۔۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے، اور اگر ہو گا بھی تو اب میں گھبرا کر بھاگوں گی نہیں۔ میں نے سوچ لیا

”۔۔۔“

اس نے جی داری کا مظاہرہ کیا تو خواجہ صاحب خوش ہو گئے۔

”شباباش بیٹا۔۔۔ میں تمہارے منہ سے یہی سنا چاہتا تھا۔ میری بیٹی اب بہادر بن گئی ہے۔“

”کمزور تو میں پہلے بھی نہیں تھی بابا۔۔۔ بس۔۔۔ مجھے رشتوں کا پاس تھا۔“

اس کے دل میں میس ہی اٹھی تھی۔

”میں جانتا ہوں بیٹا۔۔۔ رشتوں کا پاس رکھنے والے کمزور نہیں ہوتے، بلکہ اصل بہادری ہی یہی ہے،

کہ لاکھ انسان کو خود اپنے ساتھ جگ کرنی پڑتی ہے۔ اپنی ”میں“ کو مارنا آسان نہیں ہے، جو اپنی ”میں“ کو شکست

دے چکے ہیں، وہی بہادر کہلاتے ہیں۔ کیوں بیگم؟“

خواجہ صاحب نے کہتے ہوئے اچانک بیگم کو مخاطب کیا تھا۔

”پتا نہیں میاں۔۔۔ آپ کی باتیں آپ کی بیٹی ہی سمجھ سکتی ہے۔ اسی سے پوچھیں، ٹھیک کہہ رہے ہیں یا

”؟“

اماں نیکیں سے شو بی کا منہ صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”ابا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں۔۔۔!“

وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر شوٹی کو اٹھانا چاہا تو وہ اماں سے چٹ گیا۔
”ارے.....! یہ تو اب میرے پاس آتا ہی نہیں، دیکھ رہے ہیں بابا.....!“
”ہاں.....!“

خوابہ صاحب ہنسنے لگے۔

”چلو جاؤ.....! تم منہ ہاتھ دھو لو، تھکی ہوئی آئی ہو۔“

اماں نے کہا تو وہ شوٹی کو پیار کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”پتا نہیں آپ باپ بیٹی کیسے مطمئن ہیں.....؟ مجھے تو ہر وقت دھڑکاہٹ لگا رہتا ہے۔“

اماں نے کہا تو خوابہ صاحب چونک کر پوچھنے لگے۔

”کیسا دھڑکا.....؟“

”اسی اسدکا، اس دن گھرتک آ گیا تھا۔ اب کہیں آتے جاتے رابعہ کے پیچھے لگ گیا تو.....؟“

”تو اس کے درے رابعہ گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے.....؟“

خوابہ صاحب فوراً بولے تھے۔

”نہیں بیگم.....! رابعہ کے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ اگر پہلے ہی قدم پر ڈر کر بیٹھ گئی تو آگے

کیسے بڑھے گی.....؟“

”اور جو لوگ.....“

”کیا لوگ لوگ.....؟ لوگوں کے ساتھ مسائل نہیں ہوتے کیا جو باتیں بتاتے ہیں.....؟ وہ پہلے اپنے

گربانوں میں جھانکیں، مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے.....! امت کریں کسی کی پرواہ.....! لیکن یہ ضرور سوچیں کہ رابعہ کی ابھی کوئی اتنی عمر نہیں

ہے۔ اپنے محلے میں ہی رابعہ کے ساتھ کی کتنی لڑکیاں ابھی کنواری بیٹھی ہیں۔“

اماں نے انہیں احساس دلانے کی کوشش کی۔

”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے.....؟“

خوابہ صاحب چونکے تھے۔

”مطلب پوری زندگی بٹھانے نہیں رکھنا رابعہ کو، کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر رخصت بھی کرنا ہے اسے۔“

اماں نے خوابہ صاحب کوئی سوچ دے کر قدرے غم مند کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ٹانیہ کو یہ سنا اس کے کمرے تک محدود کر دیا تھا اور دانیال بھی سیما کی باتوں میں آگیا تھا کہ اسے ابھی

آرام کی ضرورت ہے اور بیڑھیاں اترنا چڑھنا تو اس کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ پہلا بچہ ہے، احتیاط کرنی چاہئے۔ احتیاط کے نام پر قید تہائی اسے بری طرح کھل رہی تھی۔

اس وقت وہ دانیال سے شکایت تو نہیں، طریقے سے بات کر رہی تھی۔

”مجھے اچھا نہیں لگتا دانیال.....! بھابی کو بار بار اوپر آنا پڑتا ہے۔ آپ ان سے کہیں ناں.....! میں آرام

سے بیڑھیاں اتروں گی۔“

”بے کار ہے، بھابی مانیں گی ہی نہیں.....! اُلٹا مجھے ڈانٹنے کھڑی ہو جائیں گی۔“

دانیال نے کہا تو وہ منت سے بولی۔

”پلیز دانیال.....! آپ میرا نام لے لیجئے گا، میں ایک کمرے میں بور ہو گئی ہوں۔ چلنا پھرنا

چاہتی ہوں۔“

”جی ہاں.....! بھابی کہیں گی، ضرور چلو.....! میسر پر جا بیٹھو.....!“

”اُف.....!“

وہ جھنجھلا گئی۔

”آپ خود ہی ہر بات کا جواب دیئے جارہے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے ناں جان.....! بھابی یہی کہیں گی، پھر تم خود سوچو.....“

دروازہ کھلنے سے دانیال کی بات اُدھوری رہ گئی۔ حنا کھانے کی ٹرے لئے اندر آ رہی تھی۔

”ارے.....! آپ نے کیوں زحمت کی.....؟“

دانیال اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے دانیال صاحب.....! کیونکہ میں نے یہ زحمت آپ کے

لئے نہیں، اپنی آپا کے لئے کی ہے۔ بے چاری اوپر نیچے آ جا کر تھک گئی ہیں۔“

حنانے کہا تو وہ فوراً بولا۔

”ہاں.....! ٹانیہ ابھی یہی کہہ رہی تھی کہ بھابی کو بار بار اوپر آنا پڑتا ہے۔“

”اس لئے انہوں نے مجھے بلایا ہے۔ خبر.....! یہ بتائیں، یہ ٹرے کہاں رکھوں.....؟“

حنانہ دھڑکھٹکے گئی۔

”لایئے.....! مجھے دیجئے.....!“

دانیال نے ٹرے پکڑی، تب حنا، ٹانیہ کو دیکھ کر بولی۔

”کیسی ہو.....؟“

ٹانیہ نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

”جلیں.....! آپ لوگ کھانا کھائیں، اور ہاں! کچھ اور چاہئے ہو تو بتادیں۔“

”نہیں بس! شکریہ.....!“

دانیال نے ٹرے ٹائیپ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تو حنا کندھے اچکا کر چلی گئی۔

”دیکھو!.....! بھابی کو کتنا خیال ہے تمہارا، خود تھک گئیں تو بہن کو بلا لیا۔“

دانیال نے پھر بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو رہی، اور پھر وہ خاموش تماشا ہی بن گئی تھی۔ ناشتہ، کھانا، شام کی چائے کے علاوہ بھی حنا، دانیال کے چھوٹے موٹے کام پوچھنے کمرے میں چلی آتی تھی، اور اس شام تو حد ہی ہو گئی۔ دانیال بچوں کی ضد پر انہیں آکس کریم دلانے لے جا رہا تھا تو حنا بھی اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دانیال کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تو اس کی چھٹی جس آلام بجانے لگی تھی۔ وہ فوراً کمرے سے نکل کر نیچے آئی تو اسے دیکھتے ہی سیما بول پڑی۔

”ارے! تم یہاں کیوں آ گئیں؟ کچھ چاہئے کیا؟“

”نہیں!.....! وہ..... میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ حنا، دانیال کے ساتھ گئی ہے۔“

اس نے مشکل سے ہی سہی، لیکن اصل بات کہہ دی۔

”ہاں!.....! وہ حنا کو گھر جانا تھا۔ دانیال نے کہا، میں چھوڑ دوں گا۔ وہ تو منع کر رہی تھی لیکن.....“

سیما کھیاہٹ میں بات پوری نہیں کر سکی تو اسے سمجھانے لگی۔

”تمہیں میزھیاں نہیں اترنی چاہئیں۔ خدا خواستہ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو؟“

”کچھ نہیں ہوتا بھابی!.....! میں فارغ بیٹھے بیٹھے بور ہو گئی ہوں۔ پلیز!.....! مجھے اتنا پابند نہ کریں۔“

وہ تنک پڑ کر بولی تھی۔

”میں کہاں پابند کر رہی ہوں چندا؟.....! یہ وقت تو برعورت پر آتا ہے۔ ماں بننا آسان نہیں ہوتا۔ بہت

کچھ سہنا پڑتا ہے۔“

سیما نے اس کا گال چھو کر پیار سے کہا۔

”لیکن بھابی!.....! اس طرح تو میں ست اور بیمار پڑ جاؤں گی۔ پھر ڈاکٹر نے بھی مجھے کام کرنے سے

تو منع نہیں کیا۔“

”میزھیاں اترنے چڑھنے سے تو منع کیا ہے ناں؟.....!“

سیما فوراً بولی تھی۔ وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

”بس!.....! شروع کے تین چار مہینے ہیں، اس کے بعد ڈاکٹر خود تمہیں داک کرنے کو کہے گی۔ چلو!.....!

اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ زیادہ دیر کھڑے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جاؤ شاباش!.....! آرام کرو!.....!“

سیما کے اتنا پیار جتانے پر وہ بے بس ہو گئی اور اپنے کمرے میں آکر وہ اصل بات بھول ہی گئی، یعنی اس

کا دھیان خنا کی طرف سے ہٹ گیا تھا، جب ہی اگلے دن جس وقت دانیال آفس جا رہا تھا تو وہ اس کے ساتھ اماں کے گھر آ گئی۔ اس کا ارادہ کچھ دن یہیں رہنے کا تھا۔ دانیال مان تو نہیں رہا تھا، لیکن پھر اس کی طبیعت دیکھتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

بہر حال وہ کھلی آزاد فضاء میں سانس لینا چاہتی تھی۔ لیکن آگے اماں، رابعہ کے لئے فکر مند بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے اس کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار کیا کہ کہیں اسد، رابعہ کو آفس آتے جاتے تنک نہ کرے تو وہ بھی خوبصورت صاحب کی طرح کہنے لگی۔

”اماں!.....! آپ کیا چاہتی ہیں۔ اسد کے ڈر سے رابعہ گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے؟.....! نہیں!.....!

اس نے جاب جوائن کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔“

اچھا بس!.....! ابھی اپنے سرال میں نہ ڈھونڈو رہا بیٹنا۔“

اماں نے اسے ٹوک دیا۔

”ارے اماں!.....! میرے سرال والے دقیقاً نوی نہیں ہیں۔ ماشاء اللہ سب پڑھے لکھے ہیں۔“

اس نے کہا تو اماں آہ بھر کر بولیں۔

”پڑھا لکھا تو عباد بھی تھا، لیکن دیکھو!.....! کیسی جہالت کا ثبوت دیا۔ سوچا نہ سمجھا، طلاق تھا کر نکال دیا

بیوی کو۔“

”ان کی بات تو آپ رہنے ہی دیں۔ میں تو کہتی ہوں، اچھا ہی ہوا جو رابعہ کی جان چھوٹ گئی ان لوگوں

سے۔“

”تمہارے بابا بھی یہی کہتے ہیں۔“

اماں سر جھٹک کر بولی تھیں۔

”جب سب ہی کہتے ہیں تو آپ کیوں نہیں مان لیتیں؟.....! آپ کو کس بات کا غم ہے؟.....!“

اس کی بات پر اماں چڑ گئیں۔

”ارے!.....! جوان بیٹی اڑ کر آ گئی غم نہیں ہو گا تو کیا خوشی ہوگی؟.....!“

”فوہ اماں!.....! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

وہ اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی اور ان کے گلے میں بانٹیں ڈال کر بولی۔

”ہونے والی بات تھی، ہو گئی۔ خیر چھوڑیں!.....! یہ بتائیں!.....! اباکب آتے ہیں؟.....!“

”آ جاتے ہیں چار پانچ بجے تک!.....! تم تو زکوگی ناں؟.....!“

”ہاں اماں!.....! تین چار دن رہوں گی۔“

”اچھا!.....! پھر تم ذرا شوہلی کو سنبھالو، میں رابعہ کے کچھ سوٹ درزن کو دے آؤں۔ آفس آنے جانے

کے لئے ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں اس کے پاس۔“

اماں نے کہتے ہوئے اٹھ کر الماری کھول دی۔

”ہاں اماں.....! میں پوچھنے والی تھی۔ رابعہ کا سامان واپس نہیں بھجوا یا ان لوگوں نے.....؟“

اس نے کہا تو اماں جلتے انداز میں بولیں۔

”نہیں.....! سب دبا کر بیٹھ گئے۔ خیر.....! دفع کرو.....! تم دروازہ بند کر لو، میں بس یہ کپڑے دے کر

آ جاؤں گی، اور ہاں.....! شوبی کو فیڈر دے دیتا۔“

”جی اچھا.....!“

وہ اماں کے ساتھ باہر تک آئی۔ پھر دروازہ بند کر کے شوبی کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رابعہ آج آفس سے کچھ جلدی نکل آئی تھی۔ اسے شوبی کے لئے کپڑے اور کچھ کھلونے خریدنے تھے۔

اس نے اپنی کوئیک نورین کو بھی ساتھ قریبی مارکیٹ چلنے کو کہا، لیکن اسے کہیں اور جانا تھا اور اس نے رابعہ سے کہا بھی

کہ کل چلیں گے، لیکن رابعہ اب خود کو کسی کے بھی سہارے کی محتاج نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لئے وہ اکیلی ہی مارکیٹ

چل پڑی، اور اسے زیادہ شاپنگ تو کرنی نہیں تھی، شوبی کے دو تین سوٹ اور ایک دو کھلونے لے کر وہ جلدی فارغ

ہو کر کنوئس کے انتظار میں کھڑی تھی کہ اپنے نام کی پکار پر چونک کر ڈیکھتے ہی بلا ارادہ پیچھے ہٹنے لگی۔

”رابعہ.....! میری بات سنو.....!“

عباد اس کی طرف بڑھا تو وہ ایک دم پلٹ کر چلنے لگی۔

”رک جاؤ رابعہ.....! میری بات تو سنو.....!“

عباد تیز قدموں سے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”میرا راسخہ چھوڑ دیں پلیز.....! مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔“

وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی تھی۔

”سنو کی نہیں تو سمجھو کیسے.....؟“

عباد نے کہا تو وہ تڑخ کر بولی۔

”کیا سمجھنا چاہتے ہیں آپ مجھے.....؟ اور اب آپ ہوتے کون ہے مجھے سمجھانے والے.....؟“

”ٹھیک ہے.....! میں تمہارا کوئی نہیں، لیکن تمہارے بچے کا باپ تو ہوں ناں.....؟ اور یہ تعلق تو ہمارا

نوٹنے والا نہیں ہے۔“

عباد کی بات پر وہ حیرت سے لگ گئی۔

”آپ مجھے بلیک میل کر رہے ہیں۔“

”بھڑا.....! نہیں.....!“

وہ فوراً بولا تھا۔

”میں نیک نیتی سے تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، پلیز.....!“

”کہئے.....! کیا کہنا چاہتے ہیں.....؟“

وہ جم کھڑی ہو گئی تو عباد نے ادھر ادھر دیکھا، پھر اسے دیکھ کر بولا۔

”میرا خیال ہے، ہم کہیں بیٹھ کر بات کریں.....؟“

”آپ.....“

اس نے کچھ کہنا چاہا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”دیکھو.....! مجھ پر نہ سہی، تمہیں اپنے آپ پر تو بھروسہ ہے ناں.....؟“

وہ ایک دم ہونٹ کھینچ گئی۔ پھر اس کے ساتھ شاپنگ مال کے کیفے میریا میں آگئی اور بیٹھنے ہی بولی تھی۔

”جو کہنا ہے، جلدی کہیں.....! میں زیادہ دیر نہیں رکھ سکتی۔“

”وہ..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، میں تم سے کیسے کہوں.....؟“

عباد واقعی بے بس لگ رہا تھا۔

”تم شاید یقین نہ کرو، لیکن یہ سچ ہے کہ میں اپنے کئے پر صرف شرمندہ ہی نہیں، بلکہ پچھتا بھی رہا

ہوں۔“

”اچھا.....؟“

اس کی ذرا سی ہنسی میں ڈھک کے ساتھ استہزاء بھی تھا۔

”آپ کا پچھتاوا میرے ماتھے پر لگ طلاق کا داغ نہیں مسکتا مگر عباد الرحمن.....! اور نہ میرے بچے کو وہ

کافیڈنس دے سکتا ہے جو ماں باپ کے سایے میں پروان چڑھنے والے بچے کو حاصل ہوتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تمہارا اور بچے، دونوں کا گنہگار ہوں۔ تم مجھے جو چاہے سزا دو۔“

وہ بے حد تادم تھا۔ رابعہ نے تاسف سے اسے دیکھا، پھر کہنے لگی۔

”پچھتاوے کی آگ میں جل رہے ہیں آپ، کیا یہ سزا کافی نہیں ہے.....؟ اور آپ کیا سمجھتے ہیں.....؟

مہرے سامنے اعتراف کر کے آپ اطمینان سے ہو جائیں گے.....؟ نہیں عباد.....! آپ کی قسمت میں اطمینان ہے

ہی نہیں۔ جو شخص بیوی کو غلام بنا کر بھی مطمئن نہیں تھا، اسے کوئی بات اطمینان نہیں دے سکتی۔“

”تم مجھے معاف کر دو تو شاید.....“

اس کے کزور لہجہ پر وہ سچ کر فوراً بولی تھی۔

”معاف ڪيا.....! سڀ معاف ڪيا آپ ڪو، اور آپ کي اماں کي بهي سڀ زيادتياں معاف ڪرتي هون۔ اس ڪے بعد مجھ سے کوئی اُميد نہ رکھیں۔“

وہ اپنی بات ختم ڪرتي ہی انھہ ڪرتيز قدموں سے وہاں سے نکل آئي تھی۔ پھر اس نے وین کا انتظار نہيں ڪيا، رڪشہ سے گھر آگئي اور ثانیہ ڪو دیکھ ڪراس کا موڈ آپ ہی آپ ٹھیک ہو گیا۔

”تم کب آئی.....؟“

”میں صبح ہی آگئی تھی، اور ڪجهہ دن رهوں گی بهي۔“

ثانیہ نے بتایا تو وہ خوش ہو گئی۔

”ج.....؟“

”هاں.....! لیکن تم تو سارا دن ہوتی نہیں ہو۔“

”تو کیا ہوا.....؟ راتیں تو اپنی ہیں۔“

وہ کل ڪرمسکرائی تھی۔ پھر رات ڪے کھانے ڪے بعد وہ جلدی جلدی اگلے دن ڪے لئے ڪپڑے استری ڪرڻے لگی، تاکہ فراغت سے ثانیہ ڪے ساتھ بیٹھ سکے۔ ثانیہ شوبی ڪو تھڪتے ہوئے دھیمی آواز میں ڪوئی ڪوئی گنگنا رہی تھی، تب ہی اماں آ ڪر پوچھنے لگیں۔

”شوبی سو گیا ڪیا.....؟“

”جی.....! آئیں بیٹھیں اماں.....! ابا ڪیا ڪر رہے ہیں.....؟“

ثانیہ نے تکیہ ٻٽا ڪر اماں ڪو بیٹھنے کا ڪہتے ہوئے ابا کا بھی پوچھا۔

”تمهارے ابا ابھی لیٹے ہیں۔“

اماں بیٹھ گئیں۔ رابعہ نے پرہس ڪیا ہوا سوٺ ڀڳر ڪیا، پھر اماں سے بولی تھی۔

”اماں.....! اڪہ بات بتانی ہے آپ ڪو۔“

اماں ڪے ساتھ ثانیہ بھی اسے دیکھنے لگی تھی۔

”آپ پریشان مت ہوئے گا اماں.....! اور ابا سے بھی مت ڪہئے گا۔“

رابعہ نے ڪہا تو اماں ٹھڪ ڪر بولیں۔

”بات ڪیا ہے.....؟“

”وہ.....! آج جب میں آفس سے آ رہی تھی تو راستے میں عبادل گئے تھے۔“

رابعہ نے بتایا تو اماں پریشان ہو گئیں۔

”پھر.....؟“

ثانیہ نے ناگوار سی سے پوچھا۔

”پھر ڪجهہ ڪہا تو نہيں، بس اپنی زيادتیوں کي معافی مانگ رہے تھے۔“

رابعہ نے قصد اسر سري انداز اختیار ڪيا تھا۔ اماں تو گنگ بیٹھی تھیں، لیکن ثانیہ خاموش نہيں ره سکی۔

”تم نے ڪیا ڪہا.....؟“

”میں ڪیا ڪہتی.....؟ معاف ڪر ڪے چلی آئی۔“

رابعہ، ثانیہ ڪو جواب دے ڪر اماں سے مخاطب ہو گئی۔

”اماں.....! یہ ڪوئی پریشانی کي بات نہيں ہے۔ ہم اڪہ ہی شہر میں رهتے ہیں۔ ڪہی بھی سامنا ہو سکتا ہے، اور آپ ڪو میں اس لئے بتا رہی ہوں ڪہ کسی اور سے سن ڪر مجھ سے بدگمان نہ ہو جائیں۔“

”ٹھیک ہے.....! لیکن آئندہ ڪوئی ضرورت نہيں ہے اس سے بات ڪرڻے کي۔“

اماں نے اچانڪ تیز لہجے میں ڪہا تو وہ جزبہ ہو ڪر بولی۔

”میں ڪیا بات ڪرڻوں گی اماں.....؟ عباد خود ہی سامنے آگئے تھے، اور وہ تو شوبی سے ملنے بھی آ سکتے ہیں

ناں.....؟ باپ ہیں شوبی ڪے، ہم منع تو نہيں ڪر سکتے ناں.....؟“

اماں خاموش ہو گئیں تو وہ اڪہ نظر ثانیہ ڪو دیکھ ڪر بولی۔

”خير.....! آپ فکر نہ ڪریں، عباد یہاں نہيں آئیں گے۔“

☆.....☆.....☆

وہ اسے یوں بیٹھنے دیکھ ڪر ذرا سا چوڻے پھر فوراً ہی نظر انداز ڪرتے ہوئے واش روم میں چلے گئے۔ ڪجهہ

دیر بعد ڪپڑے تبدیل ڪر ڪے ننگے تو سیدھے اپنی جگہ پر جا لیٹے اور آنکھیں بازو سے ڈھانپ لیں۔ عام حالات میں وہ

فوراً غافل بھی ہو جاتے تھے، لیکن اس وقت جانے کیوں اسے یقین تھا ڪہ وہ فوراً سوئیں سکیں گے۔

وہ ڪجهہ دیر تک، بہت خاموش نظروں سے ان کا جائزہ لینے ڪے ساتھ یہ جانے کي ڪوشش ڪرتی رہی ڪہ آیا ان

کي نارنگی محض زوہیب ڪے گھر سے چلے آئے پر ہے، یا وہ دوبارہ اس ڪے پاس جا ڪر مزید ڪجهہ جان آئے ہیں.....؟

لیکن اپنے طور پر وہ ڪجهہ نہیں جان سکی۔ تب ساری ہمتیں سبکا ڪر ڪے انہیں پکار لیا۔

”جہانزیب.....!“

انہوں نے ذرا سا بازو نیچے ڪیا اور گردن موڑے بغیر آنکھیں ترچھی ڪر ڪے اسے دیکھ ڪر بولے۔

”بہتر ہے، اس وقت چپ چاپ سو جاؤ۔“

”مجھے نیند نہیں آئے گی۔“

وہ عاجزی سے بولی۔

”کیوں.....؟“

اس کے لہجے میں بے تحاشائی آسانی۔

”اگر بات وہیں ختم ہو جاتی تو میں سمجھتی اس نے یوں ہی مذاق کیا ہے، لیکن اس کے بعد وہ وقتاً فوقتاً مجھے آپ کے حوالے سے ملتا رہا، جبکہ وہ جانتا تھا کہ میں آپ کی منگیت ہوں۔ آپ شاید اس کی طرف داری میں یہ کہیں کہ ہو سکتا ہے، اسے یہ بات معلوم نہ ہو اور اس نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر دوسری لڑکیوں کی طرح میرے ساتھ بھی راہ و رسم بڑھائی ہو، تو ایسا نہیں ہے۔

اگر ایسی بات ہوتی تو مجھے آپ کی بیوی کے روپ میں دیکھ کر نہ صرف شرمندہ ہوتا بلکہ معافی بھی مانگتا۔ جبکہ اس کے برعکس وہ اب تک مجھے دھمکیاں دیتا ہے کہ مجھ سے اسی طرح ملو در نہ میں جہاں زیب کو سارا احوال کہہ سناؤں گا اور پھر شروع میں آپ نے خود محسوس کیا کہ میں کتنی خوفزدہ تھی لیکن پھر ایک روز میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے آپ کو ساری حقیقت بتا دینی چاہئے اور بارہا میں نے آپ کو بتانے کی کوشش بھی کی لیکن ہمیشہ آپ نے یہی سمجھا کہ میں روایتی بیوی بن کر آپ کو زوہیب سے متنفر کرنا چاہ رہی ہوں، اس لئے پہلے ہی مقام پر آپ نے مجھے سختی سے ٹوک دیا کہ میرا ایک ہی دوست ہے، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں سنوں گا۔ اب آپ ہی بتائیے، میں کیا کرتی؟“ اس نے خاموش ہو کر انہیں دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ وہ غلطی کا اعتراف کر کے ایک اور غلطی کر گئی ہے۔ وہ پتا نہیں ضبط کر رہے تھے یا کیا تھا کہ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا؟ اور آنکھوں میں بے تحاشہ غصہ پتا نہیں کس کے لئے تھا؟

اور اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر انہوں نے پہلے رخ موڑا، پھر اٹھ کر بیٹھ گئے اور ہاتھ بڑھا کر سرگرمی کا پیکٹ اٹھایا اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ جس سے وہ مزید پریشان ہو گئی۔ اگر وہ کچھ کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے تو وہ اتنا تو جان ہی لیتی کہ انہوں نے کس حد تک اسے قصور وار سمجھا ہے؟ اور آیا معافی کی گنجائش ہے یا نہیں؟ لیکن وہ تو یوں ہی اس کے سر پر تلوار لٹکی چھوڑ گئے تھے، جس کے تلے اسے اپنا دم گھٹنا محسوس ہو رہا تھا، اور یہ خوف الگ کہ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

☆ ☆ ☆

حنا نے دانیال کی گاڑی دیکھ کر ہی اسے رُکنے کا اشارہ کیا تھا۔ پھر تیز قدموں سے قریب جا کر گاڑی کے شیشے پر دونوں ہاتھ جما کر بولی تھی۔

”سوری! میری وین بس ہو گئی ہے۔ پلیز! آپ مجھے چھوڑ دیں۔“

”چھوڑ دوں؟“

دانیال جانے کس موڑ میں تھا۔

”میں نے آپ کو پکڑا ہی کب ہے؟“

انہوں نے بازو مزید نیچے کھسکایا اور جواب نہ پا کر پوچھا۔

”کیا تم اپنے رُویے پر نادم ہو؟“

”نہیں!“

”نہیں؟“

اس نے کچھ جھنجھلا کر دہرایا اور طعنے بولے۔

”گو یا میری طرف سے ندامت کا اظہار چاہتی ہو۔“

”نہیں!“

”پھر کیا چاہتی ہو؟“

”بس! آپ میری بات سن لیں۔“

”کون سی بات؟“

”وہی جو میں نے آپ سے جب جب کہنی چاہی، آپ نے ٹوک کر مجھے خاموش کر دیا۔“

وہ خاموش ہو گئے۔ غالباً سوچنے لگے تھے کہ انہوں نے کب کب اسے ٹوکا اور کس بات پر؟ پھر قدرے تاخیر سے بغیر کسی تجسس کے بولے۔

”کہو!“

اور وہ جو بیڈی بیک سے ٹیک لگائے سیدھی بیٹھی تھی، گردن موڑ کر انہیں دیکھنے لگی اور انہیں متوجہ پا کر دوبارہ پہلے والی پوزیشن میں آ کر گویا ہوئی۔

”میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ بس جو میری غلطی ہے، اس کا اعتراف کروں گی۔ اس کے بعد میں خود کو ذمہ دار نہیں سمجھتی اور آپ سے میں یہی کہوں گی کہ غیر جانبداری سے میری بات سنیں۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”میری غلطی صرف اتنی ہے کہ میں شادی سے پہلے اس وقت جب آپ کی اور میری نسبت طے ہو چکی تھی، آپ کے بینک گئی تھی اور آپ کو دیکھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس روز میں خاص طور سے اس مقصد کے لئے نہیں گئی تھی، میری ایک ساتھی نیچر کو دہاں کا تھا اور وہاں جا کر میں نے سوچا، جب یہاں تک آئی گئی ہوں تو آپ کو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟ اگر آپ سمجھ سکیں تو یہ ایک فطری خواہش تھی جسے میں دبا نہیں سکی اور بلا ارادہ وہ بے اختیار آپ کی ٹیبل کی طرف بڑھ کر آپ کا نام پوچھا تھا اور اس وقت وہاں جو شخص بیٹھا تھا، اس نے بڑے اعتماد و یقین کے ساتھ خود کو ”جہاں زیب“ کہا تھا اور میں اسے ہی جہاں زیب سمجھ کر فوراً وہاں سے پلٹ آئی تھی۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

”جانتے ہیں وہ شخص جس نے خود کو جہاں زیب کہا، وہ کون تھا؟ آپ کا جگری دوست زوہیب؟“

”تو اب پکڑ لیں ناں.....!“

حنا شوخی سے کہتے ہوئے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”ارے رے.....! آپ تو زبردستی.....“

”مجھے پتا ہے، آپ منع نہیں کریں گے۔ جلیں.....!“

وہ دھڑلے سے بولی تو دانیال نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اب آپ یونیورسٹی کو خیر باد کہہ ہی دیں۔“

”کیوں.....؟“

وہ اٹھلا کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیونکہ چار سال بہت ہوتے ہیں، تنگ آگئی ہوگی یونیورسٹی آپ سے۔“

”جنا ب.....! آپ کو پتا ہی نہیں ہے، ہم جیسوں سے تو یونیورسٹی کی شان ہے۔“

اس کے گردن اکڑانے پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”اچھا.....!“

”ارے.....! آپ ہنسنے بھی ہیں.....؟“

حنانے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”کیوں.....؟ آپ نے مجھے پہلے ہنسنے ہوئے نہیں دیکھا کیا.....؟“

”نہیں.....! میں نے تو جب بھی دیکھا، آپ کی پیشانی پر اتنی موٹی موٹی لکیریں کھینچی ہوتی تھیں۔“

اس نے کہا تو دانیال ذرا سے کندھے اچکا کر پوچھنے لگا۔

”آپ کو کہاں چھوڑنا ہے.....؟“

”اپنے گھر.....! آئی مین، مجھے آپانے بلایا ہے، ان ہی کے پاس جاؤں گی۔“

اس نے کہا تو وہ خاموش ہو رہا۔ پھر اسے گھر کے گیٹ پر ہی اتار کر وہ چلا گیا۔ اسے ثانیہ کے پاس جانا

تھا۔ حنانے اندر آتے ہی ”آپا.....! آپا.....!“ پکارنا شروع کر دیا۔ وہ یوں خوش ہو رہی تھی جیسے کوئی میدان مار لیا

ہو۔

”خیریت تو ہے ناں.....؟ کیوں چلا رہی ہو.....؟“

سیمانے کچن سے نکل کر پوچھا تو وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

”چلا نہیں رہی، خوش ہو رہی ہوں۔ آپ پوچھیں کیوں.....؟“

”کیوں.....؟“

سیمانے فوراً پوچھا تو وہ کھلکھلا کر بولی۔

”میں دانیال کے ساتھ آئی ہوں۔“

”دانیال کے ساتھ.....؟ کہاں ہے دانیال.....؟“

سیماس کے عقب میں دیکھنے لگی۔

”اسے کہیں اور جانا تھا۔ مجھے چھوڑ کر چلا گیا، اور پتا ہے آپا.....! سارا راستہ دانیال میرے ساتھ ہنسی

مذاق کرتا رہا۔ بڑے موڈ میں تھا۔“

”اچھا.....! لیکن تم اب ذرا سنبھل کر چلنا۔ یہ نہیں کہ دانیال نے ہنس کر بات کر لی اور تم اس کے آگے

بچے پھرنے لگی.....؟“

سیماس ٹوکتے ہوئے واپس کچن میں چلی گئی تو وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں آپا.....! آگے پیچھے تو اب وہ میرے پھرے گا۔“

”اللہ کرے، جو تم کہہ رہی ہو، ویسا ہی ہو۔ بس.....! مجھے تمہاری جلد بازی سے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔“

سیماسالن کی پتیلی میں چھج چلاتے ہوئے بولی۔

”نہیں کروں گی جلد بازی، آپ بے فکر رہیں، اور یہ آپ کا کیا رہی ہیں.....؟“

حنانے پتیلی میں جھانک کر دیکھا۔

”نہاری.....!“

”اُف.....! کون کھاتا ہے نہاری.....؟“

حنانے برا سامنے بتایا۔

”دانیال.....! دانیال کو نہاری بہت پسند ہے۔ پکانا سیکھ لو، ہر دوسرے دن نہاری کی فرمائش کرے گا۔“

”اچھا.....! میں تو جیسے فوراً اس کی فرمائش پوری کر دوں گی.....؟“

”پھر کیا کرؤ گی.....؟“

”وہ تو جب میں یہاں آ جاؤں گی، تب آپ خود دیکھ لیجئے گا۔“

دونوں بہنیں یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے دانیال حنا کا سنگیتر ہو اور کچھ ہی دنوں میں ان کی شادی ہونے

والی ہو۔

☆.....☆.....☆

ثانیہ فون رکھ کر اماں کے پاس آ کر بولی۔

”اماں.....! ابھی دانیال کا فون آیا تھا، وہ مجھے لینے آرہے ہیں۔“

”ہیں.....؟ ابھی رہتی کچھ دن اور.....؟“

اماں نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

”منع کروں دانیال کو.....؟“

”ارے نہیں بیٹا.....! اسے منع کرنا مناسب نہیں ہے۔“

اماں، رابعہ کی وجہ سے بہت محتاط ہو گئی تھیں۔

”چلیں.....! کچھ دن ٹھہر کر میں پھر آ جاؤں گی۔“

اس نے کہا تو اماں تاکید کرتے ہوئے بولیں۔

”ہاں بیٹا.....! پہلے اپنا گھر دیکھو۔ دانیال خوشی سے اجازت دے تو آ جانا۔“

”جی.....!“

تب ہی گاڑی کے بارن کی آواز پر وہ چونک کر بولی۔

”میرا خیال ہے دانیال آ گئے.....! ٹھیک ہے اماں.....! میں چلتی ہوں۔“

”ارے.....! اندر تو آنے دو اسے۔“

اماں نے ٹوکا تو وہ فوراً بولی۔

”نہیں اماں.....! دانیال کہہ رہے تھے، انہیں کہیں اور بھی جانا ہے، پھر آ جائیں گے۔“

”اچھا.....!“

”اللہ حافظ اماں.....!“

وہ اماں سے گھٹل کر فوراً باہر نکل آئی۔ دانیال نے اسے دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

”میں نے آپ سے چار دن کا کہا تھا، آپ دوسرے ہی دن لینے آ گئے.....؟“

وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی بولی تھی۔

”کیا کروں.....؟ دل ہی نہیں لگتا تمہارے بغیر۔ اپنا کمرہ کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ بس.....! اب یہاں

رہنے کی بات مت کرنا۔“

وہ ڈرائیونگ کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے بولے رہا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی.....؟“

اس نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

”یہی بات ہے، میں آنے جانے کو منع نہیں کر رہا۔ صبح آؤ، شام میں واپس.....! دن تو کٹ جاتا ہے

تمہارے بنا، رات نہیں لگتی۔“

اس کی محبت پر وہ خاموش ہو رہی تھی۔ پھر گھر آ کر وہ سیما کو صرف سلام کر سکی، دانیال اسے کھینچتے ہوئے

کمرے میں لے آیا تھا۔

”یہ کیا حرکت ہے.....؟“

وہ رونٹے لگی۔

”کیا سوچتی ہوں گی بھابی.....؟“

”کچھ نہیں سوچیں گی۔“

دانیال نے اسے ہانپوں میں لے لیا اور اس کی شوخ جسارتوں سے کھلی جاری تھی کہ اچانک دروازہ

کھلنے پر وہ گھبرا کر اس کی ہانپوں سے نکل گئی۔

”چائے حاضر ہے جناب.....!“

حنا چائے کی ٹرے اٹھائے اندر چلی آئی۔

”اور دیکھیں، میں نے اسٹیل آپ کے لئے سینڈویچ بنائے ہیں۔“

”تھینک یو.....! اس وقت واقعی چائے کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔“

دانیال کو مردانہ کہنا پڑا۔ جبکہ اسے حنا کا بغیر دستک دیئے آنا عجیب سا لگ رہا تھا۔

”مجھے آپ کے دل کی خبر ہو گئی تھی، جیسی میں نے جھٹ پٹ سینڈویچ بنا ڈالے۔“

حنا کچھ زیادہ اوروں ہو گئی تھی۔ دانیال نے شپٹا کر اسے دیکھا تو وہ قصداً انجان بن گئی تھی۔ حنا نے ٹیبل پر

رکھ کر کپ سیدھے کرنے لگی، پھر تانیہ کو دیکھ کر بولی۔

”دانیال کا تو خیر مجھے پتا ہے، تم کتنی چینی لوگی.....؟“

”جتنی دانیال لیتے ہیں۔“

وہ سہولت سے بولی تھی۔

”واؤ.....! یعنی دونوں کا ٹیٹ ایک ہے.....؟“

حنا نے اپنی کھسیا ہٹ ”واؤ“ میں چھپائی تھی۔

”ہم ایک ہیں تو ٹیٹ بھی ایک ہی ہوگا۔“

اب اس نے قصداً حنا پر جتایا تھا۔

”اچھی بات ہے.....! چلیں، آپ چائے پیئیں.....!“

حنا مزید ٹھہر نہیں سکی۔ کپ میں چائے ڈالے بغیر چلی گئی تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، دانیال سانس کھینچ

کر بولا تھا۔

”تھینک گاڈ.....!“

وہ اگر کچھ کہنا بھی چاہتی تھی تو اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ کیونکہ اپنی ذات کا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔

حنا کو پہلے اگر خوش فہمی تھی تو اب ضد ہو گئی تھی۔ اس کے خیال میں ثانیہ اس کے مقابلے میں بے حد معمولی لڑکی تھی اور دانیال زیادہ عرصہ اس معمولی لڑکی کی محبت میں گرفتار نہیں رہ سکتا تھا، اور ایسی صورت میں جب وہ بار بار دانیال کے سامنے جانے کی تو بالآخر وہ اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے مستقل یہیں ڈیرہ جما لیا تھا۔ پھر سیما اس کا ساتھ دے رہی تھی، اس لئے وہ دھڑلے سے گھر کے ہر گوشے میں دندناتی پھرتی تھی۔ اس وقت جب وہ سب سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے، وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ گھڑی کی سویاں رات ایک ڈیڑھ کے درمیان تھیں، جب سیما غائب ہو جانے کے لئے کمرے سے نکلی تھی کراسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

”حنا! تم ابھی بیٹھی ہو.....؟ سوؤ گی نہیں.....؟“

”سو جاؤں گی آپا!.....! نیند آئے گی تو سو جاؤں گی۔“

حنائی وی سے نظریں ہٹائے بغیر بولی تھی۔

”بستر پر لیٹو گی تو نیند بھی آجائے گی۔ ڈیڑھ ننگ رہا ہے۔ صبح یونیورسٹی نہیں جاؤ گی کیا.....؟“

”سوچ رہی ہوں جب تک یہاں ہوں، یونیورسٹی گول کر جاؤں۔“

حنانے کہتے ہوئے ٹی وی آف کر دیا تو سیما اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”پڑھائی کا حرج نہیں ہوگا.....؟“

حنانے لا پرواہی سے کندھے اچکائے تھے۔

”اچھا سنو!.....!“

سیما محتاط ہو کر پوچھنے لگی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے، دانیال کو اس حرافہ کے چنگل سے نکال لو گی.....؟“

”ہے تو مشکل آپا!.....! لیکن ناممکن نہیں ہے۔“

اس نے کہا تو سیما فوراً بولی۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ ناممکن نہیں ہے، البتہ وقت لگے گا۔“

”اب خواہ کتنا بھی وقت لگے آپا!.....! سال.....؟ دو سال.....؟ دس سال.....؟“

حنا آخر میں مسکرائی تھی۔

”دس سال.....؟“

سیما نے آنکھیں پھیل کر ”دس سال“ کو لمبا کھینچا تھا۔

”ہاں آپا!.....! میری زندگی کا اب ایک ہی مقصد ہے۔ دانیال کو حاصل کرنا۔ دس سال کیا.....؟ دس

مہریاں بھی گزر جائیں، تب بھی میں اپنے مقصد سے نہیں ہٹوں گی۔“

حنا کے اطمینان سے کہنے پر سیما پریشان ہو گئی۔

”چلو اب سو جاؤ!.....! اور صبح جلدی آنکھ نہیں کھلے گی۔“

”آپ پریشان ہو گئیں.....؟“

حنانے ہنسنے ہوئے سیما کو دیکھا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔

”دس صدیاں.....؟ بانی گاؤ!.....!“

حنانے اپنے آپ بڑبڑاتے ہوئے جھرجھری لی، پھر وہ بھی سونے کے لئے اٹھ گئی۔

اور صبح عین اس وقت جب دانیال آفس جانے کو نکل رہا تھا، وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی اور ریڑھیوں پر ٹائی کو

کمرے دیکھ لینے کے باوجود دانیال سے بولی تھی۔

”آپ آفس جا رہے ہیں۔ پلیز!.....! مجھے اسٹاپ تک ڈراپ کر دیجئے گا۔“

دانیال نے بوکھلا کر ٹائی کو دیکھا تو وہ ہیں سے واپس پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”پتلیں ناں!.....! میری دین مس ہو جائے گی۔“

حنانے کہا اور دانیال کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

کتنی دیر گزر گئی، جہاز زیب پٹا نہیں کہاں تھے۔ وہ بمشکل اپنے آپ کو ان کے پیچھے جانے پر آمادہ کر

لی۔ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی اور پھر دے پاؤں ڈرائنگ روم کے دروازے تک آ کر رُک گئی۔ اندر

سے نکھلا چلنے کی بلکی بلکی آواز باہر تک آرہی تھی۔ اس نے کچھ دیر وہیں رُک کر خود کو سنبھالا پھر دروازے کو آہستہ سے

دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو وہ صوفے پر لیٹے نظر آئے۔

ایک ہاتھ سر کے نیچے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ سوچوں کے بھنور میں ڈوبی

اھیں کسی نادیدہ نقطے پر جمی تھیں۔ اسے سچ سچ ان پر رحم آیا، کیونکہ وہ ان کی کیفیت اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ اس

وقت انہیں چھیڑنا مناسب نہیں تھا، لیکن وہ باز نہیں رہ سکی۔

”آپ یہاں کیوں آ گئے.....؟“

وہ سامنے آ کر بولی تو انہوں نے ایک لحظہ کو اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی۔

”جہاز زیب!.....!“

اس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تو وہ بول پڑے۔

”جاؤ، جا کر سو جاؤ!.....!“

”سو جاؤں؟“

اس نے زیر لب دہرایا۔

”پلیز، جاؤ۔“

ان کے لہجے میں عاجزی اور تحکم ایک ساتھ تھا۔ وہ واپس ہو کر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆☆☆☆

خواجه صاحب کتنی دیر سے نوٹ کر رہے تھے کہ بیگم گم سم بیٹی ہیں۔ ایک دو بار انہوں نے کھانسی کرتے ہوئے کرنا چاہا، لیکن ان کی محویت نہیں ٹوٹی۔ جانے کیا سوچ رہی تھیں؟ آخر خواجه صاحب کو کتنا پڑا۔

”ہاں بھی بیگم! کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ؟“

اماں بری طرح چوکی تھیں۔

”جو بھی مسئلہ ہے، اکیلے تم سے حل نہیں ہوگا۔“

خواجه صاحب نے کہا تو اماں سانس کھینچ کر بولیں۔

”جانتی ہوں میاں! جانتی ہوں۔“

”پھر بتاؤ! کیا بات ہے؟“

خواجه صاحب سیدھے ہوشیٹھے۔

”وہ... میں درزن کے پاس گئی تھی۔ رابعہ کے کپڑے سلنے دیتے تھے ناں! اونسی لینے گئی تھی، تو اس نے رابعہ کے لئے ایک رشتہ بتایا ہے۔ سوچ رہی ہوں میاں! اگر دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے؟“

اماں نے اپنی سوچ کا سر خواجه صاحب کے ہاتھ تھما دیا کہ پھر وہ کتنی دیر بعد بولے تھے۔

”حرج تو کوئی نہیں ہے، لیکن پہلے رابعہ سے تو پوچھ لو!“

”پوچھ لوں گی رابعہ سے بھی، اور وہ بھی آخر کب تک منگ کرے گی؟ سال؟ دو سال؟“

”ہاں! تو ابھی تو سال بھی نہیں ہوا۔“

خواجه صاحب فوراً بولے تھے۔

”آپ بھی حد کرتے ہیں میاں! یعنی جو کام ابھی ہو رہا ہے، اسے دو سال بعد ٹال دینا کہاں کی عقل مندی ہے؟“

اماں قدرے زچ ہوئی تھیں۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

خواجه صاحب تائید میں سر ہلانے لگی۔

”بس! تو پھر اللہ کا نام لے کر آپ پہلے لڑکے کے بارے میں جو چھان بین کرنی ہو، کر لیں۔ پھر بات آگے بڑھائیں گے۔“

”ارے بھئی! مجھے کیا تپا لڑکا کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟“

”بتاتی ہوں میاں! اور زن نے فون نمبر اور پتہ لکھ کر دیا ہے، لاتی ہوں۔“

اماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جاتے جاتے ٹک کر بولی تھیں۔

”اور ہاں! جسے آپ لڑکا کہہ رہے ہیں، وہ دو بچوں کا باپ اور رنڈا ہے۔“

خواجه صاحب انہیں دیکھتے رہ گئے۔ کچھ کہنے کا حوصلہ یوں نہیں ہوا کہ اپنی بیٹی بھی تو ایک بچے کی ماں اور

ملا تھی۔ پھر وہی بات کہ جو بات مقدر میں لکھی ہوتی ہے، وہ ہو کر رہتی ہے۔ خواجه صاحب نے اماں سے فون نمبر اور

الہ ریس لے کر اسی وقت پہلے فون کیا اور ملاقات طے کر کے گھر سے نکل آئے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد خواجه صاحب ایک عالی شان بیگنے کے سامنے شش و پنج میں کھڑے تھے۔

”بیٹی کو بڑے گھر میں بیٹا ہونا آرزو تھی، لیکن اس کے بعد کیا وہ اس حساب سے اس کی آؤ بھگت کر سکیں

گے؟“

یہ سوچ ان کے قدم روک رہی تھی، تو واپس پلٹنے کو ہی دل آمادہ نہیں تھا۔ آخر ہمت کر کے انہوں نے

پولیدار کے ذریعے اندر پیغام بھیجوا دیا تو فوراً ہی ایک ملازم آکر انہیں اپنے ساتھ اندر لے گیا اور وسیع و عریض ڈرائنگ

روم میں چھوڑ کر جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ ششدر کھڑے تھے، جب لگ بھگ بیس سالہ شاندار

ہمسائی کے مالک شیراز احمد نے کمرے میں داخل ہو کر ”سلام“ کیا تھا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام!“

خواجه صاحب چونک کر اسے دیکھے گئے۔

”مجھے شیراز احمد کہتے ہیں۔“

شیراز احمد آگے آکر خواجه صاحب سے مصافحہ کر کے بولے۔

”پلیز! تشریف رکھیں۔“

”شکریہ!“

خواجه صاحب بیٹھ گئے، لیکن وہ کچھ بھی بولنے سے قاصر تھے۔ شیراز احمد نے چند لمحے انتظار کیا، پھر خود

ہل کئے گئے۔

”دیکھیں خواجه صاحب! میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں۔ یہ نہیں کہ میں ابھی کچھ کہوں اور بعد

میں اپنی بات سے ٹکراؤں۔“

”جی..... جی ہاں.....! بہتر یہی ہے کہ ہم صاف بات کریں۔“

خویر صاحب نے ان کی تائید کی ورنہ وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا صاف بات کرنا چاہ رہے ہیں.....؟

”جی.....! تو مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی بیٹی کے دو بچے.....“

شیراز نے اسی قدر کہا تھا کہ خویر صاحب بول پڑے۔

”جی نہیں.....! میری بیٹی کا ایک بیٹا ہے، دو سال کا ہونے والا ہے۔“

”اور میرے دو بچے ہیں۔ بیٹا دو سال کا اور بیٹی ایک سال کی، اور میرے پاس آپ کے نواسے کے لئے بھی بہت جگہ ہے، لیکن.....“

شیراز نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ غالباً ان کے خیال میں خویر صاحب خود ہی سمجھ جائیں گے، لیکن وہ سوالیہ نشان بن کر رہ گئے تھے۔ ملازم چائے کے ساتھ دیگر لوازمات رکھ کر چلا گیا۔

تب شیراز گویا ہوا۔

”میں سمجھتا ہوں خویر صاحب.....! کہ آپ کے نواسے کے حق میں یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ آپ کے پاس رہے۔“

”جی.....؟“

خویر صاحب کا ”جی“ نہ سمجھنے والا تھا۔

”جی ہاں.....! یہی بہتر ہے۔ کیونکہ یہاں آکر وہ نہ صرف آپ کا نواسہ، بلکہ میرے بچے بھی ڈبل مائنڈ اور شاید کمپلیکس کا شکار بھی ہو جائیں گے۔ کیونکہ فطری طور پر آپ کی بیٹی کا جھکاؤ اپنے بچے کی طرف ہوگا اور میرا اپنے بچوں کی طرف۔ یوں میرے بچے یہ سمجھ لگیں گے کہ آپ کی بیٹی ان کی ماں نہیں ہے، جبکہ میں یہ نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں، جو بھی لڑکی میری زندگی میں آئے، وہی میرے بچوں کی ماں کہلائے۔ میں اپنے بچوں کو سوتیلے کا تصور ہی نہیں دینا چاہتا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں.....؟“

خویر صاحب ایک ٹک انہیں دیکھے جارہے تھے اور سب سمجھ بھی رہے تھے۔

”باقی آپ کے نواسے کی تمام ذمہ داری..... آئی مین.....! اخراجات وغیرہ میں پورے کروں گا، اور آپ کی بیٹی کو اپنے بچے سے ملنے کی بھی پوری آزادی ہوگی۔“

شیراز نے اپنی بات ختم کر کے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

”چائے لیجئے پلیز.....!“

خویر صاحب کی نظریں شیراز سے ہٹ کر ٹیبل پر جا ٹھہریں اور پھر کچھ سوچ کر ہی انہوں نے چائے کا

آپ اٹھایا تھا۔

☆.....☆.....☆

اب خویر صاحب چپ بیٹھے تھے اور اماں کے اندر کھلبلی مچی تھی۔ بار بار ان کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ آخر صبر جواب دے گیا۔

”آپ بتا بھی دیں میاں.....! کیا بات ہوئی.....؟ لڑکا کیسا ہے.....؟“

”لڑکا تو اچھا ہے بیگم.....! پڑھا لکھا سلگھا ہوا، جیسے اپنا دانیال ہے۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ۔“

خویر صاحب ابھی بھی سوچتے انداز میں بول رہے تھے، غالباً ان کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔

”اچھا.....!“

اماں خوش ہو گئیں۔

”گھر میں اور کون کون ہے.....؟ ماں باپ، بہن بھائی کتنے ہیں.....؟“

”نہیں.....! اور کوئی نہیں ہے۔“

خویر صاحب اب چونک کر پوری طرح بیگم کی طرف متوجہ ہو کر بتانے لگے۔

”ماں باپ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ایک بڑی بہن ہے، وہی جو درزن کے پاس کپڑے سلوانے آتی ہے، وہ بھی اپنے گھرا والی ہے۔“

”تو اس کے بچے کون سنبھالتا ہے.....؟“

اماں نے پوچھا تو خویر صاحب قدرے جھنجھلا گئے۔

”یہ سب میں نے نہیں پوچھا۔ ایسی باتیں عورتوں میں ہوتی ہیں۔ مجھ سے تو شیراز نے صاف بات

کی۔“

”صاف بات.....؟“

اماں کے ٹوکنے پر خویر صاحب شٹا گئے۔ غالباً وہ صاف بات بتانا نہیں چاہتے تھے، بمشکل بات بنا

لی۔

”ہاں.....! یہی کہ وہ رابعہ کے بچے کی ساری ذمہ داریاں اٹھائے گا۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے میاں.....!“

اماں کے اطمینان پر خویر صاحب جزبہ ہو کر بولے۔

”ہاں.....! لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔ میرا مطلب ہے، شوہنی اگر ہمارے پاس رہے تو زیادہ اچھا

ہے۔“

خواجه صاحب دُوراندیشی سی کام لیتے ہوئے ساری بات خود پر کھ کر بیگم کو سمجھانے لگے۔
 ”دیکھو ناں بیگم! وہاں شیراز کے بھی دو بچے ہیں۔ اگر راجہ شوبی کو ساتھ لے گئی تو بتاؤ..... ایک ساتھ تین بچوں کو کیسے سنبھالے گی؟ پھر بچوں میں ذرا سی چپقلش ہوئی کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو الزام دینے لگیں گے۔ اس لئے میں نے شیراز سے بھی کہہ دیا ہے کہ شوبی ہمارے پاس رہے گا۔“
 ”ہائیں؟“ آپ نے خود ہی سب سوچ لیا۔ پہلے راجہ سے تو پوچھ لیں، وہ شوبی کو ہمارے پاس چھوڑے گی کہ نہیں؟“

اماں قائل ہو رہی تھیں لیکن خواجه صاحب کی آخری بات پر اٹھل پڑیں۔
 ”راجہ سے پوچھنا نہیں، اسے سمجھانا ہے۔“
 خواجه صاحب زور دے کر کہنے لگے۔

”اوس سمجھانا بھی کیا؟ اس سے کہہ دینا کہ ہم شوبی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“
 ”اللہ کرے راجہ راضی ہو جائے۔ میں بات کرتی ہوں اس سے۔“
 اماں کہتے ہوئے اٹھ گئیں۔

☆.....☆.....☆

ثانیہ سمجھ نہیں پاری تھی کہ یہ گھر میں کیا کھجڑی پک رہی ہے؟ حتا کیوں یہاں مستقل طور پر رہ جمائے ہوئی ہے؟ مزید دیدہ دلیری سے روزانہ صبح یونیورسٹی جانے کے لئے دانیال کے ساتھ نکلتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر دانیال اور حتا کے درمیان پہلے سے کوئی بات تھی تو پھر دانیال نے اس کے ساتھ شادی کیوں کی؟ یہ سب بڑے آرام سے اپنی بہن کو دیورانی بنا کر لاسکتی تھی۔ کیونکہ دانیال، سیمیا کی بات نہیں ٹالتا تھا۔
 جب پہلے نہیں تو پھر اب کیوں؟

اس وقت وہ یہی سوچ رہی تھی کہ دانیال بہت غلت میں کمرے میں داخل ہوا اور اسے اپنا سوٹ نکالنے کا کہہ کر واش روم میں گھس گیا۔ وہ یہی سمجھی ابیرجنسی کسی میننگ میں جانا ہوگا، جلدی سے اس کا سوٹ نکال دیا۔ پھر جب وہ اسی غلت میں بالوں میں برش کر رہا تھا، تب اس نے یوں یہ پوچھ لیا۔
 ”کہاں جا رہے ہیں؟“

”وہ۔“

دانیال نے پہلے برش رکھا، پھر اسے دیکھ کر بولا۔
 ”نونی اور ردالے لینڈ جانے کی ضد کر رہے ہیں۔“
 ”میں بھی چلوں گی۔“

وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”تم کہاں جاؤ گی؟“ میرا مطلب ہے، تم ایسی حالت میں.....“
 دانیال پٹنایا تھا۔

”کوئی بری حالت نہیں ہے میری! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ زبردستی مجھے بیمار کرنے پر ٹٹے مئے ہیں۔“

اس نے کہا تو وہ جھنجھلا کر بولا۔

”کیا بے وقوفوں جیسی باتیں کر رہی ہو.....؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اگر آپ کو میرا خیال ہے تو آپ بھی مت جائیں۔ کیوں مجھے ایسی حالت میں چھوڑ کر جا رہے ہیں.....؟“

اس کے ناراضگی سے کہنے پر وہ عاجزی پر اتر آیا۔

”کہیں دُور نہیں جا رہا یا.....! بس.....! بچوں کو آؤں کریم دلا کر آ جاؤں گا، اور ہاں.....! تم بتاؤ.....!“

کون سی آؤں کریم کھاؤ گی.....؟

”کوئی سی بھی نہیں.....!“

وہ روٹھ گئی۔

”اُدو! تم تو بچوں کی طرح روٹھ رہی ہو.....! اچھا.....! میں تمہارا فیورٹ فلیور لے آؤں گا۔ اُدو کے.....!“

اسے منانے کے لئے فقط اتنا ہی کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا۔

”دانیال.....!“

وہ اس کے پیچھے دروازے تک آ کر رُک گئی۔ لاؤنج میں ردال اور نونی کے ساتھ حتا بھی تیار کھڑی تھی۔ اس نے حیرت اور دکھ سے دانیال کو ان کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا، پھر پلٹ کر دروازہ بند کر لیا۔ اب اسے ایک پل نہیں تھا۔ مسلسل ٹہل ٹہل کر اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں، لیکن اس نے سوچ لیا کہ وہ آج دانیال سے حتا کی بابت پوچھ کر رہی ہے گی کہ آخروہ کیا چاہتی ہے.....؟

لیکن وقت گزرتا گیا، شام سے رات ہو گئی، اور آخر تھک کر وہ سو گئی تھی۔ پتا نہیں دانیال کس وقت آیا تھا.....؟ صبح جب وہ اٹھی تب بھی دانیال پہلے سے اُٹھ چکا تھا اور آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے خاموش سے آئینے میں اسے دیکھا اور منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے اُٹھ کر واش روم کا رخ کیا۔ پھر جب نکلی تو اسی وقت حتا ناشتے کی ٹرے لئے آ گئی، اور اس سے پہلے کہ وہ اسے آئندہ ایسی زحمت نہ کرنے کا کہتی، حتا ٹرے رکھ کر چلی گئی، لیکن اس کے اندر غبار بھر رہا تھا، دانیال کو سنا کر بولی تھی۔

”ذرا تیز نہیں ہے، اتنا بھی نہیں پتا کسی کے کمرے میں جانے سے پہلے دستک دی جاتی ہے۔“
”ہیں.....؟“

دانیال اس کی طرف گھوم کر پوچھنے لگا۔

”یہ تم کس کے بارے میں کہہ رہی ہو.....؟“

”وہی جو ابھی منہ اٹھائے چلی آئی تھی۔“

اس کے تفر کے باوجود دانیال آرام سے بولا تھا۔

”کمال ہے..... ایک تو وہ تمہارا خیال کر رہی ہے.....“

”میرا نہیں.....! آپ کا۔“

وہ سلگ کر فوراً بولی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

دانیال بجائے سمجھنے کے، بگڑ گیا، تو وہ صبح فساد نہیں ڈالنا چاہتی تھی، جب ہی خود پر ضبط کرتے ہوئے

بولی۔

”مجھے نہیں پتا.....! بس آپ بھابی سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بہن کو اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ میں اپنا کام

خود کر لوں گی۔“

”تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہے، سمجھیں.....؟ اور تمہیں تو احسان مند ہونا چاہئے تھا کہ، جو ہر دُکھ

تکلیف میں بھاگی آتی ہے۔ ورنہ کون کرتا ہے کسی کے لئے اتنا.....؟“

”نبی تو میں کہہ رہی ہوں.....؟ مجھے کسی کا احسان نہیں چاہئے۔“

”دماغ خراب ہے تمہارا.....! ناشکری ہو تم.....! اُلٹا چور کو تو ال کوڈائے کے مصداق۔“

دانیال اسے سنا کر چلا گیا۔ وہ کتنی دیر سناٹے میں کھڑی رہ گئی تھی۔ پھر وہ اسی غصے میں سیما سے بات

کرنے جا رہی تھی کہ فون کی بیل پر بادل غواستہ پلٹ کر فون اٹھایا تھا۔

”ہیلو.....!“

”راہبہ بات کر رہی ہوں۔“

ادھر سے راہبہ نے کہا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

”ہاں راہبہ.....! کیسی ہو.....؟“

”تمہاری بے خبری پر ماتم کر رہی ہوں۔“

راہبہ نے کہا تو وہ سمجھی نہیں۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ ابھی میں نے دانیال کے ساتھ گاڑی میں حنا کو جاتے ہوئے دیکھا ہے، اور یقیناً تمہیں

لہر ہی نہیں ہوگی.....؟“

راہبہ کی بات پر وہ چکرا گئی، لیکن پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔

”ارے نہیں راہبہ.....! مجھے خبر کیوں نہیں ہوگی.....؟ میرے سامنے ہی تو نکلے ہیں دونوں۔ اصل میں

مناکل یہیں رہ گئی تھی، اور ابھی اسے یونیورسٹی جانا تھا تو دانیال اسے چھوڑ دیں گے۔“

”دانیال کیوں.....؟ وہ کمال حسن کے ساتھ چلی جاتی.....؟“

راہبہ نے کہا پھر اسے سمجھانے لگی۔

”دیکھو.....! مرد پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ آئندہ ایسی غلطی مت کرنا۔“

”اچھا بابا.....! نہیں کروں گی۔ یہ بتاؤ.....! تم ابھی کہاں ہو.....؟“

اس نے بات بدلی۔

”آفس.....! میں نے آفس آتے ہوئے ہی ان دونوں کو دیکھا تھا۔ اور سنو.....! تم ابھی اماں کے پاس

ہا سکتی ہو.....؟“

راہبہ نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

”ابھی.....؟“

وہ سوچنے لگی۔

”ہاں یار.....! چلی جاؤ.....! اور سمجھاؤ انہیں، دو دن سے میرا دماغ چاٹ رہی ہیں۔“

راہبہ نے کہا تو وہ بالکل بھی نہیں سمجھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟ اماں کیوں تمہارا دماغ چاٹ رہی ہیں.....؟“

”تمہیں نہیں بتایا انہوں نے.....؟ بتایا ہوگا.....؟“

راہبہ نے یقین سے کہا۔

”نہیں بھئی.....! مجھے کچھ نہیں بتایا۔ ہوا کیا ہے.....؟“

اس نے اُلجھ کر پوچھا۔

”کوئی رشتہ مل گیا ہے انہیں، اور اب اُٹھتے بیٹھتے مجھے دوسری شادی پر زور دیتی ہیں۔“

راہبہ نے جس قدر سلگ کر کہا، وہ اسی قدر خوش ہو گئی۔

”ہائے.....! آج، یہ تو بہت اچھی بات ہے راہبہ.....! تم منع کیوں کر رہی ہو.....؟“

”کیونکہ مجھے شادی نہیں کرنی۔“

راہبہ نے کہہ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا، اور وہ ہنسنے لگی۔ کچھ دیر پہلے کی ساری باتیں اس کے ذہن سے

نکل گئی تھیں اور اب وہ رابعہ کے لئے آنے والے رشتے کی تفصیل جاننے کے لئے اماں کو فون کر رہی تھی۔

☆☆☆

پھر اگلا دن اور اس کے بعد کتنے بہت سارے دن یوں گزرے کہ جہانزیب اس کے وجود، اس کی ذات سے یکسر بے خبر رہے گو کہ وہ اسی گھر میں موجود تھی لیکن انہیں جیسے نظر نہیں آتی تھی۔ وہ بات کرتی تو بہرے بن جاتے، جواب طلب کرتی تو گونگے۔

یہ صورت حال اس کے لئے خاصی تکلیف دہ تھی۔ ان کے کسی انداز سے بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کے لئے کس انداز سے سوچ رہے ہیں؟ اس کے ساتھ کمرے میں تھا ہوتے تو جب تک خود کوئی کام کر رہے ہوتے، اپنی ساری توجہ اسی کام کی طرف مبذول رکھتے اور کام ختم ہوتے ہی یہ دیکھنے بغیر کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ لائٹ آف کر کے لیٹ جاتے اور وہ جہاں کھڑی ہوتی، جہاں بیٹھی ہوتی، کتنی دیر تک وہیں کی وہیں رہ جاتی۔ کئی بار اس کا دل چاہتا، وہ انہیں جھنجھوڑ کر اٹھا دے اور کہے کہ آس و ناس کی اس کیفیت سے آزاد کر دیں۔ لیکن ان کا گو گنگے بہرے والا رویہ اسے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا اور اب تو اس کی قوت برداشت بالکل جواب دے رہی تھی۔ کیونکہ گھر کے کسی کو نے میں رکھا فاقو سامان بھی کبھی کبھار نظر میں آ جاتا ہے اور اس کی اہمیت اتنی بھی نہیں رہی تھی۔

اس روز جب وہ آفس کے لئے نکل رہے تھے وہ بہت ہمت کر کے ان کے سامنے آ گئی۔

”میں امی کے گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں!“

وہ پاٹ لہجے میں کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

”آ خر کیوں؟“

ان کے پیچھے تقریباً بھاگتے ہوئے اس نے پوچھا، لیکن جواب ندارد، بلکہ جیسے معلوم ہی نہیں ہو کہ وہ چیخے آ رہی ہے۔ برآمدے کی حد پر وہ ٹک گئی اور انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جب ان کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل گئی تب یں شرمندہ قدموں سے واپس اندر کی طرف جاری تھی کہ اماں اپنے کمرے سے نکلیں اور اس پر نظر پڑی تو کہنے لگیں۔

”آؤ ڈالہن! یہاں بیٹھو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

”جی.....!“

وہ ان کے ساتھ تخت پر آ بیٹھی تو اماں کہنے لگیں۔

”میں یہ کہہ رہی ہوں کہ جہانگیر اب ماشاء اللہ کمانے والا ہو گیا ہے، تو اب اس کی شادی کا سوچیں۔“

”جی.....!“

وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کہاں بات چلائیں؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ جہاں آپ مناسب سمجھیں۔“

”نہیں ڈالہن! ایوں دامن نہ بچاؤ۔ تم بھی اسی گھر میں رہتی ہو اور جہانگیر تمہارا ایک ہی دیور ہے۔

بڑی بھادج ہونے کے ناطے کیا تمہارا فرض نہیں بنتا کہ.....“

”وہ تو ٹھیک ہے اماں! لیکن.....“

وہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔

”میں نے کبھی کسی لڑکی کو اس نظر سے نہیں دیکھا، البتہ اب آپ کہہ رہی ہیں تو ضرور دیکھوں گی۔“

پھر اچانک خیال آیا تو کہنے لگی۔

”اماں! لڑکیاں تو گھر ہی میں موجود ہیں۔ آپ کی بہن کے ہاں اور بھائی کے گھر بھی۔ میں سمجھتی

ہوں کہ جب اپنوں میں رشتے موجود ہیں تو پھر غیروں میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کبھی تو تم ٹھیک ہو، اور مجھے بھی خیال آیا تھا، لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

وہ فوراً پوچھنے لگی۔

”سوچتی ہوں، جب میری بیٹیوں کے لئے وہ نہیں آئے تو میں کیوں ان کی لڑکیوں کا خیال کروں؟“

حالانکہ جب میری بیٹیاں بیا ہیں، اس وقت میرا بھائی اور بہن دونوں ہی اپنے اپنے لڑکوں کے لئے لڑکیاں ڈھونڈ

رہے تھے، تو کیا میری لڑکیاں عیب دار تھیں جو انہوں نے نظر انداز کیں؟“

”چھوڑیں اماں! اللہ جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔ آج آپ کی لڑکیاں ماشاء اللہ اپنے اپنے گھروں

میں خوش ہیں۔ ہو سکتا ہے، خالہ، ماموں کے ہاں بیاہی ہوئیں تو ایسی خوشیاں نہ ملتیں۔“

اس نے رساں سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ محض اس بات کو کہہ رہی ہیں آئے تو ہم کیوں جائیں، آنا کا مسئلہ مت بنالیں۔ اگر ان لڑکیوں میں

سے آپ کو کوئی پسند ہے تو اللہ کا نام لے کر رشتے لے جائیں۔ ویسے جہانگیر کیا کہتا ہے؟“

”وہ کیا کہے گا؟“

اماں کے لہجے میں مان کے ساتھ تھوڑا سا تعفرفرمت آیا جو یقیناً ان کا حق تھا۔ اولاد نیک اور سعادت مند ہو

تو والدین فخر کیا ہی کرتے ہیں۔

”اللہ کا شکر ہے ڈالہن! میری کسی اولاد نے کبھی میری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ بیٹیاں بھی

ہماری رضا میں راضی رہیں اور جہانزیب کی طرح اب جہانگیر کا کہنا بھی یہی ہے کہ جہاں آپ مناسب سمجھیں کریں۔“

”یقیناً آپ خوش قسمت ہیں، ورنہ آج کل لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں بھی۔۔۔“

اس وقت فون کی بیل بجی، جس سے اس کی بات اُدھوری رہ گئی۔

”جاؤ دیکھو کس کا فون ہے۔۔۔؟“

اماں نے کہا تو وہ اُنھ کر لابی میں آ گئی۔

”ہیلو۔۔۔!“

”کیسی ہو جانیہ۔۔۔؟“

دوسری طرف زہیب کی آواز سن کر وہ پوری جان سے تپ گئی اور محض اس خیال سے کہ کہیں اس کی آواز اماں نہ سن لیں، خاموشی اختیار کر گئی۔

”سنو۔۔۔ بہت دنوں سے جہانزیب میری طرف نہیں آیا۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں۔۔۔؟ یا تم نے اسے روکا ہے۔۔۔؟“

”میں نے روکا نہیں، بس تمہارا اصلی چہرہ دکھایا ہے۔“

وہ بمشکل آواز اور لہجے کو نازل رکھ کر جبکہ دوسری طرف اسے جیسے کرٹ لگا تھا۔

”کیا۔۔۔؟ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟ کیا بتایا ہے تم نے اسے۔۔۔؟“

”وہی باتیں جو تم اسے بتانے کی مجھے دھمکیاں دیا کرتے تھے۔“

اس نے وہی انداز اپنایا جو کچھ عرصہ پہلے زہیب کا تھا کہ خود مطمئن رہ کر اسے زلزلوں کی زد میں دھکیل دیتا تھا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“

”میں ایسا کر چکی ہوں۔“

اس نے اپنا اطمینان برقرار رکھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب اسے جن مشکلات کا سامنا ہے، اس کی خبر زہیب کو ہو۔ بڑے آرام سے بولی۔

”میں نے پوری ایمانداری سے سچ سچ جہانزیب کو بتا دیا ہے کہ تم نے کس طرح مجھے فریب دیا۔۔۔؟ یہ جانتے ہوئے کہ میں ان کی نگہباز ہوں، یہ بھی کہ تم نے نہ صرف جہانزیب بن کر مجھے دھوکہ دیا بلکہ اب اس تعلق کو قائم رکھنے کے لئے دھمکیاں بھی دیتے ہو۔“

”میں یقین نہیں کر سکتا کہ تم نے جہانزیب سے یہ سب کہا ہو۔“

وہ کمزور لہجے میں بولا۔

”اور میں تمہیں یقین دلانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“

وہ ریسور رکھنا چاہتی تھی، اور وہ اس کا ارادہ بھانپ کر فوراً بولا۔

”سنو۔۔۔! فون ہندمت کرتا۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”مجھے بتاؤ، تم نے ایسی بے وقوفی کیوں کی۔۔۔؟“

”تمہاری چالاکی سے بچنے کی خاطر۔۔۔!“

وہ فوراً بولی۔

”اس سے پہلے کہ تم اپنی طرف سے کوئی داستان بنا کر سارا الزام میرے سر رکھتے، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ساری حقیقت بتا دوں۔“

”اور اب ذرا اس بات کا ردِ عمل بھی بتا دو، جو جہانزیب کی طرف سے ظاہر ہوا ہوگا۔“

”کس قدر کمینہ ہے۔“

اس نے سوچا اور یہ بھی کہ اسے بے شمار گالیوں سے نوازے، لیکن وہی بات کہ وہ کیوں اسے خبر ہوئے دے کہ اگر اس کا یہی مقصد تھا تو اس کی کامیابی پر وہ کھل اٹھے گا، اور وہ خود مشکل میں گھر کر اب کم از کم اسے تماشائی نہیں بناسکتی تھی، جیسی خود پر تاقیو پیا کر بولی۔

”جہانزیب کو انفسوس اس بات کا ہے کہ جسے وہ دوست سمجھتے تھے، وہ آستین کا سانپ نکلا۔“

”اور تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں۔۔۔؟“

”یہ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے، اور سنو۔۔۔! آئندہ اس نمبر پر رنگ مت کرتا۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا اور دوبارہ آدے میں آئی تو اماں وہاں موجود نہیں تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اماں کچن میں ہوں گی۔ وہ بھی ان کے پیچھے کچن میں آ گئی۔

”آپ بٹنے اماں۔۔۔! کھانا میں پکاؤں گی۔“

”ارے۔۔۔! تمہاری طبیعت۔۔۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، اور زیادہ بیکار بیٹھنے سے ہی طبیعت خراب ہوتی ہے۔ کام میں لگوں گی تو اپنی طرف سے دھیان بٹے گا۔“

”یہ تو ہے۔۔۔! لیکن کوئی بھاری کام مت کرتا۔“

”یہاں کوئی بھاری کام نہیں ہے۔ بس۔۔۔! آپ مجھے کھانا پکانے دیں۔“

”اچھا۔۔۔!“

انہوں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا اور دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کچن سے

وہ اماں سے رابعہ کے رشتے کی تفصیل سن کر خوش ہو گئی اور جو رابعہ نے اس سے اماں کو باز رکھنے کو کہا تھا، تو اس کے برعکس اس نے جلدی کرنے کو کہا تو پھر سارا دن وہ اسی بیچ پر سوچتی رہی تھی۔ شام میں روزانہ کی طرح سیما اس کے لئے جوس لے کر آئی تو اس نے خوش خوشی پی لیا۔ ورنہ ادھر کچھ دنوں سے اس کا جوس پینے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ ایک تو طبیعت کچھ ایسی تھی، مزید حنا کی بے باکیوں نے پریشان کیا ہوا تھا۔

بہر حال اس وقت وہ ساری باتیں بھلا کر رابعہ کے بارے میں سوچ کر خوش تھی اور انتظار کر رہی تھی کہ دانیال آئے گا تو اسے بھی بتائے گی اور پھر اسی وقت دانیال کے ساتھ اماں کے گھر جا کر وہ بھی رابعہ کو سمجھائے گی۔

لیکن جانے کیا ہوا؟..... اچانک اس پر نیند سوار ہو گئی۔ حالانکہ یہ سوئے کا وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر میں مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ اس نے سوچا، اٹھ کر وضو کرے، لیکن اتنی زور کا پکڑ آیا کہ عینے پر سر رکھتے ہی وہ سو گئی۔ ایسی بے خبری کہ نیند کہ پتا ہی نہیں چلا، دانیال کب آیا؟..... کب گیا؟.....

پھر جب اس کی آنکھ کھلی، کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ رات ہے یا کوئی اور وقت؟..... اس نے دانیال کے عینے پر ہاتھ مارا، وہ موجود نہیں تھا۔ تب اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ سراسیمہ بھی بھاری ہو رہا تھا۔ ہاتھوں سے بال ٹھیک کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکل کر ریٹنگ تک آتے ہی ٹھٹک کر رُک گئی۔ نیچے لاؤنج میں دانیال اور حنائی وی کے سامنے ایک ہی صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور ریوٹ کنٹرول پر دونوں میں جھینپا جھپٹا ہو رہی تھی۔ ایک پل میں اس کے دل پر قیامت گزر گئی تھی۔ بمشکل خود کو گھسیٹتی ہوئی وہ واپس کمرے میں آئی اور جان بوجھ کر دروازہ اتنی زور سے بند کیا تا کہ دانیال آواز سن سکے، اور واقعی وہ آواز سن کر بھاگا آیا تھا۔

”میں آیا تھا، تم سو رہی تھیں۔“

دانیال نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”اور آپ نے سمجھ لیا کہ میں اب ہمیشہ سوتی رہوں گی؟..... کبھی نہیں اٹھوں گی؟.....“

اس کے لہجے میں بلا کی جھینپ تھی۔

”بے کار باتیں مت کرو۔!“

وہ قصداً جھجھکیا تھا۔

”میری باتیں بے کار ہیں؟..... اور جو آپ کرتے پھرتے ہیں، وہ کیا ہے؟.....“

وہ یک دم تیز ہو گئی۔

”کیا کرتا پھرتا ہوں میں؟..... جتنا وقت گھر میں ہوتا ہوں، تمہارے ہی ساتھ لگا رہتا ہوں۔ ابھی تم سو رہی تھی تو میں وہاں ٹی وی دیکھنے بیٹھ گیا۔“

وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار ہی نہیں تھا، جس پر وہ مزید سلگ گئی۔

”ٹی وی دیکھ رہے تھے حنا کے ساتھ؟.....“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟.....“

”وی جو آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔“

وہ تیزی سے بولتے ہوئے یک دم ڈھس گئی۔

”دانیال!..... اگر آپ کو حنا پسند تھی تو پھر مجھے شادی کیوں کی؟..... حنا سے ہی کر لیتے۔“

”پاکل ہو گئی ہو؟..... ذرا سی بات کا ٹینگر بیٹا تا تم عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔“

وہ بگڑ گیا۔

”ذرا سی بات؟.....“

وہ ڈھکے بولی۔

”یہ ذرا سی بات ہے دانیال؟..... سارا دن آپ حنا کے ساتھ تھے۔ جھٹلائے گامت!..... مجھے سب پتا ہے۔“

”پتا ہے تو میں کیا کروں؟.....“

وہ اب ڈھٹائی پر اتر آیا۔

”میں تمہاری طرح احسان فراموش نہیں ہوں۔ حنا اگر تمہارا اور بھابی کا خیال کر رہی ہے تو ہمیں بھی اس کا خیال کرنا چاہئے۔“

”کچھ زیادہ ہی خیال کر رہے ہیں آپ!..... اور مجھے یہ پسند نہیں ہے۔“

”پسند نہیں ہے تو جا بیٹھو اپنے باپ کے گھر۔!“

وہ کہہ کر تیزی سے نکل گیا تھا۔

”دانیال!.....“

وہ سناٹے میں آ گئی تھی۔

اماں گھوم پھر پھر اسی موضوع پر آ گئی تھیں۔

”قسمت سے اچھا رشتہ مل رہا ہے رابعہ!..... خدمت کرو بیٹا!..... اگر شیراز کی بہن نے ہماری طرف

سے مایوس ہو کر کوئی اور لڑکی دیکھ لی تو میں بچ بکیتی ہوں کہ مجھے بہت تکلیف ہوگی۔“
”اماں!“

رابعہ نے عاجز ہو کر اسی قدر کہا تھا کہ اماں نے اس کی ٹھوڑی پکڑی۔

”مان جاؤ بیٹی.....! اسی میں میری اور تمہارے ابا کی خوشی ہے۔ ہماری زندگی میں اپنے گھر باری ہو جاؤ گی تو چین سے مر بھی کیس گے۔“

”مریں آپ کے دشمن.....! شوبی کو کون دیکھے گا.....؟“

رابعہ روٹھے انداز میں بول رہی تھی۔

”ارے.....! شوبی کے لئے تو ہم جی رہے ہیں، اور تم سن لو.....! شوبی ہمارے ہی پاس رہے گا۔“

تمہارے ابا کی جان ہے اس میں۔“

اماں یوں بولیں جیسے وہ ہابی بھر چکی ہوں۔ ان کا چہرہ بھی چمک رہا تھا۔ وہ نظریں چرا کر دوسری طرف

دیکھنے لگی۔

”پھر میں تمہارے ابا سے کیا کہوں.....؟“

اماں نے قدرے زک کر پوچھا تو وہ جیسے ہار کر بولی تھی۔

”مجھے نہیں پتا اماں.....! جو آپ کا دل چاہے۔“

”خوش رہو.....!“

اماں کھل اٹھیں، اور اسی وقت اٹھ کر اپنے کمرے میں آتے ہی خوجہ صاحب سے بولی تھیں۔

”مبارک ہو میاں.....! رابعہ نے رضامندی دے دی ہے۔“

”اچھا.....! کیا کہا ہے اس نے.....؟“

خوجہ صاحب نے اطمینان سے ہو کر پوچھا۔

”کیا کہے گی.....؟ یہی کہا ہے کہ جو آپ کا دل چاہے، اور میاں.....! میرا دل کہہ رہا ہے، یہی ٹھیک

ہے۔“

”ہاں.....! اللہ چاہے گا تو رابعہ کے حق میں۔“ پھر میں شیراز سے کہہ دوں.....؟“

خوجہ صاحب نے پوچھا۔

”کہہ دیں، لیکن میاں.....! ہمارے پاس تیاری تو ہے نہیں.....؟“

اماں قدر مند ہوئیں۔

”تیاری کیا کرنی ہے.....؟ سادگی سے نکاح کر کے رخصت کرنا ہے رابعہ کو۔“

خوجہ صاحب نے اتنے آرام سے کہا کہ اماں جھج گئیں۔

”کک..... کیا مطلب.....؟ ایسے خالی ہاتھ تو نہیں رخصت کر دیں گے.....؟ میاں.....! کچھ تو دینا

وہاں ہو گا ہی۔“

”ہاں تو جتنی گنجائش ہوگی، دے دیں گے۔ ویسے شیراز بھی منع کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ آپ کو کچھ کرنے

کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کہتے تو سب ہی ہیں۔ پھر بعد میں طعنہ مارتے ہیں۔“

اماں نے کہہ کر سر جھکا تو خوجہ صاحب خاموش ہو رہے۔

”اچھا سنیں.....!“

اماں کو پھر کچھ یاد آیا۔

”آپ کے خیال میں شیراز کب تک نکاح کا کہے گا.....؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں.....؟ ہو سکتا ہے، اس جمعہ کا کہہ دے۔“

خوجہ صاحب کے اطمینان پر اماں ششدر رہ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ رات پھر اپنے کمرے میں گیا ہی نہیں، وہیں لاونچ میں صوفے پر سو گیا تھا۔ صبح سیمانے اسے دیکھا تو

پلٹھکی، پھر اس کا کندھا ہلا کر پکارا۔

”دانیال.....! دانیال.....!“

”جج..... جی.....!“

اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔

”یہ تم یہاں کیوں سو رہے ہو.....؟“

سیمانے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”بس..... بس وہ.....“

وہ اسی قدر کہہ کر اٹھ گیا۔

”کیا بس وہ.....؟ کوئی بات ہوئی ہے.....؟ جھگڑا ہوا ہے ثانیہ سے.....؟“

سیمانہ جتنی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں بھابی.....! آپ کو پتا ہے، میں جھگڑا لونیس ہوں۔ بس وہ ثانیہ.....“

”ہاں ہاں.....! کیا کیا ثانیہ نے.....؟“

سیمانہ کی بے تابی اس نے محسوس ہی نہیں کی۔

”ایسے ہی اٹلی سیدی باتیں کر رہی تھی۔“

”اچھا! چلو، میاں بیوی میں چھوٹی موٹی لڑائیاں ہو جاتی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم یہاں آسو۔۔۔؟ چلو جاؤ کمرے میں۔“

سیدانے قہقہہ اٹھائی دکھائی تو وہ روٹھے انداز میں تکیہ اٹھا کر اپنے کمرے میں آگیا اور ثانیہ کو سوتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ رات وہ دیر سے سوئی ہوگی اس لئے اس نے اسے اٹھایا نہیں اور جلدی جلدی آفس کے لئے تیار ہو کر ناشتہ کئے بغیر ہی نکل آیا تھا اور عجیب بات تھی، اسے ذرا احساس نہیں تھا کہ رات اس نے ثانیہ کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا تھا۔ اس کے برعکس وہ اس کی سوچ پر گڑھ رہا تھا۔ گویا خود کو حق بجانب سمجھتے ہوئے اس نے جلدی جلدی کچھ ضروری فائلیں چیک کیں اور معمول سے بہت پہلے گھر لوٹا تو بھی سیدھا اپنے کمرے میں جانے کی بجائے حنا کو تلاش کرتے ہوئے کچن میں جھانکا تو وہاں سیدھا کو مصروف دیکھ کر اندر آتے ہوئے بولا۔

”السلام علیکم بھابی۔۔۔!“

”وعلیکم السلام۔۔۔!“

سیدھا چوکی تھی۔

”آج اتنی جلدی آگئے۔۔۔؟ ابھی تو کھانا بھی نہیں پکا۔“

”ہاں بس۔۔۔ اور یہ کھانا آپ کیوں پکا رہی ہیں؟ میرا مطلب ہے، حنا کہاں ہے۔۔۔؟“

اس کے حواسوں پر حنا چھائی ہوئی تھی۔

”حنا تو صبح ہی گھر چلی گئی تھی۔“

سیدھا قہقہہ اٹھائی تو وہ سالن کی پتیلی میں چیخ چلائے گی۔

”کک۔۔۔ کیوں؟“

اس کی بے تابانی محسوس کرنے کے باوجود سیدانے اپنی مصروفیت ترک نہیں کی، ہنوز پتیلی میں چیخ چلائے ہوئے کہنے لگی۔

”بھئی۔۔۔! صاف بات ہے دانیال۔۔۔! برداشت ماننا، تمہاری بیوی کو حنا کا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔“

”یہ۔۔۔ یہ آپ سے کس نے کہا۔۔۔؟“

اس نے فوراً پوچھا تو سیدھا کندھے اچکا کر بولی۔

”کسی نے نہیں۔۔۔! میں خود سمجھ سکتی ہوں اور حنا بھی نادان نہیں ہے۔ کہہ رہی تھی، میں نہیں چاہتی کہ

میری وجہ سے دانیال کا گھر ڈسٹر ہو۔“

”پاگل ہے وہ جو ایسا سوچ لیا اس نے۔“

وہ کہہ کر زک نہیں، تیزی سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں آتے ہی ثانیہ پر غرایا تھا۔

”خوش ہو گئی ہو تم۔۔۔؟ مقصد پورا ہو گیا ہے تمہارا۔۔۔؟“

”کیسا مقصد۔۔۔؟“

ثنانیہ بالکل نہیں سمجھی۔

”حنا چلی گئی، یہی چاہ رہی تھی ناں تم۔۔۔؟“

اس نے کہا، تب ثانیہ سلگ گئی۔

”اوہ۔۔۔! تو آپ کو حنا کے جانے کا افسوس ہو رہا ہے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔! ہو رہا ہے افسوس، اور زیادہ افسوس تم پر ہے۔ تمہارے جاہلانہ رویے نے بھابی کی نظروں

میں میری پوزیشن کتنی آکھڑ کر دی ہے۔ کیا سوچتی ہوں گی وہ۔۔۔؟“

”دانیال۔۔۔!“

ثنانیہ نے چیخ کر نوحہ کیا تھا۔

”آپ کو بھابی کی فکر ہے کہ وہ کیا سوچتی ہوں گی۔۔۔؟ مجھ پر کیا بیت رہی تھی، اس کا احساس نہیں ہے

آپ کو۔۔۔؟“

”کیا بیت رہی تھی تم پر۔۔۔؟ بناؤ۔۔۔! زیادہ آرام طلبی نے تمہارے دماغ میں خناس بھر دیا ہے۔

املاات بھول گئی ہو تم اپنی۔“

”اپنی اوقات نہیں بھولی دانیال۔۔۔! آپ زیادہ اونچا اڑنے لگے ہیں۔“

ثنانیہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے مقابل آگئی تھی۔

”میری پرواز ہمیشہ سے اونچی تھی ہمیشہ سے۔۔۔! چنانچہ کیسے میں اپنی سطح سے نیچے آگیا تھا۔۔۔؟“

وہ اس کے مقابل آنے پر دانت پیس کر بولا تھا۔

”کتنی نیچے۔۔۔؟“

وہ مزید سلگ گئی۔

”میں بھی کوئی ایسی گری پڑی نہیں تھی دانیال بیگ۔۔۔! آپ کو پانے کے لئے میں نے اوپھمے ہتھ

کٹے استعمال نہیں کئے تھے۔“

”بس۔۔۔! بند کر دینی بکواس۔۔۔!“

وہ لا جواب ہو کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

محسوس کرنے لگے تھے۔ اماں اس سے کرید کرید کر پوچھتیں کہ کیا ہوا ہے.....؟
جہاں زیب اتنا چپ چاپ اور اتنا تھک سا کیوں رہنے لگا ہے.....؟
وہ کیا جواب دیتی.....؟

بس کام کی زیادتی کا بہانہ کر دیتی تھی۔

لیکن اماں نادان نہیں تھیں۔ اس روز دونوں کو پاس بٹھا کر پوچھا کہ تم دونوں میں کس بات کی رنجش ہے.....؟ وہ کچھ نہیں بولے۔ اس کی طرف دیکھا تک نہیں، جب اسے کہنا پڑا۔

”کوئی رنجش نہیں ہے اماں.....! کوئی جھگڑا بھی نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو آپ سے چھپا رہ سکتا تھا بھلا.....؟“

”جھگڑا تو میں نے نہیں دیکھا۔“

اماں بڑسوچ انداز میں کہتی ہوئی جہاں زیب کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”پھر کیا بات ہے جو تم زیادہ وقت گھر سے باہر رہنے لگے ہو.....؟“

”میں.....؟“

وہ غائب دماغی سے چونکے۔

”ہاں.....! میں تم ہی سے پوچھ رہی ہوں۔“

”میں نے اصل میں ایک عربین بینک میں اپلائی کیا تھا، وہاں میری جاب ہو بھی گئی ہے اور اب وہ لوگ مجھے جدہ بھیجنا چاہتے ہیں۔ بس اسی سلسلے میں کچھ مصروف ہوں۔“

انہوں نے بڑے آرام سے بتایا جبکہ وہ بے حد حیران ہو کر انہیں دیکھ رہی تھی اور اماں ان کی ساری بات سن کر بولیں۔

”ویسے تو یہ اچھی بات ہے بیٹا.....! پھر بھی میں کہوں گی کہ جب یہیں اللہ عزت کی روٹی دے رہا ہے تو پھر باہر جانے کی کیا ضرورت ہے.....؟ کوئی ہل کر وہیں.....“

”نہیں اماں.....! میری اپنی خواہش بھی ہے باہر جانے کی۔“

”لیکن بیٹا.....! ڈھن کا بھی تو سوچو۔ یہ ایسی حالت میں ہے کہ.....“

”یہ یہیں رہے گی، آپ کے پاس یا اپنے میکے۔“

انہوں نے ایک پل کے لئے بھی اسے منہ ہمارے نہیں نکالا۔ اگر صرف یہیں کا کہتے تو وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ اس نے بغور انہیں دیکھا، شاید اندر کا حال جان سکے، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

”کس قدر گھر ہیں۔“

وہ سوچتی ہوئی وہاں سے اٹھ آئی۔ اس کے بعد اسے نہیں معلوم کہ اماں نے ان سے کیا کہا.....!!

”ہاں رہے گی یا اپنے میکے.....؟“

☆.....☆.....☆

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ حنا کے مقابلے میں نرم نہیں پڑے گی خواہ وانیال اس کے ساتھ کتنا جھگڑے۔ وہ سیما اور حنا کی وال نہیں گھٹے دے گی۔ اس لئے وانیال کو دو بدو جواب دینے پر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ البتہ یہ فکر ضرور تھی کہ وہ کہاں چلا گیا ہے.....؟

دو پہرے شام ہو گئی تھی اور اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ سیما سے پوچھ کر اپنی پوزیشن کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لئے اپنے کمرے میں ہی آہٹوں پر کان لگائے بیٹھی تھی کہ فون کی تیل پر ایک دم اچھلی تھی اور دوسری تیل سے پہلے ہی اس نے کارڈ پلس اٹھا لیا تھا۔

”ہیلو.....!“

”ہاں ٹائیپ.....! کیا حال ہے بیٹا.....؟“

دوسری طرف اماں تھیں۔

”جی اماں.....! میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں.....!“

اس نے سنبھل کر جواب دیا تو اماں کہنے لگیں۔

”اللہ کا شکر ہے بیٹا.....! میں نے اس وقت تمہیں یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ پرسوں جدہ کو رابعہ کا

لا رہے۔“

”جج اماں.....؟“

وہ اپنی ساری فکریں بھول گئی۔

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔ وہیں شیراز کے ساتھ سب ملے ہو گیا۔“

”ہاں.....! تمہارے اماں نے اپنا اطمینان کر لیا ہے اور وہ خوش بھی ہیں۔“

اماں نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

”اور آپ اماں.....؟ آپ خوش نہیں ہیں کیا.....؟“

”کیوں نہیں بیٹا.....؟ میں بھی خوش ہوں، بس دل ڈرتا ہے۔“

”خواہ مخواہ وہم نہ کریں اماں.....! اللہ بہتر کرے گا۔“

اس نے فوراً ٹوک کر کہا۔

”انشاء اللہ.....! پھر تم وانیال کو بتا دو اور اگر ہو سکے تو آ جاؤ۔ رابعہ کے جوڑے وغیرہ رکھتے ہیں۔ مجھے تو

پہلے نہیں آ رہی۔“

”آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اماں! میں سب کر دوں گی۔ دانیال آجائیں تو پھر میں ان کے ساتھ آ جاؤں گی، ٹھیک ہے۔!“

”اللہ حافظ!۔۔۔!“

اس نے دانیال کو آتے دیکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ بے اختیار اس کی طرف بڑھ کر بولی تھی۔

”دانیال!۔۔۔! اماں کا فون تھا، جمعہ کو رابعہ کا نکاح ہے۔“

”پھر؟“

وہ ایک لحظہ کو سوالیہ نشان بنا تھا، پھر فوراً سر جھٹک کر بولا۔

”میرا مطلب ہے، اچانک ہے۔؟“

”ہاں!۔۔۔! بس اچانک ہی سب طے ہو گیا۔“

”اچھا!۔۔۔! حیرت ہے۔“

دانیال کے انداز میں حیرت سے زیادہ طنز تھا۔

”حیرت کی کیا بات ہے۔۔۔؟ سادگی سے نکاح ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

وہ مصیبت اس کا طنز نظر انداز کر گئی۔

”ہاں!۔۔۔! دھوم دھڑکا تو پہلی شادی میں ہوتا ہے۔ خیر!۔۔۔! اچھی بات ہے۔“

وہ کہتے ہوئے بیٹھ کر شوز اتارنے لگا تھا کہ وہ اس کے پاس چلی آئی۔

”دانیال!۔۔۔! میں ابھی اماں کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ وہ بے چاری اکیلی پریشان ہو رہی ہیں۔ اگر

آپ جھکے ہوئے نہیں ہیں تو۔۔۔!“

”نہیں!۔۔۔! کوئی ایسی تسکین نہیں ہے۔ چلو تمہیں چھوڑ آؤں۔“

وہ فوراً تیار ہو گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ کبھی نہ جاتی، لیکن مجبوری تھی۔ اندر ہی اندر کڑھتے ہوئے اس

نے بیک میں دو تین سوٹ رکھے اور اسی وقت اس کے ساتھ اماں کے گھر آ گئی۔

دانیال اسے باہر ہی سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ اماں ابا سے مل کر کمرے میں آئی تو رابعہ کو گم سم دیکھ کر

ٹھٹک گئی۔ پھر سرت روی سے قریب آ کر پوچھنے لگی۔

”کیا سوچ رہی ہو رابعہ۔۔۔؟“

رابعہ نے چونک کر اسے دیکھا، پھر پچھلی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

”سوچ رہی ہوں، زندگی کے نئے سفر کا تصور جتنا خوب صورت ہوتا ہے، حقیقت اس سے زیادہ

بھیاں تک روپ میں سامنے آتی ہے۔ کوری آنکھوں میں سمجھنے والے خواب کیسے کرچی کرچی ہو جاتے ہیں۔“

”رابعہ!۔۔۔!“

اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

”میں اس تجربے سے گزر چکی ہوں ثانیہ!۔۔۔! اس لئے چاہئے کہ باوجود خود کو بہلا نہیں پا رہی۔ پتا

نہیں تم سب نے یہ کیسے سوچ لیا ہے کہ میں نے اپنے حصے کے دکھ جھیل لئے، اب آگے میرے ساتھ اچھا ہی اچھا

ہو گا۔ دکھ کبھی پچھتاہیں چھوڑتے ثانیہ!۔۔۔! ابھی نہیں!۔۔۔!“

رابعہ کا کرب اس کے دل میں اُتر رہا تھا۔

”میں تم سے اختلاف نہیں کروں گی رابعہ!۔۔۔! لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ ہر رات کی صبح ضرور ہوتی ہے۔“

”اور یہ بھی سچ ہے کہ نصیب والے ہی صبح دیکھتے ہیں۔“

رابعہ نے آنسو اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا تو وہ سانس کھینچ کر بولی۔

”ہاں!۔۔۔! لیکن آس تو ہر دل میں ہوتی ہے۔ اب پلیز یہ مت کہہ دینا کہ تمہارے دل میں آس بھی نہیں

ہے۔“

اس نے کوشش سے لہجے میں شوخی سمو کر رابعہ کو گدگدایا تھا۔

☆ ☆ ☆

حنانہ قصداً پوائنٹ بس کر دی تھی۔ اس کے بعد یوں جیسے کنوئیں کے انتظار میں کھڑی ہو۔ جبکہ

امیان اسی طرف تھا جدھر سے دانیال کو آنا تھا۔ پھر دُور سے اس کی گاڑی دیکھ کر وہ مزید خود کو انجان ظاہر کرنے لگی

فحشی۔ کچھ دیر بعد ہی اس کے قریب گاڑی کے بریک چر چرائے اور جب دانیال نے پکارا، تب وہ چونک کر اسے

دیکھنے لگی۔

”آ جاؤ!۔۔۔!“

دانیال نے کہنے کے ساتھ ہاتھ سے اشارہ بھی کیا تو وہ فحشی میں سر ہلا کر بولی۔

”نہیں!۔۔۔! میں چلی جاؤں گی۔“

”پتا ہے، جاسکتی ہو۔“

وہ کہتے ہوئے گاڑی سے اُتر آیا اور اس کی طرف سے دروازہ کھول کر بولا۔

”خود بیٹھو گی یا۔۔۔!“

”بس!۔۔۔!“

وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بیٹھ گئی تو وہ ہنستا ہوا ڈرائیونگ پر آ گیا، پھر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھنے

”ہمارا رض ہو۔۔۔؟“

”نہیں..... میں کیوں ناراض ہوں گی.....؟“

”اس کا مطلب ہے ناراض ہو۔“

وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”تم اسے ناراضگی سمجھو یا کچھ بھی، میں بہر حال نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تمہارے اور ثانیہ کے درمیان رنجش پیدا ہو۔“

وہ یہ بات پہلے سے سوچ چکی تھی۔

”تمہاری وجہ سے کچھ نہیں ہوا حنا.....! اور اگر ہوا بھی تو تمہیں پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

دانیال کی آخری بات نے اسے بے پناہ خوشی بخشی تھی، جسے بمشکل چھپا کر وہ بولی تھی۔

”تم ہمیشہ تو میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔“

”کیوں نہیں دے سکتا.....؟“

وہ فوراً کہہ کر پوچھنے لگا۔

”تم بتاؤ، کیا تم ہمیشہ کا ساتھ چاہتی ہو.....؟“

”میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔“

اسے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

”لیکن میں چاہتا ہوں۔“

دانیال نے کہا تو وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو دانیال.....؟ تمہاری بیوی ہے اور.....“

”بچہ بھی ہونے والا ہے۔“

وہ اس کی بات اچک کر پوچھنے لگا۔

”تمہیں اعتراض میرے بیوی بچے پر ہے یا تم مجھے پسند ہی نہیں کرتیں.....؟“

”میں کسی عورت پر ظلم نہیں کر سکتی۔“

وہ بہت چالاکی سے دانیال کو گھیر رہی تھی۔

”ثانیہ پر ظلم نہیں ہوگا حنا.....! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں.....؟“

”اچھا.....! ابھی تو تم مجھے یہیں ڈراپ کر دو، باقی باتیں پھر کہی۔“

وہ بظاہر اس موضوع سے کتر کر بولی تھی اور جیسے ہی دانیال نے گاڑی روکی، وہ فوراً اتر گئی۔ پھر اس کے جاتے ہی وہ رکشہ روک کر یونیورسٹی جانے کی بجائے واپس اس کے گھر آگئی اور لاؤنج سے ہی چلا کر بولی تھی۔

”آپا.....! آپا.....! جلدی سے اچھی سی چائے لے آئیں۔“

”ہائیں.....؟“

سیما کچن سے برآمد ہوئی تھی۔

”یہ تم اس وقت کہاں سے آرہی ہو.....؟“

”بس.....! یونیورسٹی جانے کا موڈ نہیں ہوا، آپ کے پاس آگئی۔“

وہ بیک ایک طرف پھینک کر خود صوفے پر ڈھلے گئی۔

”تمہارے مزے ہیں۔“

”گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا.....؟“

اس نے سیما کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔

”اس وقت کون ہوتا ہے.....؟ ہاں، ثانیہ بھی میکیے گئی ہوئی ہے۔ آج اس کی بہن کا نکاح ہے ناں۔“

سیما بتاتے ہوئے بیٹھ گئی تو وہ انجان بن کر بولی۔

”اس کا مطلب ہے دانیال بھی وہیں ہوگا.....؟ سالی کو رخصت کر کے آئے گا۔“

”ہاں.....! ظاہر ہے، تم ابھی رکوگی.....؟ میرا مطلب ہے، شام میں ثانیہ آجائے گی۔“

سیما نے اس خیال سے کہا کہ ثانیہ کی موجودگی میں اسے نہیں آنا چاہئے۔

”ثانیہ ابھی نہیں آتی آپا.....!“

اس کے اطمینان پر سیما چونکی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا.....؟“

”دانیال کہہ رہا تھا کہ ابھی ثانیہ کو نہیں لائے گا۔“

اس نے ہونٹوں میں مسکراہٹ دبا کر کہا تو سیما نے سمجھ کر اس کے بازو میں چٹکی کاٹی تھی۔

”اور کیا کہا دانیال نے.....؟“

”وہی جو میں چاہتی ہوں۔ کہہ رہا تھا، وہ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔“

اس نے ٹھکھلا کر بتایا تو سیما خوش ہو گئی۔

”سچ کہہ رہی ہو.....؟“

”ہاں.....! بالکل سچ.....!“

☆.....☆.....☆

دانیال عین نکاح کے وقت آیا تھا اور پھر رابعہ کے رخصت ہوتے ہی جانے کی غلت دکھانے لگا تو ثانیہ

فورا اپنا بيگ لے کر آگئی۔

”اچھا اماں.....! میں چلتی ہوں۔“

”ہائیں.....؟ تم بھی جارہی ہو؟“

اماں نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس سے پہلے دانیال بول پڑا۔

”میرا خیال ہے ثانیہ.....! تمہیں ابھی یہیں رہنا چاہئے۔“

”ہاں بیٹا.....! اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔“

”ارے نہیں آئی.....! میں تو خود کہہ رہا ہوں۔ آپ شوق سے جتنے دن چاہیں ٹائیڈ کو لپٹنے پاس

رکھیں۔“

اس نے کہتے ہوئے اچھتی نظر ثانیہ پر ڈالی تھی۔

”خوش رہو بیٹا.....!“

اماں مومنیت سے بولیں تو پھر اس نے ثانیہ کی طرف دیکھا ہی نہیں، جلدی سے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل آیا تھا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کی اس حرکت سے ثانیہ کیا سوچے گی، یا شاید اب اسے پرواہ ہی نہیں تھی۔ جب ہی

ثانیہ سے جان چھڑا کر گھر آیا تو سیما اسے اکیلے آتے دیکھ کر بے شکل اپنی خوشی چپا کر پوچھنے لگی۔

”ہائیں.....؟ تم ثانیہ کو ساتھ نہیں لائے؟“

”وہ..... بھابی.....! اس کی اماں نے اسے روک لیا۔ اصل میں رابعہ کا بچہ بہت رورہا تھا۔ ثانیہ اس کی

وجہ سے بھی رُک گئی۔“

وہ بڑے آرام سے بری الذمہ ہو گیا۔

”ہاں.....! رابعہ کے بچے کا تو بڑا مسئلہ ہوگا۔ رابعہ ساتھ کیوں نہیں لے گئی اپنے بچے کو.....؟“

سیما کو نیا موضوع مل گیا۔ لیکن اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”چنانچہ بھابی.....! مجھے ان کے معاملات میں کودنا اچھا نہیں لگتا۔“

”خیر.....! یہ تو اچھی بات ہے۔ مردوں کو دوسرے کی تو چھوڑو، اپنے گھر کی ٹوہ میں بھی نہیں رہنا

چاہئے۔“

سیما نے کہا تو وہ ہنسنے ہوئے سبز حیاں چڑھ آیا اور اپنے کمرے میں آتے ہی کارڈ لیس اٹھا کر حنا کا نمبر

ڈائل کرنا چاہتا تھا کہ گنگنا ہٹ کی آواز سن کر اس کی نظریں بے اختیار میسر کی طرف اٹھیں۔

”حنا.....؟“

وہ خوش ہو گیا، اور کارڈ لیس رکھ کر دبے پاؤں اس کے قریب جا کر سرگوشی میں بولا تھا۔

”تم کب آئیں.....؟“

”اُف.....!“

حنا گو کہ اسی کی منتظر تھی، پھر بھی چونک کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

”تم نے تو ڈرا ہی دیا۔ دیکھو میرا دل کتنی زورور سے دھڑکنے لگا ہے۔“

”واقعی.....؟“

وہ مرد تھا، اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر بے شک لگا تھا کہ حنا شرمناک رہا کر بھاگ گئی۔ وہ اس کے پیچھے دیکھتا رہ گیا، پھر

پہلو دیر کرے میں رُک کر نیچے آیا تو لاؤنچ میں حنا دی وی آن کے بیٹھی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو.....؟“

اس نے حنا کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے کر چینل چینج کر دیا۔

”کیا کر رہے ہو.....؟ میں ڈرامہ دیکھ رہی ہوں۔“

حنا نے ریموٹ کنٹرول لینا چاہا، لیکن اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”دانیال.....! پلیز دونوں.....!“

”لے لو.....!“

اس نے ریموٹ والا ہاتھ اوپر اٹھالیا تو حنا اس کے ہاتھ سے ریموٹ چھیننے کی کوشش میں تقریباً آدھی

اس کے اوپر تھی اور اسی وقت کمال حسن آفس سے لوٹے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر نہ صرف ٹھٹکے بلکہ ان کی پیشانی پر

ناگواری کی لکیریں بھی ابھر آئی تھیں۔

”بھیا.....؟“

دبلی سرگوشی میں حنا کو آگاہ کرتے ہوئے دانیال گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن کمال حسن ز کے نہیں، سیدھے

اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

”اوگاڈ.....!“

دانیال نے گہری سانس کھینچی تو حنا انجان بن کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا.....؟“

”کچھ نہیں.....!“

وہ قصداً کچھ جتانے سے باز رہا اور اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ سیما نے کھانے کے لئے بلا لیا۔

”مجھے تو ابھی بھوک نہیں ہے۔“

حنا کہتے ہوئے بچوں کے کمرے میں چلی گئی اور بھوک تو اسے بھی نہیں لگی تھی، لیکن کمال حسن کی وجہ سے

وہ اننگ روم میں آ گیا۔

کچھ دیر بعد کمال حسن چینیج کر کے آئے تو وہ درزیدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ ان کا چہرہ بالکل سپاٹ

”شروع کرو دانیال کیا لو گے؟“

سیما نے بیٹھتے ہوئے اس سے کہا تو وہ چونک کر بولا۔

”جی!“

”کہاں گم ہو؟“

سیما نے ہنس کر ٹوکا۔

”جی کہیں نہیں!“

وہ شیشا کر اپنی پلیٹ میں سائن نکالنے لگا تو کمال حسن نے بظاہر سرسری انداز میں اسے مخاطب کر کے

پوچھ بیٹھا۔

”دانیال! ثانیہ کہاں ہے؟“

”ثانیہ اپنے میکے گئی ہے، میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ اس کی بہن کا نکاح تھا۔“

سیما نے فوراً جیسے اسے مشکل سے نکال لیا تھا۔

”نکاح ہو گیا، پھر اب ثانیہ وہاں کیا کر رہی ہے؟“

کمال حسن کا انداز جارحانہ تھا۔

”ارے! آپ تو“

”تم چپ رہو، میں دانیال سے بات کر رہا ہوں۔“

کمال حسن سختی سے سیما کو ٹوک کر پھر اس سے کہنے لگے۔

”دانیال! میری بیوی نے تمہاری بہت خدمتیں کر لیں، اب اپنی گھریلو ذمہ داریاں تم اپنی بیوی پر

ڈالو۔ سمجھ رہے ہوتاں!“

”جج جی!“

وہ ان کا مطلب سمجھ کر کچھ خائف ہو گیا تھا۔

”میں گھر میں کوئی بدمزگی نہیں چاہتا۔“

کمال حسن اسے تنبیہ کرتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے تو سیما اسے دیکھ کر بولی۔

”انہیں کیا ہوا ہے؟“

وہ کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”آخر آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟“

رات میں جب وہ سونے کے لئے لیٹے تو وہ ان کے سر پر کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

”مجھے پریشان مت کرو۔“

انہوں نے کہا اور سر کے نیچے سے تکیہ کھینچ کر منہ پر رکھ لیا۔

”میں واقعی آپ کو پریشان نہیں کروں گی اگر آپ مجھے اس اذیت سے نکال لیں، یا تو میرا قصور معاف

کریں، یا پھر“

”تم کیا جاہتی ہو، ابھی چلا جاؤں یہاں سے؟“

وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔ لہجے میں کاتھمی جیسے محسوس کر کے اس نے سوچا،

شاید اسی طرح طیش میں آ کر ہی وہ اپنا خیال ظاہر کر دیں کہ اس کے بارے میں انہوں نے کیا سوچا اور کیا کرنے کا

ارادہ رکھتے ہیں؟

”اگر آپ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں اور میرا وجود برداشت نہیں کر پار ہے تو مجھے جانے کی اجازت

دیں۔“

انہوں نے ہونٹ بھیجنے لئے، جیسے اپنے آپ کو کچھ کہنے سے باز رکھا ہو۔

”اس طرح خاموش مت رہیں۔ جہانزیب! پلیز“

وہ منت سے بولی۔

”شکر کرو، میں خاموش ہوں، ورنہ طوفان اُٹھنے میں کیا دیر لگتی ہے؟“

انہوں نے کہا اور تکیہ اٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔ تب وہ رو پڑی۔ یہ صورت حال اب واقعی اس کے

لئے ناقابل برداشت تھی۔ ہر پل یہ دھڑکا ”پتا نہیں کیا ہو؟“

گویا اس کی زندگی کا سارا اختیار مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں تھا۔ پتا نہیں وہ واقعی کوئی فیصلہ نہیں کر پا

رہے تھے یا جان بوجھ کر اسے اس اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا؟

اور اب تک تو وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ وہ ان کے رحم و کرم پر ہے اور وہ مکمل با اختیار۔ لیکن اب اچانک

اس کا ذہن پلٹ گیا۔

”یہ سراسر زیادتی ہے۔“

وہ سوچنے لگی۔

”یہ صحیح ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، وہ بھی انجانے میں۔ لیکن میں اتنی قصوروار ہرگز نہیں کہ مجھے لمحہ کمتری

کا احساس بخش کر میری ہستی کا غور ہی چھین لیا جائے۔ پھر میں نے تو آ رہا یا پارسوچ کر اعتراف کیا تھا۔ یہ درمیانی

راستہ تو گمان میں بھی نہیں تھا۔ جہانزیب اگر اپنا ظرف بڑا نہیں کر سکتے تو انہیں یہ حق بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے حالات

پیدا کر دیں کہ میں ہمیشہ ایک مجرمانہ احساس میں گھری رہوں۔“

”نہیں.....! میں نے فیصلے کی ڈوران کے ہاتھ میں اس لئے تھمائی تھی کہ وہ غیر جانبداری سے سوچیں گے، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے اور اب اپنے بارے میں، میں خود سوچوں گی اور خود فیصلہ کروں گی۔“

اس کے بعد نیند آنے تک وہ نئے سرے سے گزشتہ حالات کو سوچتی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

رابعہ سر جھکا لے لیکن پوری توجہ سے شیراز کی باتیں سن رہی تھی، جو کہہ رہے تھے کہ انہوں نے اپنے بچوں سے یہ کہہ رکھا ہے کہ ان کی ماما بہت جلد واپس آ جائیں گی۔ ہما تو خیر بہت چھوٹی تھی، لیکن سنی اپنی ماما کا پوچھتا تھا، اور آج انہوں نے سنی سے یہی کہا تھا کہ وہ اس کی ماما کو لینے جا رہے ہیں، جس کا مطلب تھا کہ اس معصوم بچے کو اپنی ماں یاد نہیں تھی۔ بہر حال وہ ان کی بات سمجھ گئی تھی۔ پھر شیراز احمد اسے بچوں کے کمرے میں لے آئے اور سنی کو پکار کر بولے۔

”سنی بیٹا.....! آپ کی ماما آئی ہیں۔“

سنی نے پہلے حیران ہو کر دیکھا، پھر ایک دم خوش ہو کر اپنی جگہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور دونوں بازو پھیلانے تو اس نے بے اختیار بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

”میں آگئی ہوں بیٹا.....! اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”اوکے بیٹا.....! آپ ماما سے باتیں کرو۔“

شیراز احمد امینان سے ہو کر کمرے سے نکل گئے تو وہ کچھ چونک کر ان کے پیچھے دیکھنے لگی۔

”آپ اتنے دنوں سے کہاں چلی گئی تھیں ماما؟“

سنی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ کر پوچھا تو وہ ذرا سا مسکرائی۔

”کتنے دنوں سے؟“

”اتنے بہت سارے دنوں سے۔“

”آپ مجھے یاد کرتے تھے؟“

وہ اس کا جواب گول کر گئی۔

”جی.....! اور ہما تو بہت روتی ہے۔ گندی پٹی ہے۔“

سنی کے کہنے پر اسے ہما کا خیال آیا تو وہ اسے چھوڑ کر کاٹ کے پاس آئی۔ سال بھر کی بچی منہ میں فیڈر لئے بے خبر سو رہی تھی۔ فیڈر میں دودھ نہیں تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، کمرے میں کہیں تھرماس اور دودھ وغیرہ نہیں تھا، تب وہ سنی سے پوچھنے لگی۔

”ہما کا دودھ کہاں ہے بیٹا.....؟“

”چاہئیں.....!“

سنی کی لاعلمی پر اس نے کچھ دیر سوچا، پھر کہنے لگی۔

”چلو.....! آپ مجھے کچن میں لے چلو۔ پہلے ہما کا فیڈر بنائیں گے، پھر آپ کو بھی دودھ پینا ہے۔ اس

کے بعد سوئیں گے۔“

”چلیں.....!“

سنی بیڈ سے اُتر اُتو وہ رک کر اس کے پیچھے چلنے لگی۔ پھر اس کام سے فارغ ہو کر اس نے سنی کو ٹوٹی کی طرح دھیرے دھیرے تھپک کر سلایا اور اس کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے.....؟

شیراز احمد تو بڑے آرام سے اُسے بچوں کے پاس چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جاتے ہوئے اس سے کچھ کہا بھی نہیں تھا، کوئی ذمہ داری جملہ یا مسکراہٹ میں چھپا کوئی اشارہ، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تب بھی وہ خود سے جا کر ان کے دروازے پر دستک نہیں دے سکتی تھی۔

زیر پاؤڑ کی مدد ہم سب روشنی میں اس نے وال کلال پر نظر ڈالی، سوا بارہ ہو رہے تھے۔ تب وہ سنی کے ساتھ لیٹنا چاہتی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونک کر ادھر دیکھنے لگی۔ شیراز احمد مسکراتے ہوئے اس کی طرف آ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”شکر ہے سب کام بخیر و خوبی نپٹ گئے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم میاں بیوی کو حج کرا دے۔ بڑی آرزو ہے مکہ مدینہ دیکھوں۔“

اماں بھری کاٹھ بونے رابعہ کی شادی پر شکر کرتے ہوئے بولیں تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا، پھر پوچھنے لگی۔

”اماں.....! انسان کو سارے کاموں کے بعد ہی مکہ مدینہ کیوں یاد آتا ہے؟ پہلے کیوں نہیں خیال

آتا.....؟“

”خیال تو آتا ہے بیٹا.....! لیکن دنیاوی جھیلے اس خیال پر حاوی ہو جاتے ہیں۔“

اماں نے آہ بھر کر کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”ساتھ شیطان بھی حاوی ہو جاتا ہے اماں.....! جیسی تو جھیلیوں سے نکلنے میں آدھی سے زیادہ عمر گزر

جاتی ہے۔“

”ہاں.....!“

اماں نے ہاں کو لمبا کھینچا تھا۔ تب ہی رابعہ کی آواز آئی تھی۔

”السلام علیکم“

”ارے.....!“

وہ رابعہ کو دیکھ کر خوشی کے اظہار کے ساتھ اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔

”کیسی ہو.....؟“

”اچھی ہوں۔“

رابعہ مسکرائی، پھر اس سے الگ ہو کر اماں کے گلے لگ کر پوچھنے لگی۔

”شوہنی کہاں ہے اماں؟ تنگ تو نہیں کیا اس نے آپ کو؟“

”ارے نہیں بیٹا۔! تنگ کیوں کرے گا.....؟ ماشاء اللہ آرام سے ہے۔“

اماں نے کہہ کر رابعہ کی پیشانی چوم لی۔

”اچھا.....! میں دیکھ لوں اپنے بچے کو.....؟“

رابعہ بے قراری سے کمرے کی طرف بڑھی تو وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی اور اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

رابعہ نے سوئے ہوئے شوہنی کو اٹھادیا تھا اور اسے گدگداتے ہوئے خود بھی ہلکھلھارہی تھی۔

”ماشاء اللہ.....! اللہ نظر بد سے بچائے۔ سچ، میں تو تمہاری ایسی ہنسی کو ترس گئی تھی۔“

اس نے کہا تو رابعہ جھینپ گئی، پھر شوہنی کو بٹھا کر پوچھنے لگی۔

”تم ابھی رہو گی.....؟“

”پتا نہیں.....!“

وہ اچانک آزدگی میں گھر گئی۔

”کیا مطلب.....؟“

رابعہ اس کی آزدگی محسوس کر کے ہنسی گئی۔

”کچھ نہیں.....!“

وہ رابعہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، جب ہی سر جھٹک کر زبردستی مسکرائی تو رابعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر

اپنے ساتھ بٹھالیا۔

”ٹائیہ.....! کوئی بات ہوئی ہے کیا.....؟ مجھ سے چھپا رہی ہو.....؟“

”ارے نہیں.....! تم سے کیوں چھپاؤں گی.....؟“

”پھر بتاؤ ناں کیا بات ہے.....؟“

رابعہ کے محبت بھرے اصرار پر وہ ڈھمکے گئی تھی۔

”میں بہت پریشان ہوں رابعہ.....! پتا نہیں میری جھٹانی کا مقصد کیا ہے.....؟ دانیال کو انہوں نے ایسا

”نہ.....! کیا ہوا ہے کہ وہ ان کے خلاف کچھ سننا ہی نہیں چاہے۔ جائز بات بھی نہیں۔ وہ جو کہہ دیتی ہیں، اسی پر ایمان لے آتے ہیں۔“

”کیوں.....؟ میرا مطلب ہے، تمہاری جھٹانی تمہارے ساتھ کیسی ہیں.....؟“

رابعہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”بظاہر بہت اچھی ہیں، یہی تو ان کی چالاکی ہے۔ یوں ظاہر کر رہی ہیں جیسے میری سب سے بڑی ہمدرد

اور یہی خواہ رہی ہوں۔ جبکہ اندری اندر جانے کیا کھجڑی پکار رہی ہیں.....؟“

وہ اپنے آپ میں اُلجھتے ہوئے بول رہی تھی۔ رابعہ بھی اٹھ گئی۔

”میں تمہاری بات نہیں سمجھ رہی، کھل کر بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے.....؟“

”اصل معاملہ.....؟“

وہ شش و شش میں رابعہ کو دیکھنے لگی۔

”بتاؤ ٹائیہ.....!“

رابعہ نے اس کا ہاتھ ہلایا تو اس کے سینے سے گہری سانس خارج ہو گئی۔ پھر پہلے اس نے رابعہ سے اماں

کو نہ بتانے کا وعدہ لیا، اس کے بعد کہنے لگی۔

”معاملہ یہ ہے کہ جب سے میں پریکٹس ہوئی ہوں، میری جھٹانی نے یہ کہہ کر کہ مجھے آرام کی ضرورت

ہے، مجھے میرے کمرے تک محدود کر دیا ہے اور کام کے بہانے سے اپنی بہن حنا کو بلا لیا ہے جو وقت بے وقت میرے

کمرے میں خصوصاً دانیال کی موجودگی میں ٹھہسی چلی آتی ہے۔“

”تم نے دانیال سے کہا نہیں.....؟“

رابعہ نے بے صبری سے پوچھا تھا۔

”کہا ہے، بلکہ میری دانیال سے لڑائی بھی ہو چکی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں اپنا کام خود کر سکتی ہوں،

لیکن انہوں نے اُلٹا مجھے ڈانٹ دیا۔“

”اور اُس روز جو میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ دانیال اور حنا شاہنگ مال پر نظر آئے تھے.....؟“

رابعہ کو فوراً یاد آ گیا تھا۔

”ہاں.....! میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ میں نے ہی حنا کو بھیجا تھا، جبکہ میرے علم میں ہی نہیں تھا۔“

”اُف.....! تم نے بتایا تو میں چکر اُڑ گئی تھی۔“

”اُف.....! تم نے مجھے بھی چکر ادا دیا۔“

رابعہ نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر جھٹکا، پھر تاسف سے کہنے لگی۔

”مجھے تمہاری جھٹانی کے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، ان کا ارادہ دانیال کی شادی

حنا سڄو ڪرڻ کان تها، ليڪن شايد اس وقت دانيال نٿيس مانا هوگا۔

”ليڪن رابع.....! اب تو دانيال کي شادي هوچي هے۔“

وه عاجز هو ڪر بولي تهي۔

”حنا کي تو نٿيس هوئي۔“

رابع کي لڳي هئو، وه سمجھي تهي۔

☆.....☆.....☆

”خيريت.....؟ تم اتني جلدی ڪيسے آگئے.....؟“

”بس.....! وه..... سر ميں درد تها۔ پليز.....! ايڪ ڪپ چائے بھجو اويس۔“

دانيال ڪپي هئو ۽ اڀي ڪرے ميں چلا گیا۔

”ميں بنا تي هوں چائے۔“

حنا فوراً اُٿھ ڪر ڪچن کي طرف بھاگي تهي اور پاڻچ منٺ ميں چائے لے ڪر دانيال کي ڇيڇھ چئي گئي تو سيماس

نے اپنا سر پيٽ ليا۔

”يہ لڙڪي بنا بنا يا ڪھيل بگاڙ دے گی۔ ذرا عقل ھيں ھے اس ميں، ڪجهه دن صبر نٿيس ڪر سکتی۔“

سيماس بڙو ڊاٽي هئو ۽ اُٿھ ڪر اڀي ڪرے کي طرف بڙي تهي ڪه ٿاڻيہ ڪو آتے ڏيکھ ڪر ٽھڪ ڪر رک گئي۔

”السلام عليڪم بھابھي.....!“

ٿاڻيہ نے سلام ڪيا تو وه بمشڪل خود کي سنبھالتے هئو بولي۔

”ارے ٿاڻيہ.....! تم ڪيسے آئيئیں.....؟ مير مطلب ھے، ڪس ڪي سا تھ آئي هو.....؟“

”بھابھي.....! وه رابع ڇھوڙ گئي ھے۔“

ٿاڻيہ زبردستي مسڪرائي تهي۔

”اچھا.....! ھاں..... رابع..... ڪيسی ھے رابع.....؟ خوش تو ھے ناں.....؟“

سيماس کي بے وقت آمد پر بوکھلائي تهي۔

”جي.....!“

”ھے ڪھاں رابع.....؟ ڪمال ھے، تم نے اسے باھري ڪھرا ڪھا ھے۔ جاؤ اندر لے ڪر آؤ۔ ميں بهي مل

لوں اس سے۔“

وه حنا کي خبردار ڪرڻے ڪے لے ڪي طرح ٿاڻيہ کي اڏھرا ڏھر ڪرنا چاھي تهي۔

”بھابھي.....! وه اصل ميں رابع جلدی ميں تهي۔“

”ٻائیں.....؟ باھري باھرے چلي گئي.....؟ يہ تو اچھي بات نٿيس ھے۔ تم نے جان ڪيوں ڊا ايس.....؟“

اچھا آؤ ميرے ڪرے ميں، تمھيں اپني شاڻگ دکھاؤں، ابھي ڪجهه ڀريلے ھي تو آئي هوں ميں مارڪيٽ سے۔ تمھارے

لے بهي دو سوٺ لائي هوں، آؤ۔“

”جي.....! آپ چليں ميں يہ بيگ رکھ ڪر آتي هوں۔“

ٿاڻيہ سھولت سے ڪپي هئو ۽ سيماس کي بڙو ڊاٽي ڪرڻي ڏي، ليڪن اس

نے کوئي دھيان نٿيس ڏيا۔ ليڪن اڀي ڪرے ميں داخل هو تے ھي وه سٺائے ميں آگئي تهي۔ حنا اور دانيال بيٺڙ پر بيٺھ

ٽاش ڪھيل رے تھے۔

سيماس مسلسل ڪمال حسن کي باتون ميں اُلجھ رهي تهي۔ اس کي سمجھ ميں نٿيس آر ھا تها ڪه اڇا ڪا ڪا نٿيس ڪيا هو ڪيا ھے.....؟ وه جو هميشه گھرو معاملات سے خود کي ڏور رکھتے تھے، انھيں ٿاڻيہ ڪا ڪيڪ ميں رکنا ڪيوں ڪھل رھا تها.....؟ وه يہ گھڻي سلجھائے ميں اتني گھڻي ڪا حنا کي پڪار سٺائي ھي نٿيس ڏي۔ جب حنا نے اس ڪے قريب بيٺھ ڪر اس ڪے ڪنڊھ پر ھا تها مارا تو وه اُچھل ڪر اسے گھوڙي لڳي۔

”آف آڀا.....! آپ ڪي ڪا غصہ مجھ پر مت ٽڪالے بيٺھ ڇايے گا۔“

حنا نے ڪھا تو وه سر جھٽڪ ڪر رھ گئي۔

”ويسے آڀا.....! هو ڪيا ھے.....؟“

حنا نے پھر ڀو پھرا تو وه ٽٽي ميں سر ھلا ڪر ڪيئي گئي۔

”مجھ جو نٿيس پتا ڪيا هو ھے.....؟ رات تمھارے ڏلھا بھائي پتا نٿيس ڪس بات پر بگڙے هئو تھے۔

دانيال سے بهي عجيب لڳي ھي بات ڪر رھ ھے تھے۔

”ڪيا.....؟ ڪيا ڪھ رھ ھے تھه دانيال سے.....؟“

حنا نظريں ڇراے هئو ۽ ھي ڀو پھري گئي۔

”ڪيئي ڪه ٿاڻيہ ڪيڪي ڪيوں ھے.....؟ اب تم اپني ذمہ داري ٿاڻيہ پر ڏالو۔ مير کي سمجھ ميں نٿيس آر ھا، انھيں

ٿاڻيہ ڪا ڪيڪ ڪا ڪيوں ڪھل رھا ھے.....؟“

سيماس ڪمال حسن کي ٽٽل اُٿار تے هئو ۽ بتا رهي تهي ڪه حنا ڀول پڙي۔

”ڏلھا بھائي ڪو ٿاڻيہ ڪا ڪيڪ ڪا ڪيوں ڪھل رھا آڀا.....! بلڪه مير ايھاں رھنا ڪھل رھا ھے۔“

”تمھارا.....؟“

سيماس تڙتڙ اور نا سمجھي ميں سے ڏيکھي لڳي تهي۔

”جي.....! اصل ميں رات ميں اور دانيال ايھاں بيٺھي ٿي ڏي ڏيڪھ رھ ھے تھه ڪه.....“

حنا نے دانيال کي ڪو آتے ڏيکھ ڪر بات اڏھوري ڇھوڙ ڏي تو سيماس بهي سنبھل ڪر دانيال سے مخاطب هوئي۔

”دانیال.....! یہ..... یہ لڑکی“

مارے غصے کے اس سے بولا ہی نہیں گیا۔

”تم؟“

دانیال ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تو حنا نے بھی اس کی تقلید کی۔

”غلط وقت پر آگئی ہوں شاید میں۔“

وہ دکھ سے بولی، پھر حنا کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔

”تمہیں میرے کمرے میں آنے کی ہمت کیسے ہوئی، وہ بھی میری غیر موجودگی میں؟“

اس کا بس نہیں چل رہا تھا حنا کا منہ نوچ لے۔

”دانیال.....!“

حنا نے مدد کے لئے دانیال کو پکارا تو وہ اس پر بگڑنے لگا۔

”ثانیہ.....! تمیز سے بات کرو۔ حنا کو کمرے میں، میں نے بلایا تھا۔“

”کیوں؟“ کیوں بلایا تھا آپ نے اسے کمرے میں؟ کیا لگتی ہے یہ آپ کی؟“

وہ تیزی سے دانیال کی طرف گھومی تھی تو وہ قدرے بوکھلا کر حنا کو دیکھنے لگا۔

”کیا سننا چاہتی ہو تم؟ میں بتاتی ہوں کہ میں دانیال کی کیا لگتی ہوں؟“ میں اور دانیال اچھے

دوست ہیں اور بس.....!“

حنا نے چبا چبا کر کہا اور پھر رُکی نہیں، تیزی سے کمرے سے نکل گئی تو دانیال نے اس کی طرف سے منہ

موڑ لیا۔

”منہ کیوں موڑ رہے ہیں دانیال.....؟ میری طرف دیکھیں۔“

اس نے دانیال کا بازو دیکھنا پھر دکھ سے بولی تھی۔

”میری محبت میں کیا کیا ہے جو آپ اپنی وفاداریاں بدل رہے ہیں؟“ بتائیں دانیال.....! میں لے

تو اپنا سب کچھ آپ کو مان لیا تھا، پھر آپ مجھ سے دامن کیوں چھڑا رہے ہیں.....؟“

”یہ محض تمہارا وہم ہے ورنہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“

دانیال کا لہجہ کمزور تھا۔

”میرا وہم ہے، جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں، وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ صرف مجھے نہیں، خود کو بھی

دھوکہ دے رہے ہیں دانیال.....! جس راستے پر آپ چل رہے ہیں، وہ آپ کو پتا ہی نہیں کہاں لے جائے گا؟“

”پلیز ثانیہ.....!“

وہ ہاتھ اٹھا کر بولا تھا۔

”مت خود کو ہلکان کرو، جو تم سمجھ رہی ہو، ویسا کچھ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے.....! مان لوں گی کہ میں غلط سمجھ رہی ہوں، اگر آپ حنا کا اس گھر میں داخلہ بند کر دیں۔“

”شٹ آپ.....!“

دانیال کو کوئی جواب نہیں سوجھا تو اسے خاموش کرا کے کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ کتنی دیر اس کے پیچھے

بکھتی رہی، پھر بیڈ پر گرتے ہی اس کے آنسو روانی سے جھلک گئے۔ ایک تو ایسی حالت میں تھی، اس پر شدت گریہ

لے اسے بالکل بڑھال کر دیا تھا۔ شام میں نیچے آئی تو کمال حسن اسے دیکھتے ہی تشویش کا اظہار کرنے لگے۔

”کیا ہوا ہے ثانیہ.....؟ تم اتنی کمزور ہو رہی ہو.....؟“

”کھاتی جینی جو نہیں ہے۔“

سیما فوراً بولی تھی۔

”یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ دانیال.....! تم خیال نہیں کرتے؟“ جاؤ چیک آپ کراؤ اس کا۔ ڈاکٹر سے

پوچھو بھوک کیوں نہیں لگتی ہے اسے؟“

انہوں نے دانیال کو تنبیہی انداز میں مخاطب کر کے کہا تو سیما پھر بول پڑی۔

”ہاں.....! میں بھی تو یہی کہتی ہوں، ڈاکٹر سے اس کی ڈائنٹ کے بارے میں ضرور پوچھ لیا کرو۔ کافی

کمزور ہو گئی ہے۔“

”جی.....!“

دانیال جربز ہو کر اسی قدر کہہ سکا۔

”کیا جی.....؟ ابھی لے کر جاؤ اسے ڈاکٹر کے پاس، اور.....“

کمال حسن کی بات پوری ہونے سے پہلے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اسے دیکھ کر بولا۔

”چلو.....!“

”جاؤ ثانیہ.....! تمہیں خود بھی اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے۔“

کمال حسن نے اسے نرمی سے ٹوکا تو وہ ڈراسا سر ہلا کر دانیال کے ساتھ چل پڑی۔ تمام راستہ وہ نروٹھا بنا

رہا تو اس نے بھی بات نہیں کی۔

اور پھر کتنے دن گزر گئے۔ دانیال کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا۔ وہ بات کرتی تو جواب دیتا ورنہ خود سے نہیں بولتا

تھا۔ وہ پریشان ضرور تھی، لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ اس دن کے بعد سے حنا نہیں آئی تھی، جس سے وہ یہ سمجھنے لگی تھی کہ

اس کے کہنے پر ہی دانیال نے حنا کا اس گھر میں داخلہ بند کر دیا ہے، اور یہ اس کی خوش فہمی تھی۔

اس وقت وہ لاؤنج میں کشن کے کورز چینیج کر رہی تھی کہ فون کی بیل بجنے لگی۔ سیما بچن میں تھی، اس نے

کشن رکھ کر فون اٹھالیا۔

”ہیلو!“

”تم مجھے اپنے کمرے سے نکال سکتی ہو، اس گھر سے نکال سکتی ہو، لیکن دانیال کے دل سے نہیں نکال سکتیں۔“

”سکتیں۔“

ادھر اس کی آواز سنتے ہی کہا گیا تو وہ بلا ارادہ بولی تھی۔

”کون؟“

”دانیال کی پہلی اور آخری چاہت!“

”حنا؟“

اس کی زبان بے ساختہ پھسل گئی تھی۔ ادھر حنا کھلکھلا کر ہنسی پھر جتا کر بولی تھی۔

”مجھے پہچاننے کا مطلب جانتی ہو، یعنی تم تسلیم کر رہی ہو کہ دانیال کی پہلی اور آخری چاہت میں ہی ہوں۔“

”ہوں۔“

اس نے ایک دم فون منقطع کر دیا، پھر پلٹی تو سیما کو کھڑے دیکھ کر انجان سی بن گئی۔

”کس کا فون تھا؟“

سیما کھوجتی ہوئی فونوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آپ کی بہن کا۔“

اس نے سرسری بتایا، لیکن چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی۔

”پھر فون بند کیوں کر دیا؟“

سیما نے پوچھا تو وہ فوراً بولی تھی۔

”اس کی زبان کو لگام دینے کے لئے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

سیما تیز ہو گئی تو وہ بھی خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔

”اپنی بہن سے پوچھیں، بہت شوق ہے اسے میرے اور دانیال کے درمیان آنے کا۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو؟ شرم نہیں آتی میری بہن پر الزام لگاتے ہوئے؟“

سیما آؤٹ ہو گئی۔

”میں الزام نہیں لگا رہی، سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ بھی جانتی ہیں، سب دیکھ رہی ہیں آپ، اور بجائے

اپنی بہن کو سمجھانے کے مجھ پر ناراض ہو رہی ہیں۔؟ آخر کیوں؟“

وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

”کیونکہ تم غلط بات کر رہی ہو۔“

”غلط میں نہیں، آپ ہیں۔“

اس کے برابر سے جواب دینے پر سیما تھلا کر چیختی تھی۔

”ٹانیہ! اپنی حد میں رہو۔“

”میں اپنی حد میں ہی ہوں۔ باقی سب کو بھی اپنی حدود میں رہنا چاہئے۔“

وہ کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ سیما کتنی دیر دانت پیست رہی، پھر کچھ سوچ کر دانیال کو آفس

فون کر ڈالا۔

”ہیلو!“

دانیال نے تیسری بیل پر فون اٹھایا تو وہ آواز بھرا کر اسی قدر بولی تھی۔

”دانیال!“

”کون؟“

وہ غائباً پہنچا نہیں تھا۔

”دانیال! میں بات کر رہی ہوں تمہاری بھابی۔“

اس نے مزید ناک سے یوں شوشوں کی آواز نکالی جیسے رو رہی ہو، اور ادھر وہ پریشان ہو گیا۔

”بھابی! کیا ہوا ہے بھابی؟ آپ رو کیوں رہی ہیں؟ بتائیں ناں بھابی! سب خیریت

تو ہے ناں؟“

”ہاں! خیریت ہی ہے۔“

روٹھا انداز تھا۔

”پھر آپ رو کیوں رہی ہیں؟“

”بس وہ۔۔۔۔۔“

وہ شاطر عورت تھی۔

”دیکھو! میں تم سے شکایت نہیں کر رہی، بس تم ثانیہ کو آرام سے سمجھا دینا۔“

”کیا مطلب؟“

وہ کیا سمجھتا۔

”بس! وہ ابھی ثانیہ نے مجھ سے بہت بدتمیزی کی ہے اور حنا پر بھی اتنے گندے گندے الزام لگائے

ہیں۔ مجھے اگر ثانیہ کی ذہنیت کا پتا ہوتا تو میں کبھی اپنی بہن کو گھر نہ بلاتی۔“

وہ مظلومیت سے بول رہی تھی۔

”حنا کو پتا چل گیا تو اس کے دل پر کیا گزیرے گی؟“

”ارے نہیں بھائی!“

وہ فوراً بولا تھا۔

”آپ پلیز جتنا سے کچھ مت کہئے گا۔ میں تانیہ کو سمجھا دوں گا۔“

”ہاں.....! دیکھو آرام سے سمجھانا، جھگڑا مت کرنا اس سے۔ سمجھ رہے ہوں.....؟“

”جی.....!“

”اچھا.....!“

سیما فون رکھ کر مسکرائی تھی۔

☆.....☆.....☆

”جہانزیب.....! میں آج امی کے گھر جاؤں گی۔“

صبح ناشے کی ٹیبل پر سب کی موجودگی میں اس نے انہیں مخاطب کر کے کہا تو بس ایک پل کو ان کا ہاتھ زکا تھا، لیکن پھر فوراً وہ اسی طرح مصروف ہو گئے اور وہ ان کی لاطعلقی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئی۔

”بہت دن ہو گئے ہیں گئے ہوئے۔ آپ اسی وقت مجھے ساتھ لے کر جائیں گے یا.....“

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے غلٹ کا مظاہرہ کیا۔

”میرا خیال ہے، امی کا گھر آپ کے راستے میں پڑتا ہے۔“

اس نے کہا اور تائید کے لئے اماں کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگیں۔

”ٹھیک تو ہے.....! جاتے ہوئے چھوڑتے جانا۔ کئی بار اس کی امی کا فون بھی آچکا ہے اور اس روز تو مجھ

سے شکوہ بھی کر رہی تھیں۔ شاید ان کا خیال ہے کہ ہم نے اسے پابند کر رکھا ہے۔“

پتا نہیں انہیں اپنی کیفیات چھپانے میں اس قدر کمال کیونکر حاصل تھا.....؟ وہ جو انہیں بغور دیکھ رہی

تھی، وہ بھی نہیں جان سکی کہ وہ اندر ہی اندر کیسے بیچ و تاب کھا رہے تھے.....؟ جبکہ بظاہر اپنا سابقہ قلب و لہجہ برقرار رکھ

کر بولے۔

”چلو.....!“

وہ ان سے پہلے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ جلدی جلدی بیگ میں چند جوڑے کپڑوں کے رکھے اور

بالوں میں اوپا اوپر سے برش کر کے بیک اٹھاتی ہوئی برآمد میں آ گئی۔ وہ جہانگیر کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس پر اچنتی

نظر ڈال کر جہانگیر سے جانے کیا کہتے ہوئے آگے آگے چل پڑے۔

گاڑی انہوں نے مسلسل ایک ہی رفتار سے چلائی تھی اور گھر کے سامنے ایک جھٹکے سے روکی تو غالباً کچھ

کہنے سننے سے بچنے کی خاطر فوراً سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سگائے میں مصروف ہو گئے۔

”واپسی کا پروگرام کچھ یوں ہے کہ جب بھی آپ آئیں گے، میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔“

وہ ان کی طرف دیکھ کر بولی اور پھر آتر کر اندر چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے لینے اتنی جلدی نہیں آئیں

گے، اس لئے پہلے ہی مرحلے پر جہانزیب نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ یہ پوچھا کہ ابھی رہو گی، تو وہ

سہولت سے بولی۔

”ہاں.....! بہت سارے دن رہوں گی۔“

”آئی بھی تو بہت سارے دنوں بعد ہو۔“

امی نے اسے گلے لگاتے ہوئے شکوہ بھی کر ڈالا۔

”کیا کروں.....؟ طبیعت سنہیل کے نہیں دے رہی تھی، اور جہانزیب کہتے، جب تک پہلی جنگی نہیں ہو

ہاؤ گی، نہیں جانے دوں گا۔ کیونکہ اس طرح امی کہیں گی، میری بیٹی کا یہ حال کر دیا۔“

اس نے ہنستے ہوئے روایتی بیویوں والا بھرم رکھا۔

”اب کیا حال ہے تمہارا.....؟“

”اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”کہاں ٹھیک ہو.....؟ اتنی کمزور لگ رہی ہو۔“

چنگی نے نوکا۔

”بس.....! تھوڑی کمزوری ہے۔“

پھر فوراً موضوع بدل دیا۔

”چھوٹے بھیا کہاں ہیں.....؟“

”ابھی باہر نکلے ہیں۔“

”کہاں.....؟“

”آج کل نوکری کے چکر میں ہیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن وہ کپیڈر کا کورس جو کر رہے تھے.....؟“

”وہ بھی کر رہے ہیں اور وہ کیونکہ شام کی کلاسز ہیں اس لئے.....“

”چلو شکر ہے، کسی طرح انہیں احساس تو ہوا، اور بڑے بھیا کے گھر میں سب ٹھیک ہیں.....؟“

”ہاں.....! ابھی کل ہی بھائی آئی تھیں۔ تمہارا نہ صرف پوچھ رہی تھیں بلکہ شکایت بھی کر رہی تھیں کہ

سرال تو ایسا بھایا تھا میں کہ پیچھے سب کو بھول گئی ہو۔“

چنگی نے بھائی کے الفاظ کو ہر رائے پھر ان کی تائید کرتے ہوئے بولی۔

”تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گی کیا.....؟“

پنکی اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”ابھی تو نہیں.....! بعد میں ہو سکتا ہے، بلا لیں گے یا شاید نہ بھی بلا لیں، ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔“
وہ خود مطمئن نہیں تھی، لیکن بڑی خوب صورتی سے امی اور پنکی کو مطمئن کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

خوابہ صاحب، بیگم کی بات سن کر خاموش ہو گئے تھے۔ بلکہ ان کے چہرے پر سوچ کے ساتھ قدرے فکر مندی کا تاثر بھی چمکنے لگا تھا، جسے محسوس کر کے ہی بیگم خوابہ پوچھنے لگیں۔

”کیا بات ہے میاں.....؟ آپ پریشان کیوں ہو گئے.....؟“

”پریشان.....؟“

خوابہ صاحب چونک کر بولے۔

”نہیں تو، پریشانی کی بات تو نہیں ہے، بس سوچ رہا تھا، رابعہ اتنی دُور چلی جائے گی.....؟“

”ہاں.....!“

بیگم خوابہ ”ہاں“ کو لمبا بھیج کر رہ گئیں۔

”خوش تو ہے ناں رابعہ.....؟“

”ہاں میاں.....! اللہ کا شکر ہے، مجھے اس کے چہرے پر اطمینان نظر آیا اور خوش بھی تھی۔“

رابعہ کی خوشی بتاتے ہوئے بیگم خوابہ بھی خوش ہو رہی تھیں کہ اسی وقت رابعہ بھی آگئی۔

”السلام علیکم.....!“

”ارے.....! ماشاء اللہ! بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔ خوش رہو، آباد

رہو۔“

بیگم خوابہ، رابعہ کو دیکھ کر کھل گئیں۔

”آپ کیسے ہیں ابا.....؟ اور کس سلسلے میں مجھے یاد کر رہے تھے.....؟“

رابعہ نے خوابہ صاحب کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ..... جینا.....! تمہاری اماں بتا رہی تھیں کہ شیراز کا پناہ پزیرنس ڈی ٹرانسفر کر رہا ہے.....؟“

خوابہ صاحب نے بتانے سے زیادہ پوچھا تھا۔

”جی ابا.....! یہی کہہ رہے تھے شیراز کہ وہ پچھلے چھ مہینوں سے اسی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ آفس

وغیرہ تو تقریباً وہاں سیٹ کر چکے ہیں۔“

”ویسے بھابی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ حالانکہ تمہارے ساتھ کوئی اتنے زیادہ کھینچے بھی نہیں ہیں۔“

”کھینچوں کی بات نہیں ہے یار.....! اصل میں میرے آنے سے اماں اکیلی ہو جاتی ہیں۔ البتہ جب

جہانگیر کی شادی ہو جائے گی، تب سہولت سے کہیں آ جا سکو گی۔“

وہ پہلے ہی سے یہ ساری باتیں سوچ کر آتی تھی، جیسا روانی سے ہر بات کا جواب دے رہی تھی۔

”بہر حال، اب آ تو گئی ہوں اور جب تک تم خود جانے کے لئے نہیں کہو گی، نہیں جاؤ گی۔“

”ارے واہ.....! میں کیوں جانے کے لئے کہوں گی.....؟ میں تو چاہتی ہوں تم۔“

”پنکی.....!“

امی نے ٹوک دیا۔

”کم از کم اسے آرام سے بیٹھنے دو۔ تم تو فوراً ہی اس کے سر پر سوار ہو گئی ہو۔“

”سوری.....!“

پنکی تادم ہونے کی بجائے بے ساختہ ہنسی ہوئی بولی۔

”بھئی جانیہ.....! مجھے بالکل یاد نہیں رہتا۔ اب چونکہ تم شادی شدہ ہو، اس لئے تمہارے ساتھ خاص

مہمانوں والا سلوک کرنا ہے۔ یعنی پہلے اونچے اسٹول پر بٹھانا ہے، پھر فوراً چائے یا اسکو آتش پیش کرنی ہے۔ اس کے

بعد.....“

”بس بس.....!“

اس نے ہاتھ اٹھا کر بولنے سے منع کیا۔

”میں کوئی مہمان نہیں ہوں، البتہ جب جہانزیب ساتھ ہوں، تب ذرا خیال کر لیا کرو۔“

”ارے.....! جہانزیب بھائی کا تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔ کیسے ہیں وہ اور آئے کیوں نہیں اندر.....؟“

”بہت غلط میں تھی، اس لئے باہر ہی سے چلے گئے۔“

”شام میں آئیں گے ناں.....؟“

”نہیں.....!“

”کیوں.....؟“

پنکی سے پہلے امی نے پوچھا تو وہ سوچ کر بولی۔

”اصل میں انہوں نے عربین بینک جو آئن کر لیا ہے اور بہت جلد ٹرانسفر ہو کر جدہ جانے والے ہیں تو اسی

سلسلے میں خاصے مصروف ہیں۔“

”تم نے پہلے نہیں بتایا۔“

”یہ ابھی کی بات ہے۔“

”اچھی بات ہے، پھر تم لوگوں کا کب تک جانے کا پروگرام ہے؟“
 ”پتا نہیں ابا.....! ویسے شیراز جلدی کا کہہ رہے تھے۔ میرا پاسپورٹ بن جائے، پھر دیکھیں کب تک.....“

رابرہ کے انداز میں بہت غصہ اڑا دیا گیا تھا۔

”اچھا اچھا.....! پھر تم نے پاسپورٹ بننے دے دیا.....؟“

خوبصاحب نے سر ہلا کر پوچھا۔

”نہیں.....! ابھی دہیں جاری تھی، سوچا پہلے آپ سے پوچھ لوں۔“

رابرہ نے کہا تو خوبصاحب حیرت کے اظہار کے ساتھ کہنے لگے۔

”ہیں؟ مجھ سے اب کیا پوچھنا ہے بیٹا.....؟ اب تمہیں ہر کام اپنے شوہر کی مرضی سے کرنا ہے۔“

”جی ابا.....! لیکن میں پاسپورٹ کا نہیں، شوہر کا آپ سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔“

رابرہ نے سعادت مندی سے کہا تو خوبصاحب سمجھ گئے۔

”شوہر کا؟“

”جی.....! وہ شیراز کہہ رہے تھے کہ بچوں کا نام میرے پاسپورٹ پر آئے گا تو میں شیراز کے بچوں کے

ساتھ اپنے بچے کا نام بھی لکھوا دوں.....؟“

رابرہ وضاحت کے ساتھ سوالیہ نشان بن گئی تو خوبصاحب بمشکل خود پر قابو پا کر کہنے لگے۔

”کیوں بیٹا.....؟ کیا تمہیں ہم پر بھروسہ نہیں ہے؟“

”بات بھروسے کی نہیں ہے ابا.....! میں تو آپ کی پریشانی کے خیال سے کہہ رہی ہوں۔ آپ اور اماں

شوہر کو نہیں سنبھال سکیں گے۔ تنگ کرے گا یہ آپ کو۔“

”کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ اس کی صورت تو ہمیں جینے کا بہانہ مل گیا ہے۔ تم اسے لے جاؤ گی تو ہم کیا

کریں گے؟“

خوبصاحب نے اتنی عاجزی سے کہا کہ رابرہ خاموش ہو کر اماں کو دیکھنے لگی، جو شوہر کو دیکھتے ہوئے سمجھ

نہیں پار رہی تھیں کہ وہ شوہر کو اپنے پاس رکھنے پر اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں.....؟

”ٹھیک ہے ابا.....! اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو.....“

رابرہ، باپ کی عاجزی کے سامنے ہار گئی۔ اپنی مانتا انہیں دان کر کے چلی گئی، تب بیگم خوبصاحب چپ نہیں رہ

سکیں۔

”یہ کیا کیا میاں.....؟“

”بس.....! چپ رہو، رابرہ کے حق میں یہی بہتر ہے۔“

خوبصاحب نے فوراً انہیں خاموش کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ایک نظر سوٹ بیگر کرتی ٹائیہ پر ڈال کر اسی خاموشی سے بیٹھ کر

شوز اتارنے لگا تھا۔

”ارے.....! آپ کب آئے؟“

ٹائیہ سوٹ بیگر کر کے ٹپٹی تو اسے دیکھ کر چونک کر بولی تھی۔

”آپ کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔“

”حیرت ہے، میں نے تو سنا تھا بیویاں شوہر کے بے آواز قدموں کی چاپ بھی محسوس کر لیتی ہیں۔“

اس نے قصداً حیرت کا اظہار کیا تو وہ ہنس کر پوچھنے لگی۔

”اچھا.....! اور کیا کیا سنا تھا آپ نے؟“

”بہت کچھ۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”لیکن تم میں کوئی ایک بات بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شوہر کی عزت کا پاس بھی نہیں ہے۔“

”دانیال.....؟“

وہ ٹھٹھک گئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟“

”کیوں.....؟ شادی کی پہلی رات میں نے جنہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ میرے لئے میرے بھیا اور بھابی ہی

سب سے زیادہ محترم ہیں۔“

اس کے چپٹے لہجے پر وہ سمجھ کر بولی۔

”اوہ.....! تو بھابی نے.....“

”ہاں.....! بھابی نے بتایا ہے مجھے کہ تم کتنی بدتمیز اور بد لحاظ ہو گئی ہو۔“

دانیال نے اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا تو وہ زچ ہو کر بولی۔

”نہیں دانیال.....! میں بدتمیز اور بد لحاظ نہیں ہوں۔ مجھے حنا کی باتوں پر غصہ آ گیا تھا۔ پھر بھی میں نے

بھابی سے بدتمیزی نہیں کی۔“

”حنا کی باتوں پر.....؟“

وہ حنا کے نام پر چونکا تھا۔

”جی.....! حنا کا خون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی۔“

وہ حنا کی باتیں دہرائے جارہی تھی کہ سیما نے ان دونوں کو پکار لیا۔

”چلو.....! پہلے کھانا کھالیں۔ بھیا ڈانٹنگ پر انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ کہتے ہوئے اس سے پہلے کمرے سے نکلا تھا۔ ثانیہ جیسے ناچار اس کے پیچھے ڈانٹنگ روم میں آئی تھی۔ کمال حسن نے اچھتی ہوئی نظران دونوں پر ڈالی، پھر اپنی پلیٹ میں سالن نکالے ہوئے سیما کو حنا کی طرح سے پوچھنے لگے۔

”بیگم.....! یہ سالن تم نے بنایا ہے؟“

”تو اور کون بنائے گا؟“

سیما کو جیسے بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

”آپ نے کون سے مجھے نوکر رکھ کر دیئے ہوئے ہیں.....؟ صبح سے رات تک سارے کام میں ہی کرتی ہوں۔“

”کیوں.....؟ کام والی نہیں آتی کیا؟“

کمال حسن نے سیما کے بھڑکنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا، ہنوز آرام سے پوچھا تھا۔

”کام والی کہ کبھی ساتھ لگتا پڑتا ہے۔ پوری پریڈ ہو جاتی ہے اس سے صفائی کروانے میں۔ ایک دن

کام والی کے سر پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو پتا چل جائے گا۔“

سیما کو مزید تیز ہوتے دیکھ کر کمال حسن نے سالن کی ڈش وانیال کی طرف بڑھا دی۔

”لو بیٹی.....! کھانا کھاؤ، ورنہ تمہاری بھابی دماغ کھا جائیں گی۔“

”ہاں.....! میں تو ایسی ہی ہوں۔“

سیما نے سگ کر گرج ڈش میں بیچ دیا اور اٹھ کر چلی گئی تو دانیال نے بوکھلا کر کمال حسن کو دیکھا۔ وہ آرام

سے کھانا کھانے لگے، تب وہ اٹھ کر سیما کے پیچھے چلا آیا۔

”بھابی.....! بھابی.....! سنیں تو۔“

”کچھ نہیں سننا مجھے۔“

سیما تیزی سے اپنے کمرے میں جانے لگی کہ اس نے بھاگ کر راستہ روک لیا۔

”کیا ہو گیا ہے بھابی.....؟ پتا تو ہے آپ کو بھیا مذاق کرتے ہیں۔“

”یہ مذاق تھا.....؟ بچوں کے سامنے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا اور تم کہتے ہو یہ مذاق ہے.....؟“

سیما بری طرح تمللا رہی تھی۔

”اوہو بھابی.....! اب ہم بچے نہیں ہیں، بڑے ہو گئے ہیں۔ سمجھتے ہیں مذاق کو۔“

اس نے قصداً مخلوط انداز اختیار کیا، لیکن سیما مزید ترخ کر پڑی تھی۔

”تم سمجھتے ہو، تمہاری بیوی نہیں سمجھتی، اسے تو اُٹنا اور ہمدل جاتی ہے کہ میاں ذلیل کر رہا ہے تو دو چار

باتیں میں بھی سناؤ الوں۔ کوئی حیثیت ہی نہیں ہے میری۔“

سیما نے آواز بھرائی تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔

”کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہیں بھابی.....! مالک ہیں آپ اس گھر کی اور ہم سب آپ کے غلام۔“

”بس رہنے دو، پتا ہے مجھے میں کیا ہوں؟ سارا دن کولیو کے تیل کی طرح جی رہتی ہوں، پھر بھی اتنی

باتیں سننے کو ملتی ہیں۔“

وہ رونے لگی تھی۔

”بھابی.....! پلیز، کسی میں ہمت نہیں ہے آپ کو کچھ کہنے کی۔ میری اچھی بھابی.....! پلیز، آپ روئیں

نہیں۔ چلیں آئیں کھانا کھالیں۔“

وہ اسے بچوں کی طرح پچکا رہا تھا۔

”نہیں.....! بس..... مجھے بھوک نہیں ہے، تم جاؤ، کھالو۔“

”آپ کے بغیر کیسے کھالوں.....؟ چلیں ورنہ میں بھی بھوکا سو جاؤں گا۔“

اس کی دھمکی کام نہ گئی۔

”تم بہت جگ کرتے ہو۔“

”ارے.....! ابھی تو میرا بچہ بھی آنے والا ہے، وہ زیادہ جگ کرے گا آپ کو۔“

وہ کہتے ہوئے سیما کو کندھوں سے تھام کر واپس ڈانٹنگ روم میں لے آیا تو ثانیہ جھکی نظروں سے ان

دونوں کو دیکھنے لگی، جبکہ سیما نے بیٹھتے ہی فاتحانہ نظروں سے ثانیہ کو دیکھا تھا، اور وہ نادان سمجھتا ہی نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

رات جس طرح دانیال ”بھابی، بھابی“ کر رہا تھا، اس سے ثانیہ نے پھر حنا کا ذکر نہیں کیا، لیکن وہ سوچ

چکی تھی کہ حنا کی اس دیدہ دلیری کو دانیال کے گوش گزار ضرور کرے گی، اور اگر اس نے نوٹس نہیں لیا، تب وہ اسے

خبردار کر دے گی کہ اب اس معاملے کو وہ خود ہی نمٹائے گی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ نیچے آئی تھی کہ سیما کو کہیں جانے

کے لئے تیار دیکھ کر وہ بلا ارادہ ڈگ گئی۔

”ہاں ثانیہ.....!“

سیما اسے دیکھ کر کہنے لگی۔

”میں ذرا مارکیٹ جا رہی ہوں، تم پلیز کچن دیکھ لیتا۔“

”جی.....!“

اس نے اختصار سے کام لیا۔

”ہاں.....! ایسا نہ ہو میں تھکی باری آؤں اور پھر مجھے کھانا بھی پکانا پڑے۔“

سیما نے کہا تو وہ ناگواری چھپا کر بولی۔

”نہیں.....! میں کر لوں گی سب، آپ اطمینان رکھیں۔“

”اطمینان، ہونہہ.....! میری زندگی میں اطمینان جب ہی آئے گا جب.....“

سیما سخت سے سر جھٹک کر جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ فون کی بیل پر اس نے لپک کر فون اٹھا لیا تھا۔

جبکہ وہ خود پر ضبط کی سعی میں وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

”ہاں حنا.....! میں بس نکل رہی ہوں۔ پہنچ جاؤں گی دس منٹ میں۔ ٹھیک ہے.....! اور سنو.....! تم

نے دانیال کو فون کر دیا ہے ناں.....؟“

”دانیال.....؟“

اس کے کان شاخیں شاخیں کرنے لگے اور اس سے پہلے کہ وہ ضبط کی سعی ترک کرتی، سیما اسے خدا

حافظ کہہ کر چلی گئی۔

”دانیال.....؟ دانیال.....؟“

”دانیال کے بغیر تو ان کا کوئی کام نہیں ہوتا۔“

وہ پیر پختے ہوئے پکڑ میں آئی اور پھر برتنوں کی اٹھان شروع ہو گئی۔ وہ بری طرح سلگ رہی تھی۔ جیسے

تیبے کھانا پکا کر فارغ ہوئی تو اس خیال سے دانیال کے آفس فون کر ڈالا کہ ہو سکتا ہے سیما نے محض اسے سلگانے کے

لئے دانیال کا نام لیا ہو، لیکن جب ادھر سے یہ کہا گیا کہ دانیال صاحب آدھے گھنٹے پہلے آفس سے جا چکے ہیں، تب

جج جج اس کا دماغ بھٹک سے اڑ گیا تھا۔

”بس دانیال.....! اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔“

اس نے ایک دم فیصلہ کر لیا اور کمرے میں آکر بیک میں پہلے اپنی ضروری چیزیں رکھیں، پھر کپڑے نکال

رہی تھی کہ دانیال آ گیا۔

”ٹائٹ.....!“

دانیال نے آتے ہی اسے پکارا تھا۔ وہ الماری میں سرگھسائے کھڑی تھی۔ اس کی پکار سن کر بھی متوجہ نہیں

ہوئی تو وہ کہنے لگا۔

”اس وقت کس کام سے لگی ہو.....؟ میں بلار ہا ہوں ناں.....!“

اس نے ست انداز میں الماری بند کی پھر اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

”جی فرمائیے.....!“

”ارے بھی.....! میں تو عرض کر سکتا ہوں۔ غلام ہوں تمہارا۔“

دانیال نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تو وہ فوراً بولی تھی۔

”میرے نہیں.....!“

”تمہارا ہی ہوں اور تمہاری خاطر ہی دوسروں کو خوش کرنے پر مجبور ہوں۔“

دانیال نے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھایا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

”مجبور؟ کیا مجبوری ہے.....؟“

”دیکھو، اگر میں بھابی کی بات نہیں مانوں گا تو وہ سارا وقت تم سے بگڑی رہی ہیں۔“

اس کی لوجیکل پردہ بگڑ گئی۔

”مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ بھابی بگڑتی ہیں تو بگڑتی رہیں، لیکن جو کچھ وہ آپ سے کروا رہی ہیں، وہ

میری برداشت سے باہر ہے۔ سمجھے آپ.....؟“

”سک..... کیا..... کیا کروا رہی ہیں بھابی مجھ سے.....؟“

اس کے دل میں چور تھا، جب ہی بوکھلا گیا تھا۔

”یہ.....!“

وہ اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ کھینچ کر بولی۔

”یہ آپ اپنی مرضی اور پسند سے تو میرے لئے نہیں لائے ہوں گے۔ حنا نے کہا ہوگا، بیچاری ٹائیہ کے

لئے بھی کچھ لئے، خوش ہو جائے گی۔“

”بس ٹائیہ.....! خاموش ہو جاؤ۔“

دانیال نے لا جواب ہو کر ٹوٹا تھا۔

”کیوں خاموش ہو جاؤں.....؟ آپ کی بھابی باقاعدہ مجھے سنا کر حنا سے کہتی ہیں کہ دانیال کو فون کر دو،

پھر بھی آپ انہیں ہی خوش کرنے میں لگے ہوئے ہیں، تو کرتے رہیں آپ بھابی اور ان کی بہن کو خوش، میں ہی فالتو

ہوں، جہت جاتی ہوں آپ کے درمیان سے۔“

”سک..... کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

اس نے تیزی سے بڑھ کر اپنا بیگ اٹھا لیا اور اسی تیزی سے جانے لگی تھی کہ دانیال نے اسے بازو سے

پکڑ کر کھینچ لیا۔

”سک..... کیا کر رہی ہو ٹائیہ.....؟ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو.....؟“

”ہاں.....! ہو گئی ہوں پاگل، اور مجھے پاگل کرنے والے آپ ہیں۔“

وہ چیخ کر بولی اور اسے دھکیل کر کمرے سے نکل آئی۔
”جانیہ.....!“

وہ عقب سے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔
”خوش ہو جائیں آپ.....! میں جاری ہوں۔“

اس نے لاؤنج میں کھڑی سیما کو قریب رک کر کہا، پھر تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے آتے دانیال کو سیمانے روک لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسے یقین تھا کہ جہانزیب اتنی جلدی اس کے پاس یا اسے لینے نہیں آئیں گے، اور وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ ابھی وہ نہ آئیں۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کی غیر موجودگی میں وہ یکسوئی اور غیر جانبداری سے سوچ سکیں گے۔

اسے یہاں آئے تیسرا دن تھا۔ اس دوران انہوں نے اسے فون بھی نہیں کیا تھا اور اس سلسلے میں اسے پریشانی صرف اس حد تک تھی کہ اگر ای یا چنگی نے اس بات کو محسوس کر کے اس سے پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گی.....؟

اس وقت جبکہ امی کسی مہمان خاتون کے ساتھ اور چنگی چائے وغیرہ بنانے میں مصروف تھی، تو وہ تنہا بیٹھی یہی سب سوچ رہی تھی۔ کبھی جہانزیب کا گزشتہ روز یہ یاد آتا تو امید کی کرن جگمگا اٹھتی اور کبھی موجودہ روز کے کو سوچ کر مایوسیوں میں گھبرنے لگتی۔ اسی وقت ابو جی آگئے۔ امی کیونکہ ڈرائنگ روم میں تھیں، اس لئے وہ اس کے پاس آ بیٹھے۔

”کیا بات ہے بیٹا.....؟ تم اکیلی کیوں بیٹھی ہو.....؟“

انہوں نے غالباً یوں ہی بات کرنے کی غرض سے کہا۔

”چنگی چائے بنا رہی ہے۔“

”اور تمہاری امی کے پاس کون ہے.....؟“

”میرا خیال ہے، پڑوس سے کوئی خاتون آئی ہیں۔ آپ کے لئے بھی چائے بنواؤں.....؟“

وہ اٹھنے لگی تو انہوں نے روک لیا۔

”نہیں.....! میرا مطلب ہے، میں نے چنگی سے کہہ دیا ہے، وہ لے آئے گی۔“

پھر یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ وہ پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ جب اچانک مانوس قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا، اور ابھی وہ اپنا وہم کچھ کسر جب تک رہی تھی کہ جہانزیب کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر

اسے اپنی بصارت پر بھی شبہ ہونے لگا۔ بار بار پلکیں جھپکیں، لیکن وہ جوں کے توں موجود۔ ابو جی سے مصافحہ کر کے ان کے پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

”بیٹا.....! چنگی پتا نہیں کیا کر رہی ہے.....؟ تم جاؤ، چائے جلدی لے آؤ.....!“

ابو جی نے اسے مخاطب کر کے کہا تو وہ بے خودی کے عالم میں اٹھ کر یکن میں آگئی۔ دل خوش فہم ہو کر قابو میں نہیں رہا تھا۔ وہ یکن میں آ تو کئی تھی، لیکن یہ یاد نہیں رہا تھا کہ کیوں آئی ہے.....؟ چپ چاپ تنگی کو دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے جانیہ.....؟“

چنگی اسے گم سم دیکھ کر اچھٹے سے پوچھنے لگی تو وہ چونکی، اور اپنی کیفیت چھپانے کو خواہ مخواہ اس پر بگڑنے لگی۔

”کیا کر رہی ہو تم.....؟ ابو جی نے اتنی دیر پہلے تم سے چائے کا کہا تھا۔“

”ہاں.....! بس لا رہی ہوں۔“

”جلدی کرو.....! اور وہاں جہانزیب بھی آئے بیٹھے ہیں۔ صرف ایک کپ مت لے جانا۔“

”اچھا.....! وہ..... کب آئے جہانزیب بھائی.....؟“

چنگی اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

”ابھی.....!“

”کہیں تمہیں لینے تو نہیں آئے.....؟“

چنگی نے جلدی جلدی پلیٹوں میں بسکٹ اور کچھ وغیرہ رکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنی بات یاد کر کے بولی۔

”میرا خیال ہے، میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔“

”لیکن یہ تم نے تو کیا تھا.....“

”میں یہ لے کر جا رہی ہوں، تم فوراً چائے لے آؤ۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولی اور رڑے اٹھا کر اندر آگئی۔ ابو جی جہانزیب سے جدہ جانے کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور وہ ان کا جواب سننے کے لئے پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تقریباً تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔“

وہ بتانے لگے۔

”بس کسی بھی دن میرے ہاتھ میں ٹکٹ تہمادی جائے گی۔“

”جانیہ تو ابھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی ناں.....؟“

”نہیں.....!“

اسی وقت چنگی چائے لے کر آگئی تو انہوں نے اس کے کہنے سے پہلے ہی ایک کپ اٹھا لیا۔ پھر ایک نظر

اس پر ڈال کر پوچھا۔

”گھر چلتا ہے.....؟“

”جی.....!“

وہ نہ بھی کہتے، تب بھی اسے جانا تھا۔ کیونکہ وہ خود ان سے کہہ چکی تھی کہ جب بھی آپ آئیں گے، میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔

پھر امی نے بے حد صبر سے انہیں رات کے کھانے تک روک لیا۔ اس دوران وہ مسلسل ایک خوش گوار احساس میں گہری رہی۔ گوکہ وہ اس سے اسی طرح لا تعلق سے رہے، لیکن اس کے لئے فی الحال یہی بہت تھا کہ وہ تیسرے دن ہی اسے لینے آگئے تھے اور اس کا خیال تھا، وہ یوں ہی تو نہیں آئے ہوں گے۔ یقیناً تمام حالات کو سوچنے کے بعد اسے بے قصور سمجھتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

وہ ٹانیہ کے پیچھے جانا چاہتا تھا، اسے روکنا چاہتا تھا، لیکن اس کے بازو پر سیما کی گرفت مضبوط تھی۔

”بھابی.....! وہ.....“

اس نے بے بس انداز میں سیما کو دیکھا تو وہ اس کا بازو ہلا کر کہنے لگی۔

”پاگل مت بنو۔ غصے میں معاملہ زیادہ بگڑ جاتا ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں روک لیا ہے، اور ٹانیہ جانے کی کہاں.....؟ اپنے میکے ہی جانے کی تاں.....؟“

”لیکن بھابی.....! اس طرح، میرا مطلب ہے اس کے ماں باپ کیا سمجھیں گے.....؟“

اسے پریشانی نے گھیر لیا۔

”یہ تو ٹانیہ کو سوچنا چاہئے تھا، لیکن غصے میں وہ بھی کیا سوچ سکتی تھی.....؟ خیر.....! تم فکر مت کرو۔“

سیما نے نلی دی تو وہ ہنسی ہو گیا۔

”کیسے فکر نہ کروں بھابی.....؟ ٹانیہ کی حالت دیکھی نہیں آپ نے.....؟“

”ہاں.....! ایسی حالت میں تو اسے خود ہی احتیاط کرنی چاہئے۔“

”آپ بتائیں، میں کیا کروں.....؟“

”حوصلہ رکھو، مردہو، کزور پڑو گے تو پھر ساری زندگی اس کی غلامی کرتے رہو گے۔“

سیما بہت طریقے سے اسے سمجھانے لگی تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں دانیال.....! جتنے ذوم میں ٹانیہ گئی ہے۔ دیکھتے ہیں کتنے دن ماں باپ کے گھر بیٹھ سکتی ہے.....؟ تم نے نہیں نکالا اسے، خود گئی ہے، خود ہی آئے گی۔“

”بہت غلط کیا ہے اس نے۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا تو سیما نے فوراً پوچھا۔

”کہاں جا رہے ہو.....؟“

”اپنے کمرے میں۔“

”ہاں.....! تم آرام کرو۔ میں ذرا ٹانیہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے، پھر اسے سمجھاؤں گی۔“

وہ سیما کو بولتے ہوئے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

گوکہ غلطی اس کی تھی، لیکن اسے احساس ہی نہیں تھا۔ انا ٹانیہ کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا کہ اسے اس طرح

نہیں جانا چاہئے تھا۔

”بھابی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نے نہیں نکالا اسے، وہ خود گئی ہے، خود ہی آئے گی۔“

وہ پھر سیما کی باتوں پر ایمان لا کر تنفر سے سوچ رہا تھا کہ سیما غالباً تیزی سے بیڑھیاں چڑھتی ہوئی آئی

فی۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔

”دانیال.....! دانیال.....! وہ.....“

”کیا ہوا بھابی.....؟“

اس نے فوراً بڑھ کر سیما کو تھام لیا۔

”وہ.....! دانیال.....! ابھی رابعہ کا فون آیا تھا۔“

سیما نے اپنی سانسیں بحال کرنے کی سعی میں بتایا۔

”پھر.....! پھر کیا کہا رابعہ نے.....؟ پہنچ گئی اس کی بہن.....؟ خاڑا لے جھوٹے سچے قصے.....؟“

وہ طنز سے بولا تھا۔

”ان باتوں کو چھوڑو دانیال.....! اس کی اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔“

سیما نے کہا تو وہ سمجھا نہیں۔

”کس کی اماں کا.....؟“

”ٹانیہ کی.....!“

”کس.....! کیا.....؟“

اسے شاک لگا تھا۔

”کیا کہہ رہی ہیں بھابی.....؟“

”یہی بتایا ہے رابعہ نے، چلو میں بھی چلتی ہوں۔ جلدی کرو، میں تمہارے بھیا کو فون کرتی ہوں، وہ

بچوں کو اسکول سے لے لیں گے۔“

سیما کہتے ہوئے غلت میں چلی گئی، وہ سناٹے میں کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

سیما یہاں بھی اپنی چالاکا سے باز نہیں آئی۔ اس نے دانیال کو ٹانیہ سے ملنے ہی نہیں دیا۔ دانیال نے جب کہا، اس نے یہ کہہ روک دیا کہ ابھی اندر بہت عورتیں ہیں، اس کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ مزید یہ بھی کہا کہ ٹانیہ غم اور غصے میں سب کے سامنے اس سے جانے کیا کہہ دے، جبکہ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ پھر بھی میں کوشش کرتی ہوں، ٹانیہ کو تمہارے پاس لے آؤں۔ آخر میں اسے تسلی بھی دے ڈالی، اور یہ تسلی تین دن جاری رہی۔ پھر قتل خوالی کے بعد وہ اسے گھر کر بیٹھ گئی۔

”میں نے بہت کوشش کی دانیال.....! کہ ٹانیہ تم سے مل لے، لیکن.....“

اس نے قصداً بات ادھوری چھوڑی تھی۔

”لیکن کیا بھابی.....؟ بتائیں ناں.....!“

اس کی بے قراری پر وہ اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا کر بولی۔

”بس.....! جانے دو، تمہارا اور دل برا ہوگا۔“

”پھر بھی، آپ بتائیں بھابی.....! ٹانیہ نے کیا کہا.....؟“

اس کے اصرار پر سیما نے یوں ظاہر کیا جیسے مجبوراً بتانا پڑ رہا ہو۔

”صرف ٹانیہ ہی نہیں، رابعہ نے بھی بہت کچھ کہا۔ دونوں بہنوں نے مجھے وہ وہ باتیں سنائیں کہ کیا

بتاؤں.....؟ میں نے سمجھا ابھی کہ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے، لیکن.....“

سیما پھر خاموش ہو گئی۔

”کیا کہہ رہی تھیں وہ.....؟“

اس نے پوچھا تو سیما پر جیسے بادل نخواستہ بولی تھی۔

”برا بھلا کہہ رہی تھیں کہ جانے کیسے لوگوں میں پھنس گئی ٹانیہ، اور ٹانیہ نے تو یہاں تک کہا کہ وہ اب کبھی

تمہاری شکل نہیں دیکھے گی۔“

”کک..... کیوں.....؟ کیوں بھابی.....؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے.....؟“

وہ پھٹ پڑنے کو ہو گیا۔

”آرام سے بھائی.....! آرام سے، میں اسی لئے تمہیں نہیں بتانا چاہتی تھی۔“

سیما نے اس سے ہمدردی جتائی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں ابھی جاتا ہوں خواجہ صاحب کے پاس۔“

”پاکل ہو گئے ہو.....؟ تماشا بنواؤ گے اتنے لوگوں میں.....؟ بیٹھو یہاں۔“

سیما نے پریشان ہو کر اسے بازو سے کھینچ کر بٹھا دیا، پھر کہنے لگے۔

”دو چار دن صبر کرو، پھر جا کر لے آئیں گے ٹانیہ کو۔“

”ایسے کیسے لے آئیں گے.....؟ پہلے آپ خواجہ صاحب سے بات کیجئے گا۔“

اس نے کہا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سیما فوری خطرہ لے جانے پر مطمئن ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ آنسو تھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اماں کے مرنے سے زیادہ اس

بات کا ذکر کہ ان کی موت کی ذمہ دار وہ ہے، یہ احساس اسے مسلسل پشیمان کر رہا تھا۔

”اماں میری وجہ سے چلی گئیں۔“

وہ بار بار یہی ڈہرا رہی تھی۔ اس وقت رابعہ نے ٹوک دیا۔

”تم ایسا مت سوچو ٹانیہ.....!“

”کیسے نہ سوچوں.....؟ میں جس طرح آئی تھی، روتی ہوئی، تو مجھے دیکھ کر ہی اماں کا دل بند ہو گیا۔ میں

ہوں ان کی موت کی ذمہ دار۔ میں کبھی خود کو معاف نہیں کروں گی۔“

وہ اور شدت سے روتے ہوئے بولی تھی۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ زندگی موت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“

رابعہ نے دھیرج سے ٹوک کر کہا تو وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”اچھا دیکھو، تم ابھی اب اسے کچھ مت کہنا۔ میرا مطلب ہے، دانیال سے جھگڑے کا ذکر مت کرنا۔“

رابعہ نے پھر نرمی سے کہا تو وہ شاکی ہو کر بولی۔

”دانیال آئے کیوں نہیں.....؟“

”آئے تھے، اندر شاید عورتوں کی وجہ سے نہیں آ سکے۔“

”تو اب تو آنا چاہئے۔ اب تو کوئی نہیں ہے یہاں۔“

اس کا روضا انداز تھا۔

”آ جا آئیں گے، تم پریشان کیوں ہو رہی ہو.....؟ نہ آئیں تو تم فون کر کے بلا لینا، اور دیکھو، اب تم

کھداری سے چلو۔ چھوٹے مونے جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں، لیکن اس طرح گھر نہیں چھوڑنا چاہئے۔ سمجھ رہی

ہو ناں.....؟“

رابعہ نے اسے پکپکار کر سمجھایا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بس! اب رونا بند کرو۔ جاؤ منہ دھو لو، میں ابا کے پاس جاتی ہوں، پچارے اکیلے بیٹھے ہیں، اور ہاں! شیراز بھی آنے والے ہیں، پھر میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“

راجہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تو اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا، پھر جب راجہ اپنے گھر چلی گئی، تب اس نے دانیال کو فون کیا تو ادھر سے سیما نے فون ریسیو کیا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ بمشکل خود پر قابو پا کر استحقاق سے بولی تھی۔

”بھابی! میری دانیال سے بات کرادیں۔“

”دانیال سے؟“

سیما نے اچھا بھلا کر کیا تھا۔

”جی!“

”کیا بات کرو گے دانیال سے؟“ میرا مطلب ہے، وہ تو تم سے بات ہی نہیں کرتا چاہتا۔“

سیما نے کہا تو وہ پریشان ہو گئی۔

”کیوں؟“

”یہ تم مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟“ اپنے آپ سے پوچھو۔ میں نے تو رات بھی دانیال سے کہا تھا کہ تمہارے پاس چلا جائے، لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

وہ بے صبری دکھائی۔

”لیکن یہ کہ وہ تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

سیما کے تسخیرانہ انداز پر وہ چیخ پڑی۔

”جھوٹ بول رہی ہیں آپ! میں آپ کی بات کا یقین نہیں کر سکتی۔ آپ دانیال کو بلائیں، انہیں جو کہنا ہو مجھ سے کہیں۔“

”فکرم نہ کرو، تم سے بھی کہہ دے گا۔“

سیما نے کہہ کر فون بند کر دیا تو اس نے بے اختیار کریدل پر ہاتھ مار کر ”ہیلو، ہیلو“ کہا پھر فون رکھ کر چلی تو خواجہ صاحب کو کھڑے دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

”ابا!..... اوہ! بھابی غلط کر رہی ہیں۔“

گھبراہٹ میں اس کے منہ سے یہی نکلا تھا۔ خواجہ صاحب نے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگایا پھر اسے لئے ہوئے اپنے کمرے میں آ بیٹھے اور نرمی سے پوچھنے لگے۔

”کیا مسئلہ ہے بیٹا؟“

”کوئی مسئلہ نہیں ابا!..... میں دانیال کو فون کر رہی تھی، لیکن بھابی دانیال کو مجھ سے بات نہیں کرنے دے گی۔“

”ا۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ڈپریشن ظاہر ہو رہا تھا۔

”کیوں؟..... وہ کیوں نہیں بات کرنے دے رہیں؟“

خواجہ صاحب ہنوز نرم تھے۔

”پتا نہیں ابا!..... بس اپنی طرف سے پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ مجھے ان کا اعتبار نہیں ہے ابا!.....“

”ہاں، دانیال سے بات کروں گی۔“

وہ اب چل گئی تھی۔

”ہاں تو کر لینا دانیال سے بات، پریشان کیوں ہو رہی ہو؟..... یوں بھی اس وقت دانیال آفس میں.....“

”ا۔“

خواجہ صاحب نے اس کا سر تھپک کر کہا تو وہ فوراً بولی۔

”میں آفس فون کرتی ہوں۔“

”ابھی نہیں بیٹا!..... ابھی تم پریشان ہو، غصے میں ہو، دانیال سے بھی اسی طرح بات کرو گی جیسے اس کی

بھابی سے کر رہی تھی۔ شام میں دانیال گھر آ جائے، پھر آرام سے بات کرنا۔ ٹھیک ہے!.....“

خواجہ صاحب نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ جربز ہو کر ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆☆

واپسی کا تمام راستہ جب انہوں نے کوئی بات نہیں کی، تب اسے بڑا عجیب سا لگا۔ دل چاہا کہ، جب مجھ

سے بات نہیں کرنی تھی تو لینے کیوں آئے؟.....

لیکن پہلے ہی مرحلے پر ٹوٹنا اچھا نہیں لگا۔ سوچا گھر جا کر پوچھنے گی، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اپنی بات کا جواب مل گیا۔ اماں اسے دیکھ کر جہانزیب سے کہنے لگیں۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ ذہن کو لے کر جلدی آنا، پھر بھی اتنی دیر کر دی.....؟ اب بتاؤ بھلا، یہ کوئی

وقت ہے کہیں جانے کا.....؟“

”بس!..... ادھر ہو گئی۔“

وہ یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ اماں کے پاس تخت پر بیٹھے ہوئے پوچھنے لگی۔

”آپ نے بلایا ہے مجھے؟“

”ہاں!..... جہانگیر کے رشتے کے لئے جانا تھا۔ ادھر جہانزیب دو چار روز میں جدہ جانے والا ہے۔“

میں نے سوچا کہ اس کے جانے سے پہلے جہانگیر کی مکتفی کر دیں۔ اسی بہانے قریبی عزیزوں سے تو جہانزیب مل ہی لے گا، پھر جب سال بھر بعد پھٹی پر آئے گا، تب جہانگیر کی شادی کر دیں گے۔“

”ہاں.....!“

وہ مرجھا گئی تھی، جیسی اس کے منہ سے تھکی تھکی آواز نکلی۔

”اب کل ہی چلیں گے۔“

”جی.....! لیکن کیا اتنی جلدی مکتفی کا انتظام ہو جائے گا.....؟“

”کوئی بہت بڑا انتظام تو نہیں کرنا۔ بس اپنے خاص خاص لوگ ہوں گے۔“

اس نے مزید کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ جہانزیب اطمینان سے بیڈ پر بیٹھے تھے۔ سامنے بریف کیس کھلا رکھا تھا، جس میں سے کاغذات نکال نکال کر وہ اس جگہ رکھ رہے تھے جہاں اسے سہا تھا۔ اس نے بہت خاموشی سے اپنا بیگ الماری میں رکھا، پھر اپنی جگہ خالی ہونے کے انتظار میں صوفے پر جا بیٹھی۔ کافی دیر بعد جب انہوں نے اپنی چیزیں سمیٹ کر سروانچا کیا، تب براہ راست نظر اس پر پڑی۔ نیند سے بوجھل آنکھوں کو وہ زبردستی کھولے بیٹھی تھی۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فوراً اٹھے اور لائٹ آف کرنے سے کمرے سے نکل گئے۔

☆.....☆.....☆

سیما نے اپنی طرف سے ٹائیہ کو جو کہنا تھا، کہہ دیا تھا۔ لیکن پھر وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی کہ ٹائیہ اس کی باتوں کی تصدیق کے لئے دانیال کو فون ضرور کرے گی۔ وہ تو اچھا ہوا آج دانیال آفس نہیں گیا تھا ورنہ اب تک اس کا قصہ یوں کھل چکا ہوتا۔ شاید اس کی قسمت اچھی تھی یا پھر ٹائیہ کی بد قسمتی کہ سیما کو مزید موقع مل گیا تھا، اور اپنی اگلی حال سوچتے ہوئے اس نے مکاری سے رونٹا شروع کر دیا، اور اسی طرح روتے ہوئے دانیال کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا بھابی.....؟ آپ رو کیوں رہی ہیں.....؟“

”میں ٹائیہ کو خود خوشی سے بیاہ لائی تھی، لیکن اس نے میرا ذرا لحاظ نہیں کیا۔ مجھے جھوٹی مکاریاں بھی نہیں سوچا، میں عمر میں اس سے کتنی بڑی ہوں۔“

وہ روتے ہوئے بولے چلی جا رہی تھی۔

”یہ..... یہ سب کب ہوا بھابی.....؟“

دانیال کو اس فی بات نے مزید پریشان کر دیا تھا۔

”ابھی میں نے اسے فون کیا تھا کہ میں اسے لینے آ رہی ہوں، لیکن جواب میں اس نے مجھے دو کوڑی ۱۱

کر کے رکھ دیا۔ ٹھیک ہے، اگر وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، میری شکل نہیں دیکھنا چاہتی تو تم اسے الگ گھر لے دو۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بھابی.....؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر آئے گی تو اسی گھر میں، ورنہ بیٹھی رہے وہیں، اور آپ خدا کے لئے رونا بند کریں۔“

وہ ایک دم غصے میں آ گیا تھا۔

”مجھ سے کبھی کسی نے اس طرح بات نہیں کی۔ بہت دل دکھا ہے میرا۔“

سیما سے مزید اشتعال دلانے سے باز نہیں آئی۔

”بس کریں بھابی.....! دل تو اب میں دکھاؤں گا ان کا۔“

اس نے کہہ کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا تھا۔

”کیا کیا کر رہے ہوں دانیال.....؟ کون فون کر رہے ہو.....؟“

سیما نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور لیتا چاہا، لیکن دانیال نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور نمبر پش کر دیئے۔ دوسری طرف خواجہ صاحب نے فون اٹھا یا تھا اور ان کی آواز سنتے ہی دانیال غصے سے بولا تھا۔

”کیا سمجھتی ہے آپ کی بیٹی اپنے آپ کو.....؟ میری ماں جیسی بھابی کے ساتھ بدتمیزی کرے گی اور میں برداشت کر لوں گا.....؟ ہرگز نہیں.....؟ ٹائیہ نہیں رہنا چاہتی میری بھابی کے ساتھ تو آپ بٹھائے رکھیں اسے اپنے پاس، میرے گھر میں اب اس کی جگہ نہیں ہے۔“

دانیال.....!“

سیما نے بظاہر اسے ٹوکا۔

”آپ کہہ دیں ٹائیہ سے، میری بھابی کو لڑا کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ اب روتی رہے ساری زندگی۔“

دانیال نے کھٹ سے فون رکھا، تب وہ اس پر بگڑ گئی۔

”یہ تم نے کیا کہہ دیا دانیال.....! پاگل تو نہیں ہو گئے.....؟“

”ہاں.....! ہو گیا ہوں پاگل.....!“

وہ کہہ کر تیزی سے کمرے سے ہی نہیں، گھر سے ہی نکل گیا تھا۔ سیما نیچے آئی تو پہلے دانیال کے جانے کا اطمینان کیا، پھر آرام سے بیٹھ کر کتنا کو فون کر ڈالا اور چھوٹے ہی بولی تھی۔

”دادو مجھے، میں نے ٹائیہ کا پتہ صاف کر دیا ہے۔“

”سچ آپا.....؟“

ادھر حنا خوشی سے پڑ جوش ہو گئی تھی۔

”اور کیا.....؟ بہت پڑ پڑے نکل آئے تھے اس میسنی کے، میں اگر فوراً ایکشن نہ لیتی تو سب اُلٹا ہو

جاتا۔“

سیما نے فخر یہ اپنا کارنامہ بتایا تو حنا سراہ کر پوچھنے لگی۔

”اچھا! کیا کر رہی تھی مہنتی؟“

”دانیال کو میرے خلاف بہکا رہی تھی، اور مجھ سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کر رہی تھی۔ میں نے کہا، بچو آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا مجھ سے منہ ٹیزھا کرنے والا۔“

”ابھی کہاں ہے؟“

حنا کو سب جاننے کی جلدی تھی۔

”بیٹھی ہے مینے، اور دانیال نے کہہ دیا ہے اس کے باپ سے کہ بھائے رکھیں اپنی بیٹی کو اپنے پاس۔“

سیما منہ بنا کر ہنسی کرتی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا آپا!.....! میرا مطلب ہے، ابھی تو اس کی اماں کا انتقال ہوا ہے اور میرا خیال تھا، دانیال اس کی دلجوئی میں لگا ہوگا۔“

حنا نے کہا تو وہ نخوت سے بولی۔

”ارے!.....! میں نے اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔ خیر!.....! اب دلجوئی تم کرو گی دانیال کی،

سچی؟ اور دیکھو۔“

کمال حسن کو آتے دیکھ کر سیما نے بے اختیار فون رکھ دیا اور ان کے سلام کا جواب دے کر پوچھنے لگی۔

”چائے لاؤں آپ کے لئے؟“

”ابھی نہیں!.....!“

وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگے۔

”دانیال کہاں ہے؟“

”پتا نہیں!.....! شاید خواجہ صاحب کی طرف گیا ہو۔ ثانیہ بھی تو ابھی وہیں ہے۔“

سیما نے حاضر دماغی سے بتایا تو کمال حسن یوں ہی سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”اُف!.....! انہیں بڑی فکر ہے۔“

سیما نے بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹکا۔ پھر کچن کا رخ کیا۔ کھانے کی تیاری کے دوران اس کا ذہن مسلسل

اپنی کامیاب پلاننگ کو مزید مستحکم بنانے کی سوچتا رہا تھا، جب ہی جیسے ہی دانیال آیا تو وہ اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کہاں چلے گئے تھے دانیال؟.....؟ تمہارے بھائی کتنی بار تمہارا پوچھ چکے ہیں۔“

”آپ نے کیا کہا؟.....؟ کیا بتایا بھائی کو؟“

دانیال نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

”کچھ نہیں!.....! میں نے یہی کہا کہ تم بتا کر نہیں گئے۔“

”ہاں!.....! ابھی بھائی کو کچھ مت بتائیے گا۔ ثانیہ کا پوچھیں تو کہہ دیجئے گا، وہ ابھی وہیں رہے گی۔“

دانیال کہہ کر واش روم کی طرف بڑھا تھا کہ وہ پکار کر بولی۔

”سنو!.....! وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے بھائی کو پتا تو چلنا چاہئے کہ خواجہ صاحب!.....“

”بھائی!.....! پلیز، مت نام لیں ان لوگوں کا، اور بھائی کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

دانیال سختی سے کہہ کر واش روم میں بند ہو گیا اور سیما بھی تو چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے خواجہ صاحب کا سر دبا رہی تھی لیکن آنسو روانی سے پھٹک رہے تھے، جنہیں وہ بار بار صاف کر رہی تھی۔ خواجہ صاحب آنکھیں بند کئے لیٹے تھے، پھر بھی اس کی ہر حرکت انہیں محسوس ہو رہی تھی اور اس کے آنسو تو جیسے ان کے دل پر گر رہے تھے۔ کتنی دیر بعد دلگیر لہجے میں بولے تھے۔

”روتی کیوں ہو بیٹا؟.....؟ تمہارا باپ ابھی زندہ ہے۔ مرنے جاؤں تب رونا۔“

”ابا!.....!“

وہ تڑپ گئی۔

”بس کرو، رو کر اپنی اور میری آزمائشوں کی عمر مت بڑھاؤ۔“

خواجہ صاحب نے اپنی پیشانی پر رکھے اس کے ہاتھ کو تھپک کر کہا تو وہ اسی شدت سے روتے ہوئے

بولی۔

”ابا!.....! دانیال ایسے نہیں تھے، انہیں بہا گیا گیا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر اسے خود ہی سمجھئے۔ وہ اس کی قسمت میں اگر ٹھوکر لکھی ہے تو میں اور تم اسے ٹھوکر کھانے

سے نہیں بچا سکتے۔“

”کوشش تو کر سکتے ہیں ناں ابا!.....!“

وہ فوراً بولی تھی۔

”کوئی فائدہ نہیں!.....!“

خواجہ صاحب مایوسی سے نفی میں سر ہلانے لگے۔

”پھر ابا!.....! میں کیا کروں؟.....؟“

”مہربانی!.....! صبر، اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ کر صبر کرو گی تو اجر پاؤ گی۔“

اسے تلی دیتے ہوئے خواجہ صاحب کے سینے سے آہ خارج ہوئی تھی۔

”میری وجہ سے آپ کا کتنا دل دکھا ہے ابا.....!“

اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اب کوشش کرنا اپنے باپ کا سر نہ جھکنے دینا۔“

خواجہ صاحب کے لہجے میں بلا کا درد تھا، وہ پھر تڑپ گئی۔

”نہیں ابا.....! جب تک دانیال اپنے رویے کی آپ سے معافی نہیں مانگیں گے، میں ان کا نام بھی نہیں

لوں گی۔“

”اچھا جاؤ، دیکھا شوہلی نہ اٹھ جائے۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی، اور پھر اس نے خواجہ صاحب سے تو کہہ دیا تھا

کہ وہ دانیال کا نام بھی نہیں لے گی، لیکن دل کا کیا کرتی جس کی ہر دھڑکن میں وہ بسا ہوا تھا۔ بظاہر کتنی انجان لیکن

شدت سے اس کی منتظر تھی۔ اس وقت ڈور تیل بجنے پر اس نے بھاگ کر گیٹ کھولا تھا اور آگے راجہ کو دیکھ کر وہ بشکل

اپنی کیفیت چھپا کر اس کے گلے لگی تھی۔ پھر اس کے ساتھ اندر آئی تو راجہ جیسے سوچ کر اور خاص اسی مقصد سے آئی تھی

کہ خواجہ صاحب کے پاس بیٹھتے ہی کہنے لگی۔

”ابا.....! آپ کو دانیال سے ثانیہ کا قصور تو پوچھنا چاہئے تھا۔ ایسا کیا کیا ہے ثانیہ نے جو وہ یوں بیٹھے

سے ہی اکھڑ رہا ہے؟“

خواجہ صاحب نے ایک نظر راجہ کو دیکھ کر سر جھکا لیا، بولے کچھ نہیں، تو وہ پوچھنے لگی۔

”میں دانیال سے بات کروں ابا.....؟“

”نہیں.....!“

خواجہ صاحب فوراً منع کر کے پھر نرمی سے بولے تھے۔

”نہیں بیٹا.....! ابھی نہیں۔“

”کیوں ابا.....؟ ابھی کیوں نہیں؟“

راجہ کی جرح پر خواجہ صاحب گہری سانس کھینچ کر کہنے لگے۔

”جتھیں یاد نہیں بیٹا..... تمہارے معاملے میں تمہاری اماں کہتی تھیں، جلدی مت کرو، ورنہ وہ لوگ کہیں

گے، ہم چاروں بیٹی کو نہیں کھلا سکتے۔“

”ثنیہ کا معاملہ اور ہے ابا.....!“

راجہ جھک پڑ کر بولی تھی۔

”وہاں دانیال کو ثانیہ کے خلاف بہکا یا جا رہا ہے۔“

”دانیال کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ پڑھا لکھا، سمجھدار آدمی ہے۔ وہ کیوں بہکاوے میں آ رہا ہے.....؟“

”نہیں پتا، اس کی بیوی کس حال میں ہے.....؟ اور ابھی کس سانچے سے گزری ہے.....؟“

خواجہ صاحب کو غصے میں آتے دیکھ کر راجہ خاموش ہو گئی۔ پھر بات بدلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”اچھا ابا.....! یہ بتائیں، اب شوہلی کی دیکھ بھال آپ کیسے کریں گے.....؟ آپ کے لئے تو مسئلہ

”کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ جب یہ طے ہے کہ شوہلی نہیں رہے گا تو اب تم اس کی فکر چھوڑ دو۔ تم بس اپنا گھر

”الہ۔“

خواجہ صاحب کے دونوں انداز پر راجہ پھر خاموش ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

دانیال، حنا کی زلف گیر کا اسیر ضرور ہو گیا تھا، لیکن ثانیہ کو اپنی زندگی سے نکلنے کا اس نے سوچا بھی

نہیں تھا، جب ہی وہ بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ سیما کے بہکاوے میں آ کر خواجہ صاحب سے بدتمیزی کرنے کے بعد

اب اس کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ خود ثانیہ کے پاس جاتا۔ البتہ سوچنا ضرور تھا۔ اس وقت وہ آفس سے لوٹا تو

سیما کو دیکھتے ہی بے اختیار پوچھا تھا۔

”بھابی.....! ثانیہ کا فون تو نہیں آیا تھا.....؟“

سیما سختی ضرور لیکن فوراً استعبل کر کہنے لگی۔

”نہیں دانیال.....! میں نے کتنی بار فون کیا، لیکن ادھر سے کسی نے اٹھایا ہی نہیں۔“

”ظاہر ہے، اب کیوں وہ یہاں کا فون اٹھانے لگے.....؟ میں نے بھی تو حد کر دی۔ مجھے خواجہ صاحب

سے بدتمیزی نہیں کرنی چاہئے تھی۔“

اس کی پشیمانی پر سیما اندر ہی اندر تلملا کر بولی تھی۔

”ہاں.....! غصے میں تمہیں احساس ہی نہیں ہوا، کس سے بات کر رہے ہو.....؟ کیا کہہ رہے ہو.....؟“

دانیال نے یوں ہونٹ بھینچے جیسے اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا ہو، اور اس سے پہلے کہ وہ

طافی کی بات کرتا، سیما بول پڑی۔

”اگر تم کہو تو میں چلی جاؤں ثانیہ کے پاس، خواجہ صاحب سے معذرت بھی کر لوں گی.....؟“

”آپ.....؟ آپ کیوں معذرت کریں گی.....؟ غلطی میری ہے، معافی بھی مجھے ہی مانگنی چاہئے۔“

اس نے کہا تو سیما ہنستا لگی۔

”ہاں.....! تم بھی مانگ لینا معافی، لیکن پہلے مجھے جانے دو۔ خواجہ صاحب کے موڈ کا بھی پتا چل

”ہاں.....! تم بھی مانگ لینا معافی، لیکن پہلے مجھے جانے دو۔ خواجہ صاحب کے موڈ کا بھی پتا چل

جائے گا۔“

”ہوں!“

اس نے چند لمحوں سوچا، پھر سہما کو دیکھ کر بولا تھا۔

”ٹھیک ہے بھائی.....! پہلے آپ ہی چلی جائیں۔“

”اور دیکھو، اب تم خدا کے لئے غصہ تھوک دو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ ماشاء اللہ.....! بچے کے باپ ملے

والے ہو۔“

سیمانے چالاکی سے سرزنش کرتے ہوئے کہا تو اس نے مسکراتے پر اکتفا کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

خواجه صاحب کو شدید دھچکا لگا تھا۔ اس وقت وہ اپنی بینشن کے کاغذات جمع کروانے نکلے تھے کہ انہیں گاڑی میں دانیال کے ساتھ حنا بیٹی نظر آئی تھی۔ کتنی دیر تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر جیسے سارا معاملہ کروہ اپنا کام بھول کر سیدھے رابعہ کے پاس آگئے تھے۔ گو کہ مسافت طویل تھی، لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ نڈھال ہو گئے تھے۔ رابعہ فوراً ان کے لئے پانی لے آئی تو انہوں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

”کہاں سے آ رہے ہیں اب.....؟ اتنے تھکے تھکے گھر رہے ہیں۔ فون کر دیتے، میں گاڑی بھجوا دیتی۔“

رابعہ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تو ان کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ چلی تھی۔

”نہ بیٹا.....! میری عادتیں خراب مت کرو۔ ایک بار گاڑی میں بیٹھ گیا تو پھر سفر کہاں کر پاؤں گا۔“

”اچھا، آپ آرام سے بیٹھیں، میں آپ کے لئے جوس لاتی ہوں۔“

رابعہ اٹھنے لگی، لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہیں بیٹا.....! تم بیٹھو میرے پاس، میں تم سے ایک مشورہ کرنے آیا ہوں۔“

”جی!“

رابعہ پوری طرح متوجہ ہو کر پوچھنے لگی۔

”کوئی پریشانی کی بات ہے اب.....؟“

”نہیں بیٹا.....!“

خواجه صاحب کے سینے سے آپ ہی آپ گہری سانس خارج ہوئی تھی، جس سے دل پر پڑا بوجھ قہر

مرک گیا۔ تب وہ کہنے لگے۔

”بیٹا.....! میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ میری ریٹائرمنٹ میں اب بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔“

لے میں نے سوچا ہے کہ میں اپنا یہ گھر بیچ کر کہیں اور دمنزلہ گھر لے لوں۔ ایک حصہ کرایے پر اٹھا دوں گا تو

آمدنی کا ذریعہ ہو جائے گا۔“

”خیال تو اچھا ہے اب.....! لیکن یہ گھر کیوں بیچتے ہیں.....؟ میرا مطلب ہے، اسی کے اوپر بنوائیں۔“

رابعہ نے تانید کے ساتھ مشورہ دیا تو خواجه صاحب یابوسی سے بولے تھے۔

”مشکل ہے بیٹا.....! اوپر بنوانے کے لئے بہت چاہئے۔ میں کہاں مزدوروں کے پیچھے بھاگوں

گا.....؟“

”یہ تو ہے۔“

رابعہ نے پھر تانید میں سر ہلایا۔

”جتنے میں یہ گھر کئے گا بیٹا.....! اتنے پیسوں میں کسی نئی کالونی میں اچھا دمنزلہ گھر مل جائے گا۔“

”بالکل مل جائے گا، اور ہاں اب.....! تانیہ کا کچھ بنا.....؟ دانیال آیا.....؟“

رابعہ نے پوچھا تو خواجه صاحب افسوس سے سر ہلا کر بولے تھے۔

”نہیں بیٹا.....! وہ اب نہیں آئے گا، اور اگر آیا بھی تو میں اب تانیہ کو اس کے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔“

”کیوں اب.....؟ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں.....؟“

رابعہ پریشان ہو گئی تھی۔ تب خواجه صاحب نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اسے بتا دیا۔ آخر میں

کہنے لگے۔

”میں اسی لئے وہ گھر، وہ جگہ ہی چھوڑ رہا ہوں۔ مجھ سے تانیہ کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔ ڈور بیل پر

اس امید پر بھاگی جاتی ہے کہ شاید دانیال آیا ہوگا۔ اسی طرح ٹیلی فون پر لکھتی ہے۔ آس و زاس نے اسے نڈھال کر دیا

ہے۔ میں اپنی بیٹی کو ڈور لے جاؤں گا۔“

خواجه صاحب کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔ رابعہ نے ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا۔ کچھ کہنے سے وہ بھی

قاصر تھی۔

☆.....☆.....☆

شوبی سو گیا تھا۔ تانیہ نے آرام سے اسے بید پر لٹایا پھر چادر اوڑھا رہی تھی کہ ڈور بیل بجنے لگی۔ وہ اس

خیال سے کہ کہیں بیل کی آواز سے شوبی اٹھ نہ جائے، فوراً بھاگی گئی تھی، اور جب گیٹ کھولا تو آگے سہما کو کھڑے

دیکھ کر جانے کیوں اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

”اند نہیں آنے دو گی.....؟“

سیمہ کے طنزیہ انداز پر وہ چونک کر ایک طرف ہٹی تھی۔

”جی آئیے.....!“

پھر گیت بند کر کے وہ سیما کو لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا، جسے نظر انداز کر کے سیما بولی تھی۔

”اپنے ابا کو بلاؤ، مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“

”ابا تو گھر پر نہیں ہیں۔“

اس نے لہجے کو ساٹ بنایا تھا۔

”کہاں گئے ہیں؟“

”آپ کو کیا بات کرنی ہے؟ مجھ سے کریں۔“

اس نے فوراً کہا۔

”تم سے؟“

سیما ہنک آمیز نظروں سے اسے دیکھ کر بولی تھی۔

”من سکوگی؟ اتنا حوصلہ ہے تم میں؟“

”آزما دیکھئے!“

وہ سیما کے سامنے کمر نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

”اچھا؟“

سیما استہزائیہ ہنسی تھی۔

”اگر تم آزمائش میں پوری نہ اتریں تو.....“

”مر نہیں جاؤں گی۔“

وہ تلخ ہوئی تھی۔

”ہاں! مرنے کے تو صرف دعوے ہوتے ہیں۔ موت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔“

”آپ اپنی بات کریں، کیسے آتا ہوا؟“

اس کا ضبط جواب دینے لگا تھا۔

”دانیال کا بیٹا ام لائی ہوں۔ وہ تمہیں طلاق دینا چاہتا ہے۔“

سیما نے انتہائی شفا کی سے اسے زلزلوں کی زد میں دھکیل دیا تھا۔

”نہیں!.....“

وہ ساری توانائیاں مجتمع کر کے بھی خود کو نہیں سنبھال پائی، صوفے کا سہارا لیا تھا کہ وہیں ڈھے گئی تھی۔

سیما نے اسی شفا کی سے اسے گرتے ہوئے دیکھا پھر وہاں سے نکل گئی تھی۔

”ابا!.....“

اس کے وجود میں درد کی بیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ بے یار و مددگار تڑپتے تڑپتے وہ اندھروں میں ڈوب گئی
 م۔ دب اس ہوش آیا تو فوری طور پر کچھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے.....؟ اجنبی کمرے میں اس کی خالی نظریں
 ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں کہ دروازہ کھلنے پر وہ ادھر دیکھنے لگی۔ رابعہ اور اس کے پیچھے ابا آرہے تھے۔ اسے پھر بھی کچھ
 اہلن آیا۔

”مبارک ہو.....! اللہ نے تمہیں بہت پیاری بیٹی دی ہے۔“

رابعہ نے قریب آکر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا تو ایک پل میں اس کی نظروں کے سامنے جانے کیا

مکھوم گیا تھا۔

”بیٹا! دانیال کو اطلاع کر دوں؟“

خواجه صاحب نے اس سے پوچھا تو وہ ایک دم خائف ہو کر بولی تھی۔

”نہیں ابا! نہیں!.....“

”کیوں نہیں؟ اسے بتا چلنا چاہئے کہ وہ بھی بیٹی کا باپ بن گیا ہے۔“

خواجه صاحب کے لہجے میں جانے کیا تھا، وہ تڑپ کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

”ابا نہیں! دانیال کو بتا چلا تو وہ مجھ سے میری بیٹی چھین کر لے جائیں گے۔“

”کیوں چھین کر لے جائے گا؟“

رابعہ نے فوراً کہا تھا۔

”ہاں بیٹا! کیوں چھین کر لے جائے گا؟“

”آپ کو نہیں پتا ابا! بس، آپ ابھی کسی کو نہ بتائیں۔ آپ کو میری قسم ابا!..... آپ کسی کو نہیں

میں گے۔“

وہ رونے لگی تو رابعہ نے پریشان ہو کر خواجه صاحب کو دیکھا، وہ اپنی جگہ پریشان تھے۔

”ثانیہ! ثانیہ! رو کیوں رہی ہو؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟ بتاؤ ناں!.....“

رابعہ نے اسے پچکار تے ہوئے بڑی مشکل سے چپ کرایا، پھر رونے کی وجہ پوچھی۔

”صبح دانیال کی بھابھ آئی تھیں۔“

وہ زک زک کرتا رہی تھی۔ رابعہ اور خواجه صاحب سناٹے میں کھڑے تھے۔

☆.....☆.....☆

”آپا! دانیال تو پبل کی طرح ہو گیا ہے۔ روڈ، سپاٹ، سارا راستہ مجھ سے بات ہی نہیں کی۔ میری

اتوں کے جواب میں بھی بس ”ہوں، ہاں“ کرتا رہا۔“

حنا سلگ سلگ کرتا رہی تھی۔ سہا کو اس پر غصہ آ گیا۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے لفٹ لینے کی؟ ابھی تو تمہیں اس کے سامنے بھی نہیں آنا چاہیے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ ابھی اس کا ذہن الجھا ہوا ہے۔ تم زیادہ آؤ جاؤ گی تو اس کی الجھن سلجھنے کا خدشہ“

”کبھی؟“

سہا آخر میں زنج ہوئی تھی۔

”نہیں.....! میں کچھ نہیں سمجھ رہی۔“

حنا جھنجھلا گئی۔

”اچھا.....! ابھی تم جاؤ، اور جب تک میں نہ کہوں، مت آنا۔“

سہا نے زبردستی اسے بھیج دیا، کیونکہ دانیال کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، اور وہ جو کچھ ثانیہ سے کہہ رہی تھی، تو اسے غدر تھا کہ کہیں ثانیہ نے تصدیق کے لئے دانیال کو فون نہ کر دیا ہو۔ وہ اسی پریشانی میں کھڑی تھی

دانیال کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

”السلام علیکم.....!“

دانیال نے سلام کیا تو وہ چونک کر اسے دیکھتے ہی جو سوچ چکی تھی، بلا ارادہ بولنا شروع ہو گئی تھی۔

”میرا تو خیال تھا عقل ٹھکانے آگئی ہوگی ان لوگوں کی، لیکن نہیں.....! خواجہ صاحب کا دماغ تو آسمان پر پہنچا ہوا ہے۔ میری تو کوئی بات سنی ہی نہیں، بس اپنی کہتے رہے۔“

”کک..... کیا..... کیا کہتے رہے؟“

وہ جو پہلے ہی الجھا ہوا تھا، مزید الجھ گیا۔

”وہی تمہاری اس روز کی بدتمیزی پر مسلسل لعن طعن کرتے رہے، پھر کہنے لگے۔ میری بیٹی کے لیے“

”جیسے میں نے راجہ کو بیاہ دیا، ثانیہ کو بھی.....“

دانیال کے ہونٹ سمجھتے پر سہا ایک لحظہ کو خاموش ہوئی، پھر کہنے لگی۔

”تو یہ تو بڑا بول بولے ہوئے ذرا خدا کا خوف نہیں آیا بڑے میاں کو، اور وہ ثانیہ سے کہہ رہی تھی۔“

”نہیں آئی باپ کی ہاں میں ہاں ملائی رہی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا، لیکن کیا کرتی؟ میں تو خون کے گھونٹ لے گئی۔“

”کیوں.....؟ کہہ دیتیں آپ بھی کہ دانیال کو بھی کی نہیں ہے۔ مرنے نہیں جاؤں گا میں اس کے لیے۔“

وہ غصے سے کہہ کر زکات نہیں، تیزی سے بیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

”اوہ شکر.....!“

سہا نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سانس کھینچا، پھر فوراً کچن کا رخ کیا اور جب تک کمال حسن آتے، اس نے

مالیہل پر لگا دیا تھا۔

”وہ..... ثانیہ کب تک میسرے رہے گی؟“

کمال حسن نے کھانا شروع کرنے سے پہلے پوچھا تو سہا بظاہر سرسری انداز میں بولی تھی۔

”ڈیلیوری تک.....!“

”کیوں؟“

”کیونکہ ان کے ہاں کا رواج ہے کہ بیٹی کی پہلی ڈیلیوری میسرے میں ہوتی ہے۔“

سہا نے کمال ہوشیاری سے بات بنائی تھی۔

”عجیب رواج ہے۔ دانیال کی تو بڑی دلگ جائے گی۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔“

کمال حسن نے کہتے ہوئے سالن کی ڈش اٹھائی تھی۔

”ہاں.....! کافی ڈسٹرب ہو گیا ہے دانیال۔“

”دیکھ رہا ہوں۔“

کمال حسن نے کہا تو سہا نے ٹھنک کر پوچھا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”دانیال کو دیکھ رہا ہوں، پریشان پھر رہا ہے۔“

”ہاں.....! حالانکہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ شکر ہے، سب نارمل ہے۔“

سہا نے اطمینان سے ہو کر کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

خواجہ صاحب نے اسٹیٹ ایجنٹ کی خدمات حاصل کیں تو ان کے سارے کام بہت جلدی ہو گئے تھے۔

ان کی گربک گیا اور دوسرا گھر بھی خرید لیا۔ یہ سارا مقدر کا کھیل تھا۔ شاید ثانیہ کی قسمت میں ہی لکھا تھا کہ وہ سازشوں کی

جھٹ چڑھ گئی تھی۔ ہاسٹل سے ڈسچارج ہوئی تو خواجہ صاحب اسے نئے گھر میں لے آئے تھے۔

”ابا.....؟“

وہ حیران ہوئی۔

”یہ کس کا گھر ہے؟“

”ہمارا ہے، اب یہی ہمارا گھر ہے بیٹا.....! کیسا ہے؟“

خواجہ صاحب نے نظریں چراتے ہوئے بتا کر پوچھا تھا۔

”اچھا ہے، لیکن اب.....! میں کبھی نہیں۔“
وہ ابھڑی تھی۔

”اس میں نہ سمجھنے کی کیا بات ہے بیٹا.....؟ میں نے اس گھر کے بدلے یہ گھر لے لیا ہے۔“
خواجه صاحب یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔
”وہ گھر بیچ دیا.....؟“

وہ انفسوس سے بولی تھی۔ خواجه صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مانتا ہوں بیٹا.....! اس گھر سے میری تمہاری ہم سب کی یادیں وابستہ تھیں، لیکن زندگی اس موڑ پر آئی ہے کہ آگے کا سفر طے کرنے کے لئے ان تکلیف دہ یادوں سے چھٹکارا پانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔“

خواجه صاحب کا اپنا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔ ثانیہ نے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا۔

”جاؤ بیٹا.....! تم آرام کرو۔“

خواجه صاحب کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے اور وہ اپنے کمرے میں آئی تو شوبی کو نخی مشعل نے ساتھ کھیلنے دیکھ کر بے ساختہ مسکرائی، پھر اس کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

”پتا ہے شوبی.....! یہ کون ہے؟“

شوبی نے نفی میں سر ہلادیا۔

”یہ آپ کی چھوٹی بہن ہے۔ آپ اس کے ساتھ کھیلو گے ناں.....؟“

”کھیلوں گا۔“

شوبی مشتاق ہو گیا تھا۔

”تھک تو نہیں کرو گے ناں اسے.....؟“

”نہیں.....!“

”شاباش.....!“

اس نے شوبی کا گال چوما تو وہ پوچھنے لگا۔

”خالہ.....! یہ ڈول (Doll) ہے.....؟“

”ہاں.....! آپ کی ڈول ہے۔“

”ڈول کا نام کیا ہے.....؟“

”ڈول کا نام ہے مشعل، کیا نام ہے.....؟“

اس نے بتا کر پوچھا۔

”مشا.....“

شوبی کی زبان پر نام نہیں چڑھا۔

”مشعل.....!“

وہ ہنسنے لگی۔

پھر ادھر وہ نئے گھر کو سیٹ کرنے میں لگی تھی اور ادھر رابعہ سارا گھر سمیٹ کر میاں اور اس کے بچوں کے

ساتھ ڈھنی روانہ ہو گئی۔

جاتے ہوئے وہ بار بار خواجه صاحب سے یہی کہہ رہی تھی کہ انہیں شوبی کو نہیں روکنا چاہئے تھا۔ اب ثانیہ

وہ بچوں کو کیسے سنبھالے گی.....؟

”جیسے تم دو بچے سنبھالو گی۔“

خواجه صاحب اطمینان سے بولے تھے۔

☆.....☆.....☆

”عمیارہ بیج گئے، ہونا چاہئے۔“

کمال حسن نے ریوٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا، پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف

جانے لگے تھے کہ دانیال کو آتے دیکھ کر ٹوک کر پوچھنے لگے۔

”تم کہاں، سسرال سے آرہے ہو.....؟“

دانیال نے سیماکو دیکھا اور اس کے نظریں چرانے پر بولا تھا۔

”نہیں بھائی.....! سسرال کو میں نے خیر باد کہہ دیا ہے، ہمیشہ کے لئے۔“

”کیا مطلب.....؟“

کمال حسن کے پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

”مذاق کر رہا ہے۔“

سیمانے بوکھلا کر کہا تو دانیال یک دم زوڑ ہو گیا تھا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا بھائی.....! سچ کہہ رہا ہوں۔“

”میرا خیال ہے، ثانیہ سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہے، جب ہی اُلتا سیدھا بول رہا ہے۔“

سیماکو پھر بولنے سے باز نہیں آئی۔

”کیوں دانیال.....؟“

کمال حسن نے تصدیق کے لئے دانیال کو دیکھا۔

”بھابی کو یہی لگتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔“

دانیال نے بھی غصے میں انہیں برا بھلا کہہ دیا تھا۔
”انتہائی نامعقول ہے دانیال۔“

کمال حسن نے افسوس سے کہا، ساتھ ہی متوحش بھی ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

سیما پریشان پھر رہی تھی۔ اسے اب اپنی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ کیونکہ ابھی بھی آفس جاتے ہوئے کمال حسن کہہ گئے تھے کہ وہ خواجہ صاحب سے مل کر آئیں گے۔ سیما کی کچھ کچھ میں نہیں آیا تو دانیال کے کمرے میں آگئی اور اسے بے خبر سوتے دیکھ کر جھنجھلا ڈالا۔

”دانیال.....! دانیال.....! اٹھ جاؤ، دس بج گئے ہیں۔ آفس نہیں جاؤ گے کیا.....؟“

”نہیں.....!“

اس نے کسلندی سے جواب دیا۔

”اچھا.....! اٹھ جاؤ، میں بہت پریشان ہو رہی ہوں۔“

سیما نے کہا تو اس نے پوری آنکھیں کھول دیں۔

”کک..... کیوں.....؟ کیا ہوا ہے.....؟“

”تمہارے بھائی بہت غصے میں آفس گئے ہیں۔“

سیما اپنے آپ زچ ہو رہی تھی۔

”پھر.....؟ میرا مطلب ہے، آپ سے کچھ کہا بھائی نے.....؟“

وہ اٹھ بیٹھا۔

”نہیں.....!“

”پھر آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں.....؟ ویسے بھی یہ میرا میٹر ہے۔“

اس کے اطمینان پر سیما جھنجھلا گئی۔

”تمہارا میٹر ہے، لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کم آن بھائی.....! آپ نے کیا کیا ہے جو آپ ڈر رہی ہیں.....؟“

”تمہارے بھائی تو مجھ سے پوچھیں گے ناں.....؟“

”کیا پوچھیں گے آپ سے.....؟ خیر.....! جو بھی پوچھیں، آپ کہہ دیجئے گا، آپ کو کچھ پتا نہیں ہے۔“

انہیں جو پوچھنا ہو، مجھ سے پوچھیں۔“

وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو سیما پوچھنے لگی۔

دانیال نے کہا تو کمال حسن غصے سے دھاڑے تھے۔

”پھر کیا ہے.....؟ بتاؤ مجھے، کیا معاملہ ہے.....؟ کیوں بٹھا رکھا ہے تم نے ثانیہ کو میکے.....؟“

”میں نے نہیں بٹھایا، اسے خود شوق تھا کیسے بیٹھنے کا، بیٹھی رہے ساری زندگی وہیں۔“

دانیال بھی غصے سے کہتا تیزی سے نکل گیا۔

”دماغ خراب ہے اس کا، میں خود جاؤں گا صبح ثانیہ کے پاس۔“

کمال حسن کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ پھر صبح آفس جاتے ہوئے وہ پہلے خواجہ

صاحب کے گھر گئے لیکن وہاں تالا لگا ہوا تھا اور شام میں واپسی پر بھی تالا دیکھ کر وہ اچھنے میں گھر گئے تھے۔

”خواجہ صاحب لوگ پتا نہیں کہاں گئے ہوئے ہیں.....؟“

گھر آتے ہی انہوں نے سیما سے کہا تو وہ اندر ہی اندر خائف ہو کر بولی تھی۔

”کیا مطلب.....؟“

”میں صبح گیا تھا اور آفس سے واپسی پر بھی، لیکن خواجہ صاحب کے گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔“

انہوں نے بتایا تو سیما اطمینان سے ہو کر بولی۔

”اچھا.....! ہو سکتا ہے اپنی بڑی بیٹی رابعہ کے ہاں گئے ہوئے ہوں۔“

”ہوں.....!“

انہوں نے چند لمحوں سے سوچا، پھر سیما سے پوچھنے لگے۔

”تمہیں پتا تو ہو گا کہ دانیال اور ثانیہ کے درمیان کیا جھگڑا چل رہا ہے.....؟“

”ہاں.....! لیکن وجہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ دانیال سے پوچھتی ہوں تو وہ ناں جاتا ہے، اور ثانیہ بھی کچھ

نہیں بتاتی۔“

سیما اب سنبھل کر بول رہی تھی۔

”کیا کہتے ہیں دونوں.....؟“

کمال حسن کا اس معاملے کو اہمیت دینا سیما کو بری طرح کھل رہا تھا۔

”دانیال نے تو کل آپ کے سامنے جو کہا اور ثانیہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ کبھی اس گھر میں نہیں آئے گی۔“

انتا سمجھایا میں نے، لیکن وہ تو جیسے خد میں آگئی ہے۔“

”ایسی ہے تو نہیں وہ، خیر.....! خواجہ صاحب کو اس معاملے کا علم ہے یا وہ بھی میری طرح بے خبر

ہیں.....؟“

کمال حسن کی سوالیہ نظروں سے سیما جڑ بڑ ہو کر کہنے لگی۔

”سب خبر ہے خواجہ صاحب کو۔ ایک روز تو فون پر دانیال سے جھگڑ رہے تھے۔ میں نے خود سنا تھا۔“

”اور تم کیا ہو گئے؟“

”یہ میرا مسئلہ ہے بھابی.....! آپ خواہ مخواہ مینشن نہ لیں۔“

وہ کہہ کر اداس روم میں بند ہو گیا۔ پھر وہ برائے نام ناشتہ کر کے گھر سے نکل آیا تھا۔ آفس جانے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ یوں بھی کافی لیٹ ہو گیا تھا۔ لیکن گھر بیٹھ کر بھی کیا کرتا؟ اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی آفس کے راستے پر گاڑی ڈالی تھی کہ اسٹاپ پر تنہا کھڑی نظر آگئی۔ اس نے گاڑی اس کے قریب لے جا کر روک دی تو حنا اسے دیکھ کر بھی انجان بن گئی تھی۔

”حنا!“

اس نے شیشہ گر کر اکر اکر اب بھی وہ زور دے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”کم آن.....! میں ڈراپ کر دوں گا۔“

اس نے کہا تو حنا یوں جیسے بادل خواہ سناٹھی ہو۔

”کیا بات ہے؟ ناراض ناراض لگ رہی ہو؟“

اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا تو وہ تنک کر بولی۔

”ہاں.....! ہوں ناراض۔“

”مجھ سے؟“

اس نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا تھا۔

”ظاہر ہے، تمہیں ناراض لگ رہی ہوں تو تم سے ہی ہوں گی ناں.....!“

”ارے.....! میں نے کیا کیا ہے؟“

وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”وہی جواب میں کر رہی ہوں۔“

اس کے پہیلیاں بھجوانے پر وہ زچ ہو گیا۔

”کیا مطلب؟“

”کیوں؟.....! اس روز تم سارا وقت منہ پھلانے نہیں بیٹھے رہے تھے، میں نے کیا کیا تھا جو مجھ سے بات

نہیں کر رہے تھے؟ اب میں بھی تم سے بات نہیں کروں گی۔“

حنا کی وضاحت پر وہ گہری سانس کھینچ کر کہنے لگا۔

”سوری یار.....! اس روز اصل میں، میں بہت آپ سیٹ تھا، تم تو جانتی ہو۔“

”ہاں.....! مجھے افسوس ہے کہ تمہارا گھر ڈسٹرب ہو رہا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ آخر ثانیہ چاہتی کیا

ہے؟“

حنانے بظاہر ہمدردی جتا کر پوچھا تو وہ بس کندھے اچکا کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

ثانیہ اور اپنی دانیاں کی تصویر دیکھتے ہوئے کھوٹی تھی۔ جانے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا کہ خواجہ صاحب کی پکارنے اسے بوکھلادیا۔ جلدی سے الماری کھول کر تصویر کھڑی تھی کہ خواجہ صاحب اندر آ گئے۔

”کیا تلاش کر رہی ہو بیٹا؟“

”کچھ نہیں ابا.....! آپ بتائیں، کیا کہہ رہے تھے؟“

وہ الماری بند کر کے انہیں دیکھنے لگی۔

”وہ..... بیٹا.....! میں یہ کہہ رہا تھا کہ ابھی مجھے رفیق صاحب ملے تھے، تم نہیں جانتیں، پرانے دوست ہیں میرے۔ خیر.....! اصل بات یہ ہے کہ ان کا یہاں قریب اسکول ہے، اور میں نے ان سے بات بھی کر لی ہے۔“

اسے خواجہ صاحب کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

”کیا بات کر لی ہے ابا.....؟“

”ارے بیٹی.....! شوبی و اسکول داخل نہیں کرانا.....؟ اسی کے لئے بات کی ہے۔“

”اچھا اچھا.....! ہاں.....! یہ آپ نے اچھا کیا ابا.....! میں بھی آپ سے کہنے والی تھی کہ اب شوبی کو

اسکول جانا چاہئے۔“

”بس تو میں کل ہی اس کا ایڈمیشن کرادوں گا، ٹھیک ہے.....!“

”جی.....! آپ کے لئے چائے لاؤں؟“

اس نے پوچھا تو خواجہ صاحب بیڈ پر بیٹھے ہوئے بولے۔

”نہیں.....! بس پانی پلا دو۔“

”ابھی لائی۔“

وہ جلدی سے پانی لے آئی تو خواجہ صاحب پانی پی کر کہنے لگے۔

”کچھ چاہئے تو بتا دو۔ میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔“

”ابھی تو آئے ہیں ابا.....! آپ پھر کہاں جا رہے ہیں؟“

اس نے ٹوکا تھا۔

”ایک جگہ جاب کی بات کی تھی۔ اللہ کا شکر ہے، انہوں نے بلا لیا ہے۔ انشاء اللہ پہلی تاریخ سے جوائن

کروں گا۔“

خواجہ صاحب نے بتایا تو وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”جے تو خوشی کی بات ابا.....! لیکن مجھے افسوس بھی ہوتا ہے۔“
”افسوس کیوں.....؟“

خولہ صاحب نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔
”کیونکہ ہماری وجہ سے آپ کو اس عمر میں بھی جاب کرنی پڑ رہی ہے۔ میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں۔“

اس کی دل گرفتگی محسوس کر کے بھی خولہ صاحب ناراض ہونے لگی۔
”ٹائیہ.....! اب یہ بات کی ہے، آئندہ مت کرنا۔ اللہ نے مجھے کسی قابل سمجھا ہے، جب ہی مجھ پر تمہاری اور بچوں کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ یہ تمہارا اور بچوں کا نصیب ہے جو مجھے اس عمر میں بھی جاب مل گئی ہے، سمجھی تم.....؟“

”جی.....!“

اس نے سر جھکا لیا تو خولہ صاحب نرم پڑ کر گویا ہوئے۔
”بیٹا.....! ایک بات یاد رکھو۔ رتبہ کی رضا میں راضی رہنے میں ہی ہماری عاقبت ہے۔ وہ مالک ہے، اپنے بندوں کو ہر طرح سے آزما رہا ہے۔ دے کر بھی، لے کر بھی، اور جو اس کی آزمائش پر پورا نہیں اُترتا تو اس کے لئے آزمائش سزا بن جاتی ہے۔“

”مجھے معاف کر دیں ابا.....! میں نے آپ کا دل دکھایا۔“

وہ رو پڑی۔

”ارے نہیں بیٹا.....!“

خولہ صاحب نے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”میرا کوئی دل نہیں دکھا، ہاں اگر تم روؤ گی تو مجھے تکلیف ہوگی۔ چلو اٹھو منہ ہاتھ دھو لو، اور دیکھو مجھے بھی دیر کرادی تم نے۔“

وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر خولہ صاحب کو گیٹ تک چھوڑ کر اندر آئی تو کتنی دیر ادھر سے ادھر پھرتی پھری۔ دونوں بچے سو رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے اسے شدت سے احساس ہوا کہ دونوں باپ کے ہوتے ہوئے بھی ان کی شفقتوں سے محروم ہیں۔

”ابا نے ٹھیک کہا تھا۔ دانیال کو پتا چلنا چاہئے کہ وہ بیٹی کا باپ بن گیا ہے۔“

اس نے سوچا اور لابی میں آکر دانیال کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے پھر اسے جھٹکا لگا تھا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں ابا.....! جب تک دانیال اپنی غلطی پر تادم ہو کر آپ سے معافی نہیں مانگیں گے، میں ان کا نام بھی نہیں لوں گی۔“

اپنا وعدہ یاد آتے ہی اس نے ریسیور واپس رکھ دیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ ان دنوں کمال حسن کا سامنا کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ اسے دیکھتے ہی ٹائیہ کے بارے میں پوچھتے تھے۔ اس لئے یا تو وہ گھر آتا ہی دیر سے تھا یا آتی ہی اپنے کمرے کا رخ کرتا تو پھر اگلی صبح کمال حسن کے آفس جانے کے بعد ہی نیچے آتا تھا۔ اس وقت وہ آفس سے لوٹا تو سیما کے ساتھ حنا کو بیٹھے دیکھ کر بھی نہیں رکا اور سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔

اصل میں دوپہر سے ہی اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ ٹیبلٹ لینے سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا، تو اب وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ عموماً وہ اس وقت شاور لیتا تھا، لیکن اس وقت ہمت نہیں ہوئی۔ کپڑے بھی نہیں بدلے، جوتے موزے اُتار کر لیٹا تو کچھ دیر میں سو بھی گیا تھا۔

پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے ٹائم دیکھ کر سوچا، دوبارہ سو جائے، لیکن بھوک نے نیند اڑا دی تھی۔

”شٹ.....!“

وہ خاصا بد مزہ ہوا کہ اب جانے کب تک جاگنا پڑے گا.....؟ اپنی بے وقت نیند کو کوستے ہوئے اس نے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینے مارے، پھر کھانے کے لئے نیچے آیا اور سیدھا کچن کی طرف بڑھا تھا کہ حنا کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

”سچ آپ.....! آپ نے تو کمال کر دیا۔ دانیال تو اب ٹائیہ کا نام بھی نہیں سننا چاہتا۔“

حنا کی آواز میں خوشی کی کھٹک تھی۔ وہ ابھی ٹھٹھا نہیں تھا کہ سیما کی آواز آنے لگی۔

”اچھا.....! زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔“

”اوہو.....! اب کیا مسئلہ کڑا ہو گیا ہے.....؟“

حنا بھینچا لئی تھی۔

”تمہارے دو لہا بھائی تک بات پہنچ گئی ہے اور وہ اپنے طور پر ٹائیہ کو منا کر لانے کا سوچ رہے ہیں۔“

”کیوں.....؟ میرا مطلب ہے، جب دانیال نہیں چاہ رہا تو پھر دو لہا بھائی کو کیا ضرورت ہے.....؟ آپ

روکیں انہیں۔“

حنا کی بات پر وہ اب محتاط اور ہوشیار ہو گیا تھا۔

”کوشش تو کر رہی ہوں، لیکن وہ میری کوئی بات سن ہی نہیں رہے اور جا رہے ہیں صبح شام خولہ صاحب

کے گھر۔ وہ تو شکر ہے کہ خولہ صاحب نہیں مل رہے۔ پتا نہیں کہاں گئے ہوئے ہیں.....؟ گھر پر تالا پڑا ہوا ہے۔“

”چلیں اچھا ہے۔“

حتا کی بے نیازی پر سیانے دانت پیسے تھے۔

”لیکن کب تک؟ آخر کو لوٹ کر آئیں گے اور جو کمال کی خواہ صاحب سے ملاقات ہوگی، پھر تو

سمجھو سارا بنانا کھیل بڑو جائے گا۔“

”اللہ نہ کرے آپا.....! ایسی خوف ناک باتیں تو نہ کریں۔“

”تو کیا کروں؟ تم سے زیادہ مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔ میں نے تمہارے دلہا بھائی سے یہاں تک

کہہ دیا ہے کہ تانیہ طلاق مانگ رہی ہے، اور دیکھو دانیال نے میری بات کا یقین کر لیا، لیکن.....“

”اُف خدایا.....!“

دانیال کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ بھوک کی شدت اسے نیچے لے آئی تھی، انہی

پیروں واپس سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ بمشکل اپنے کمرے میں آتے ہی وہ

یوں اوندھے منہ بیڈ پر گر اٹھا جیسے بڑی زور کی ٹھوکر لگی ہو، اور ٹھوکر تو لگی تھی۔

”یا اللہ.....! میں نے ہمیشہ بھائی کو ماں کا درجہ دیا اور انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا.....؟ اتنی گھناؤنی

سازش.....؟ تباہ کر دیا مجھے، کیسے سامنا کروں گا تانیہ اور خواجہ صاحب کا.....؟“

اس کے دماغ میں جھپٹیں اُٹھنے لگی تھیں اور نظروں کے سامنے وہ منظر آں سما یا جب تانیہ نے کہا تھا۔

”ذرا تمیز نہیں ہے، اتنا ہی نہیں پتا، کسی کے کمرے میں جانے سے پہلے دستک دی جاتی ہے۔“

”یہ تم کس کے بارے میں کہہ رہی ہو.....؟“

اس نے سمجھ کر بھی پوچھا تھا۔

”حتا کے بارے میں جو ابھی منہ اٹھائے چلی آئی تھی۔“

”کمال ہے، ایک تو وہ جہار خیال کر رہی ہے۔“

”میرا نہیں، آپ کا۔“

”اُف.....!“

اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔ پھر سر کو زور زور سے جھٹکے دیے، لیکن

جانے کیا کچھ یاد آتا چلا جا رہا تھا۔ بہت پریشان ہو کر اس نے نکیوں میں سر گھسا کر سونے کی کوشش کی، لیکن اب نیند

کہاں آئی تھی.....؟ پوری رات وہ کانٹوں پر لوٹتا رہا تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ فجر کی اذان ہوئی، تب اس نے

بستر چھوڑ دیا۔ وضو کر کے نماز پڑھی، پھر نیچے بچن میں آکر چائے بنائی اور منگ لے کر بچن سے نکلا تھا کہ سامنے سے

آتی ہوئی سیما سے دیکھ کر حیرت سے بولی تھی۔

”ارے.....! تم اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے.....؟“

”بس.....! آنکھ کھل گئی، بلکہ آنکھیں کھل گئیں۔“

اس کا جتنا شاید سیانے محسوس ہی نہیں کیا، محظوظ ہوئی تھی۔

”آنکھیں کھل گئیں.....؟“

”آپ ہنس کیوں رہی ہیں۔“

اس نے پھر ٹوکا۔

”تمہاری حالت پر، مجنوں لگ رہے ہو۔ کہیں پھر سے تو عشق نہیں ہو گیا.....؟“

سیانے اسے چھیڑا تھا۔

”کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔“

اس نے کہہ کر چائے کا سپ لیا تھا۔

”اچھا.....! کون ہے.....؟“

سیانے اشتقاق سے پوچھا۔

”ہٹاؤں گا۔“

وہ کہہ کر کڑا نہیں، اپنے کمرے میں آکر اس نے چائے پی۔ پھر اُجالا پھیلنے تک وہ گزشتہ باتیں ذہن

سے جھٹک کر اپنا اگلا اقدام سوچتا رہا۔ گوکہ یوں ایک دم سے تانیہ یا خواجہ صاحب کے سامنے جا کھڑے ہونا بہت

مشکل تھا۔ پھر بھی اس نے ہمت باندھ لی، اور بظاہر آفس کے لئے تیار ہو کر نکلا تو پہلے خواجہ صاحب کے گیٹ پر گاڑی

روکی اور اُترتے ہی اسے دھچکا لگا تھا۔

گیٹ پر مکان برائے فروخت کا بورڈ لگا تھا۔ اسے حیرت سے زیادہ پریشانی نے گھیر لیا۔ کتنی دیر وہ غیر

یقینی سے بورڈ پر نظریں جمائے کھڑا رہا، پھر ادھر ادھر کے کچھ لوگوں سے خواجہ صاحب کے بارے میں پوچھا تو سب

نے ایک ہی جواب دیا کہ خواجہ صاحب کوئی مہینہ بھر پہلے یہ گھر بیچ کر جا چکے ہیں۔ کہاں؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

پھر وہ سارا دن خواجہ صاحب کی تلاش میں بھٹکتا رہا تھا۔ ان کے آفس بھی گیا جہاں سے ان کے رہنا

ہونے کی خبر ملی اور وہاں ان کے پرانے گھر کا ایڈریس تھا۔ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر آخری اُمید اسے

رابعہ یاد آئی تو اس نے فوراً گاڑی اس کے گھر کے راستے پر ڈال دی۔ لیکن جب وہاں موجود چوکیدار نے بتایا کہ سب

لوگ وہی شفٹ ہو گئے ہیں تو اس کے جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔

”سب لوگ.....؟ گھر والوں میں کون کون.....؟“

اس نے بتائی سے پوچھا تھا۔

”بابا.....! پورا خاندان گیا ہے۔ اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔ آپ کدھر سے آیا ہے.....؟ صاب کا رشتہ

دار ہے کیا.....؟“

چوکیدار نے منہ بنا کر پوچھا۔

”ہاں..... اوہ..... خیر..... تم بتاؤ، صاب کا کوئی نمبر وغیرہ ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں صاب.....! ہم ملازم آدمی ہیں۔“

چوکیدار نے اس کی مایوسی میں آخری کیل ٹھوک دی تھی۔

☆.....☆.....☆

اوپر کے پورشن میں کرایے دار آنے سے ٹائیپ کافی بہل گئی تھی۔ یک پکل تھا، ایک ہی بیٹی تھی، شعل کے برابر۔ چند دنوں میں ٹائیپ کی فوزیہ کے ساتھ دوستی ہو گئی تو فارغ وقت میں کبھی وہ فوزیہ کے پاس تو کبھی فوزیہ اس کے پاس آ جاتی تھی۔ اس وقت فوزیہ نے باتوں کے دوران اچانک پوچھا تھا۔

”تمہارا میاں کہاں گیا ہوا ہے؟“

”میرے میاں باہر ہوتے ہیں، میرا مطلب ہے، ملک سے باہر۔“

وہ پہلے سے یہ جواب سوچ چکی تھی۔

”پھر تو تم بھی اس کے پاس چلی جاؤ گی۔“

فوزیہ نے کہا تو وہ پھکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”نہیں.....! اتنی جلدی جانا تو ممکن نہیں ہے۔“

”ہاں.....! فیملی کو بلانا آسان نہیں ہوتا۔ کتنا عرصہ ہوا ہے تمہارے میاں کو گئے ہوئے؟“

”بہی کوئی تین چار مہینے۔“

”پھر تو واقعی ابھی تمہارا جانا ممکن نہیں ہے۔“

”ہوں.....! تمہاری بیٹی بہت پیاری ہے۔“

وہ اس موضوع سے ہٹنے کی خاطر فوزیہ کی بیٹی کو پیار کرنے لگی۔

”بچے تو تمہارے بھی ماشاء اللہ بہت پیارے ہیں۔“

فوزیہ نے کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”بچے نہیں، میری بھی ایک ہی بچی ہے۔“

”اور یہ بیٹا؟“

فوزیہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ اپنی جلد بازی پر اندر ہی اندر جھنجلائی، پھر کہنے لگی۔

”یہ میری بہن کا بیٹا ہے۔ اصل میں ابا اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ یہ بھی ابا کے بغیر نہیں رہتا تھا۔“

اس لئے یہ ہمارے پاس ہے۔“

”اچھا اچھا.....! اور تمہاری بہن کہاں رہتی ہے؟ کبھی دیکھا نہیں اسے۔“

”وہ وہی میں ہوتی ہے۔“

اس نے جواب دے کر بات کا رخ فوزیہ کی طرف موڑ دیا۔

”تمہاری سسرال یہیں ہے، میرا مطلب ہے، اسی شہر میں؟“

”نہیں.....! میرا سسرال لاہور میں ہے۔ میری شادی بھی وہیں ہوئی تھی۔ بس چار مہینے میں سسرال

لاہور ہی، پھر اپنے میاں کو وہاں سے نکال کر لے آئی۔“

فوزیہ خود ہی ہنسی، پھر کہنے لگی۔

”بھئی.....! مجھ سے نہیں سسرالیوں کے ناز و غرے برداشت ہوتے۔ چار مہینے بہت مشکل سے گزارے

میں نے۔ تم نے بھی اچھا کیا اپنے ابا کے پاس آ گئیں، ورنہ تمہارے میاں کی ساری کمائی سسرالی لے اڑتے۔“

وہ زبردستی مسکرائی تھی۔

☆.....☆.....☆

سیما کتنی دیر سے بار بار خواجہ صاحب کا نمبر ڈائل کر رہی تھی، یعنی ان کے پرانے گھر کا، اور ادھر مسلسل

لاہور ہی تھی لیکن کوئی ریسپونس نہیں کر رہا تھا۔

”گلتا ہے ابھی تک آئے نہیں خواجہ صاحب لوگ۔“

سیما نے آخر مایوسی سے ریسپورڈ کر کہا تو حنا چونک کر پوچھنے لگی۔

”کیا مطلب.....؟ آپ خواجہ صاحب کے ہاں فون کر رہی تھیں؟“

”ہاں.....! دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ لوگ آئے کہ نہیں.....؟“

پھر سوچتے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

”ٹائیپ اتنے دن تو ہاسپٹل نہیں رہ سکتی، پھر کہاں ہوگی.....؟“

”کہیں بھی ہوا یا.....! ہمیں کیا.....؟ اچھا ہے، خود ہی ہمارے راستے سے ہٹ گئی۔“

حنانے سر جھٹک کر کہا تو سیما تشویش سے بولی۔

”اور جو کسی دن اچانک آگئی تو.....؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بس اپنے میاں کو قابو میں رکھیں۔ وہ نہ ٹائیپ کی سائٹل لینے کھڑے ہو جائیں۔“

”اور دانیال.....؟“

سیما نے سوچتے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”دانیال میرے قابو میں آچکا ہے۔“

چوکیدار نے منہ بنا کر پوچھا۔

”ہاں..... اوہ..... خیر..... تم بتاؤ، صاب کا کوئی نمبر وغیرہ ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں صاب.....! ہم ملازم آدمی ہیں۔“

چوکیدار نے اس کی مایوسی میں آخری کیل ٹھوک دی تھی۔

☆.....☆.....☆

اوپر کے پورشن میں کرایے دار آنے سے ثانیہ کافی بہل گئی تھی۔ یک کپل تھا، ایک ہی بیٹی تھی، شعال کے برابر۔ چند دنوں میں ثانیہ کی فوزیہ کے ساتھ دوستی ہو گئی تو فارغ وقت میں کبھی وہ فوزیہ کے پاس تو کبھی فوزیہ اس کے پاس آ جاتی تھی۔ اس وقت فوزیہ نے باتوں کے دوران اچانک پوچھا تھا۔

”تمہارا میاں کہاں گیا ہوا ہے؟“

”میرے میاں باہر ہوتے ہیں، میرا مطلب ہے، ملک سے باہر۔“

وہ پہلے سے یہ جواب سوچ چکی تھی۔

”پھر تو تم بھی اس کے پاس چلی جاؤ گی۔“

فوزیہ نے نہ کہا تو وہ بھیک کی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”نہیں.....! اتنی جلدی جانا تو ممکن نہیں ہے۔“

”ہاں.....! فیملی کو بلانا آسان نہیں ہوتا۔ کتنا عرصہ ہوا ہے تمہارے میاں کو گئے ہوئے؟“

”میری کوئی تین چار مہینے۔“

”پھر تو واقعی ابھی تمہارا جانا ممکن نہیں ہے۔“

”ہوں.....! تمہاری بیٹی، بہت پیاری ہے۔“

وہ اس موضوع سے ہٹنے کی خاطر فوزیہ کی بیٹی کو پیار کرنے لگی۔

”بچے تو تمہارے بھی ماشاء اللہ بہت پیارے ہیں۔“

فوزیہ نے کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”بچے نہیں، میری بھی ایک ہی بچی ہے۔“

”اور یہ بیٹا.....؟“

فوزیہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ اپنی جلد بازی پر اندر ہی اندر جھنجھلائی، پھر کہنے لگی۔

”یہ میری بہن کا بیٹا ہے۔ اصل میں ابا اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ یہ بھی ابا کے بغیر نہیں رہتا تھا۔“

اس لئے یہ ہمارے پاس ہے۔“

”اچھا اچھا.....! اور تمہاری بہن کہاں رہتی ہے.....؟ کبھی دیکھا نہیں اسے۔“

”وہ ڈبئی میں ہوتی ہے۔“

اس نے جواب دے کر بات کا رخ فوزیہ کی طرف موڑ دیا۔

”تمہاری سرال سہیں ہے، میرا مطلب ہے، اسی شہر میں.....؟“

”نہیں.....! میرا سرال لاہور میں ہے۔ میری شادی بھی وہیں ہوئی تھی۔ بس چار مہینے میں سرال

لاہور ہی، پھر اپنے میاں کو وہاں سے نکال کر لے آئی۔“

فوزیہ خود ہی ہنسی، پھر کہنے لگی۔

”بھئی.....! مجھے سے نہیں سرال یوں کے نازخے برداشت ہوتے۔ چار مہینے بہت مشکل سے گزارے

میں نے۔ تم نے بھی اچھا کیا اپنے ابا کے پاس آ گئیں، ورنہ تمہارے میاں کی ساری کمائی سرال لے لڑتے۔“

وہ زبردستی مسکرائی تھی۔

☆.....☆.....☆

سیما کتنی دیر سے بار بار خواجہ صاحب کا نمبر ڈائل کر رہی تھی، یعنی ان کے پرانے گھر کا، اور ادھر مسلسل مل جاتی تھی لیکن کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

”لگتا ہے ابھی تک آئے نہیں خواجہ صاحب لوگ۔“

سیما نے آخر مایوسی سے ریسیور رکھ کر کہا تو حنا جو تک کر پوچھنے لگی۔

”کیا مطلب.....؟ آپ خواجہ صاحب کے ہاں فون کر رہی تھیں.....؟“

”ہاں.....! دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ لوگ آئے کہ نہیں.....؟“

پھر سوچتے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

”ثانیہ اتنے دن تو ہاپٹل نہیں رہ سکتی، پھر کہاں ہوگی.....؟“

”کہیں بھی ہوا یا.....! ہمیں کیا.....؟ اچھا ہے، خود ہی ہمارے راستے سے ہٹ گئی۔“

حنانے سر جھٹک کر کہا تو سیما تشویش سے بولی۔

”اور جو کسی دن اچانک آگئی تو.....؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بس اپنے میاں کو قابو میں رکھیں۔ وہ نہ ثانیہ کی سائیڈ لینے کھڑے ہو جائیں۔“

”اور دانیال.....؟“

سیما نے سوچتے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”دانیال میرے قابو میں آچکا ہے۔“

دانیال نے بیٹھتے ہی بلا ارادہ پوچھ لیا۔

”بھائی نہیں ہیں گھر پر.....؟“

”نہیں.....! تمہاری بھائی، حنا اور بچوں کے ساتھ قریبی مارکیٹ تک گئی ہیں۔“

انہوں نے بتایا تو وہ خاموش ہو رہا۔

”ہاں.....!“

کمال حسن بغور اس کا جائزہ لے کر گویا ہوئے۔

”میں تم سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ تمہارے اور ثانیہ کے درمیان کیا جھگڑا ہے.....؟“

وہ فوراً کچھ نہیں بول سکا تو کمال حسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بتاؤ دانیال.....! ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو تم دونوں ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔“

”کچھ نہیں بھائی.....! بس غلط فہمی کی بنا پر معاملہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔“

وہ بہت ضبط سے بولا تھا۔

”کیسی غلط فہمی.....؟“

”میں نہیں بتا سکتا بھائی.....! بس میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔“

اس کی دل گرفتگی کمال حسن کو شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن جب تک تم اصل بات نہیں بتاؤ گے، میں کیسے اس معاملے کو سلجھا

سکتا ہوں.....؟“

”رہنہ دیں بھائی.....! میرا معاملہ سلجھائیں گے تو آپ کا معاملہ کٹھنائی میں پڑ جائے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“

کمال حسن نے فوراً ٹوکا اور وہ بتانا نہیں چاہتا تھا، جب ہی ہونٹ بھیجنے لگا۔

”دانیال بیٹا.....! بھروسہ رکھو مجھ پر، بھائی ہوں تمہارا۔“

کمال حسن نے اتنی شفقت سے کہا کہ اس کا ضبط جواب دے گیا۔ بچوں کی طرح ان سے لپٹ کر رو

”بھائی.....! میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔“

وہ سیما اور حنا کی سازشوں کے بارے میں بتانا شروع ہوا تو پھر بولتا چلا گیا۔ کمال حسن انتہائی شاکند اور

مالے میں بیٹھتے تھے۔

”وعدہ کریں بھائی.....! آپ بھائی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ آپ کو میری قسم بھائی.....!“

وہ خود تو ٹٹ گیا تھا، لیکن بھائی کو لٹھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب تک کمال حسن سے وعدہ ہیں لے لیا،

حنا اترا تھی، تب ہی دانیال کو آتے دیکھ کر سیما فوراً سنبھل کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تم کہاں سے آرہے ہو دانیال.....؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری.....؟ صبح بھی سست لگ رہی

تھی۔“

”اوہو آپا.....! آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ آفس میں دل نہیں لگا ہوگا، آگیا۔ کمال

دانیال.....؟“

حنانے دلر با انداز میں تصدیق چاہی تھی۔

”جی.....! یہی بات ہے۔“

وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”سن لیا، یہی بات ہے۔“

حنانے پھر اتر آکر سیما سے کہا تو وہ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولی۔

”اچھا چلیں، جلدی سے کھانا لگا دیں، ورنہ وہ بھوکا ہی سو جائے گا۔“

”چلیں.....!“

حناس کے ساتھ کچن میں آگئی اور ابھی سیما کھانا گرم کر رہی تھی کہ گاڑی کی آواز سن کر وہ اچھپے میں گر

کر پڑی۔

”یہ دانیال پھر کہاں چلا گیا.....؟“

”میں دیکھتی ہوں۔“

حنا فوراً بھاگی گئی تھی، لیکن پھر منہ لٹکائے ہوئے آئی تو سیما نے اس سے کچھ پوچھنے کی بجائے چوہا بند کر

دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کمال حسن ٹی وی پر نو بجے کی ہیڈ لائن سن رہے تھے۔ جب دانیال آیا اور غالباً ان سے کترا کر نکل

چاہتا تھا کہ انہوں نے فوراً اسے پکار لیا۔

”دانیال.....!“

”جی.....!“

دانیال نے رُک کر کچھ خائف نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ صوفے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

”ادھر آؤ بیٹھو.....! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”جی.....!“

وہاں سے نہیں اٹھا تھا۔ کمال حسن اپنے کمرے میں آگئے۔ ان کے دل پر بڑا بوجھ آن پڑا تھا۔ دانیال انہیں اس بچوں کی طرح عزیز تھا اور ظاہر تو سیما بھی یہی کرتی تھی اور درحقیقت وہ کیا تھی، سوچ سوچ کر ان کا ذہن جھٹکنے لگا۔ بیڑکراؤن پر سر رکھ کر انہوں نے آنکھیں بند کی تھیں کہ دروازہ کھلنے پر فوراً آنکھیں کھول دیں۔

”ارے.....! آپ سو گئے تھے کیا؟“

سیما نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ انہوں نے جواب نہیں دیا تو پوچھنے لگی۔

”کھانا کھالیا تھا آپ نے؟“

”ہوں!“

انہوں نے جیسے خود پر ضبط کیا تھا۔

”دانیال نے تو نہیں کھایا ہوگا۔ چلیں آپ لیٹیں، میں دانیال کو کھانا دے کر آتی ہوں۔“

سیما کہہ کر جانے لگی کہ انہوں نے روک دیا۔

”نکو سیما.....! دانیال کو زیادہ سر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی اسے اس کے حال پر چھوڑا۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ ہم بھی اس کا خیال نہیں کریں گے تو.....“

”بس! میں نے کہہ دیا ناں، تم اس کی طرف داری مت کرو۔“

انہوں نے سختی سے سیما کو ٹوک دیا تو وہ مسکینی سے بولی۔

”بھوکا سو جائے گا کمال.....! وہ۔“

”سوئے دو، چار دن بھوکا سوئے گا تو بیوی کو لانے کا خیال آئے گا۔“

ان کا انداز ہنوز تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے.....! کل سے نہیں پوچھوں گی اس سے۔ کھانا، چائے کچھ بھی نہیں۔ ابھی تو ہا

دیں۔“

سیما ہٹ دھری کو ہمدردی میں لپیٹ رہی تھی۔

”تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟ کوئی ضرورت نہیں اس کے پاس جانے کی۔“

کمال حسن غضب ناک ہو گئے، تب وہ خاموش تو ہو گئی، لیکن اندر ہی اندر تلملارہی تھی، اور اسے ہلکا

بھی ہو گیا تھا کہ کوئی بات ہوئی ہے۔ ضرور دانیال نے ثانیہ کے خلاف کچھ کہا ہوگا جیسے اس دن کہہ رہا تھا کہ اس

سرسال کو ہمیشہ کے لئے خبر باد کہہ دیا ہے۔ اس کے خیال میں ایسی ہی کوئی بات ہوئی ہوگی جس پر کمال حسن ہلکا

ہورہے ہیں۔

بہر حال اسے جاننے کی جلدی تھی اور اس وقت تو وہ دل پر پتھر رکھ کر رہ گئی، لیکن صبح کمال حسن نے ہا

کے بعد جیسے ہی دانیال ناشتے کی ٹیبل پر آیا، وہ اپنے ہمیشہ والے انداز میں کہنے لگی۔

”پتا ہے دانیال.....! رات تمہارے بھائی کہہ رہے تھے کہ دانیال سے کھانے ناشتے کا مت پوچھا کرو۔ لہذا کہہ رہے تھے کہ بھوکا رہنے دو اسے۔“

”کیوں؟“

دانیال نے قصداً اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

”ان کا کہنا ہے کہ تم بھوکے رہو گے تو بیوی کو لانے کا خیال آئے گا تمہیں۔“

سیما بڑی کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اچھا.....! ویسے بھائی کہہ تو ٹھیک رہے تھے۔ چلیں آزماتا ہوں، آج سے فاقے شروع۔“

دانیال نے کہہ کر سلاش کی پلیٹ پر بے دھمکی طور پر بولی۔

”ارے ارے.....! یہ کیا کر رہے ہو.....؟ ناشتہ کرو آرام سے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ نہیں چاہتیں کہ مجھے ثانیہ کو لانے کا خیال آئے؟“

دانیال نے بظاہر مذاق میں کہا اور وہ شپٹا کر بکڑنے لگی۔

”پاگل ہو گئے ہو.....؟ میں کیوں نہیں چاہوں گی.....؟ میرا بس چلے تو ابھی لے آؤں اسے۔“

”اب کہاں سے لائیں گی.....؟ وہ تو چلی گئی یہاں سے۔“

بہت ضبط کے باوجود دانیال کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔

”سک..... کیا مطلب؟ کہاں چلی گئی؟“

”وہی.....!“

”ذہنی.....؟ مگر کس کے ساتھ؟“

سیما کی حیرت فطری تھی۔

”راہبہ کے ساتھ، سب لوگ چلے گئے، خواجہ صاحب بھی۔“

وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو سیما نے جلدی سے پوچھا۔

”یہ تم سے کس نے کہا؟“

”بس.....! پتا چل گیا ہے، اور اب میں بھی یہاں نہیں رہوں گا۔“

وہ کہہ کر تیزی سے نکل گیا۔

”دانیال.....! دانیال.....!“

سیما اس کے پیچھے لپکی، لیکن پھر رُک گئی تھی۔

وہ چپ چاپ کھڑی انہیں اپنا سوٹ کیس تیار کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور منتظر بھی تھی کہ وہ اپنی کس کے بارے میں اس سے پوچھیں گے، لیکن وہ خود ہی سوچ کر الماری کی طرف بڑھتے اور مطلوبہ چیز تلاش کر کے سوٹ کیس میں رکھ دیتے۔ جہانگیر کی منگنی انتہائی سادگی سے ہو چکی تھی اور ان کی واپسی پر ہی ایک سال بعد اس کی شادی ا پروگرام تھا۔ وہ یوں ہی کچھ دیر تک ضبط کئے کھڑی رہی، دیکھتی رہی، لیکن جیسے ہی یہ خیال آیا کہ اگر یہ اسی طرح چپ چاپ چلے گئے تو وہ مزید ایک سال تک اسی طرح آس و زاس کی کیفیت میں گھری رہے گی، اور اسی اذیت و نجات کی خاطر ہی وہ آگے بڑھی اور ہاتھ مار کر سوٹ کیس بند کر دیا، اور وہ جو الماری کی طرف بڑھ رہے تھے، فوہا پلٹ کر دیکھا تو وہ کنبے کنبے۔

”آخر آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“

”کیا کر رہا ہوں میں؟“

انہوں نے ناگواری سے اٹنا اسی سے پوچھا تو وہ دبے دبے لہجے میں چیخ پڑی۔

”گویا آپ جانتے ہی نہیں کہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ مجھے ایک مسلسل عذاب میں مبتلا کر کے، کتنے اطمینان سے ہیں؟“ سچ بولنے کی اگر یہ سزا ہے تو مجھے منظور نہیں جہانگیر! آپ جانے سے پہلے میرے بارے میں فیصلہ کر کے جائیں۔“

”کیا فیصلہ؟“

وہ انجان بنے۔

”انجان مت بنیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

”ہاں!۔“

وہ سوٹ کیس پر ہاتھ رکھ کر بیڈ پر بیٹھ گئے، پھر اچانک اس سے پوچھنے لگے۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں؟“

اس نے اپنی طرف اشارہ کیا اور نظریں ان پر جما کر اسی طرح کھڑی رہی۔

”میرا مطلب ہے، اس عرصے میں میرے رویے سے مایوس ہو کر تم نے اپنے بارے میں کچھ تو ۲۳

ہوگا؟“

”جی؟“

وہ تلخ ہو کر مڑنے لگی۔

”اس تمام عرصے میں، میں صرف یہ سوچتی رہی ہوں کہ آپ پر اعتقاد کر کے میں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے، مجھے پہلے آپ کے طرف کو آ زمانا چاہئے تھا، لیکن نہیں! میں جانتی تھی، کوئی مرد اتنے طرف والا نہیں ہوتا،

ہاں کی ذرا سی غلطی کو نظر انداز کر سکے۔ پھر بھی پتا نہیں کیسے میں نے سوچ لیا کہ شاید آپ کچھ مختلف ہوں۔“ وہ حیران ہو کر اسے بولنے دیکھ اور سن رہے تھے، جس کا ضبط اچانک جواب دے گیا تھا۔ خود اپنی طرف نے نظریں چرا کر ان کی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے بولی۔

”ایک بات بتائیں، آپ مرد لوگ بیویوں کی گزشتہ زندگی سے اتنی دلچسپی کیوں رکھتے ہیں؟“

”کیا نہیں رکھنی چاہئے؟“

”نہیں!۔ اور میں صرف اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے کہوں گی کہ میں جب تک اپنے والدین کے گھر میں تھی تو اس وقت تک میری زندگی پر صرف میرا اور میرے والدین کا اختیار تھا اور اپنی اس وقت کی تمام لاپٹیوں اور کوتاہیوں کے لئے میں جوابدہ بھی اپنے والدین کے سامنے تھی۔ آپ کا نہ کوئی حق تھا، نہ اختیار۔ کیونکہ آپ تو مجھے جانتے تک نہیں تھے، پھر کیوں میری غلطی کا حساب مانگتے ہیں؟“ وہ کچھ بھر سانس لینے کوڑکی، پھر کہنے لگی۔

”البتہ آپ کی زوجیت میں آنے کے بعد سے میں اپنی معمولی سی غلطی کے لئے بھی آپ کے سامنے جوابدہ ہوں، اور اب آپ بتائیں، یہاں آنے کے بعد مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا؟“ میری محبت میں آپ نے کی ہلی یا خدمت میں؟“ یا میں آپ کے ساتھ وفا دار نہیں؟“ وہ خاموش ہو کر جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی اور انہیں بولنے پر آمادہ نہ پا کر تلخ ہنسی کے ساتھ بولی۔

”چہ چہ؟ خوب!۔ یعنی مرد تو اپنی گزشتہ زندگی کی رنگینیاں مزے لے لے کر اور فخر سے بتاتا ہے، اور بیوی کے بارے میں سوچ کتنی مختلف ہو جاتی ہے؟“

”میں نے کبھی تمہیں رنگین داستان نہیں سنائی۔“

وہ ہنسنے لگی۔

”زوجہیب سے متعلق تو سنائی ہیں، اور آپ اس سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ آپ کا واحد دوست

ہے۔“

”اے میرا دوست مت کہو۔“

وہ فوراً بولے تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ محض اس خیال سے کہ وہ اس کے بارے میں مزید کچھ کہیں، کہ وہ جان سکے کہ اس کی حقیقت جاننے کے بعد وہ اس سے لے بھی ہیں یا نہیں؟ اور وہ پتا نہیں بتانا نہیں چاہتے تھے یا کیا تھا کہ اس قدر کہہ کر خاموش تو ہوئے ہی، رخ بھی موڑ لیا، اور اس نے سوچا، جب بات شروع ہوئی تھی تو اسے درمیان میں چھوڑنا حماقت ہے۔ وہ دم بڑھا کر ان کے سامنے آتے ہوئے بولی۔

”میرے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“ میرا مطلب ہے، اس عرصے میں آپ نے کچھ تو سوچا

”ہاں.....! لیکن میں تمہارے بارے میں نہیں، بلکہ زوہیب کے متعلق سوچتا رہا ہوں، اور اب تم حیران ہوں کہ اس نے میری عزت سے کھیلنا کیسے گوارہ کر لیا.....؟“

”میں صرف اپنے بارے میں سننا چاہتی ہوں۔“

وہ ٹوک کر بولی۔

”تم سے میں کیا کہوں.....؟ میں جانتا ہوں تم زیادہ قصوروار نہیں ہو، پھر بھی مجھے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ یعنی اتنا عرصہ تم اس کے فریب میں رہیں۔ بہر حال، یہ موضوع میرے لئے خاصا تکلیف دہ ہے۔ میں اس پر بات نہیں کرنا چاہتا۔“

وہ جو خود اندر ہی اندر جزبہ زور ہی تھی، اس نے شکر کیا کہ انہوں نے خود ہی موضوع ختم کر دیا۔ درزدہ نظروں سے انہیں دیکھ کر بولی۔

”جب آپ مجھے بہت زیادہ قصوروار نہیں سمجھتے تو پھر اتنے زیادہ فحاشیوں ہیں.....؟ میری ذات سے اتنی لاتعلقی کیوں.....؟“

”اور کیا کر سکتا ہوں میں.....؟ جب تم سامنے آتی ہو تو میرا ذہن بھٹکنے لگتا ہے۔ جیسی میں تم سے نظریں چلا لیتا ہوں۔“

انہوں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ افسردگی سے مسکرائی۔

”شاید آپ کی جگہ میں ہوتی تو میں بھی ایسا ہی کرتی۔ بہر حال، اب تو آپ جا رہے ہیں، اور وہاں میں نہیں ہوں گی۔“

اپنی بات کہہ کر وہ پلٹنے لگی تو انہوں نے اس کی کلائی تھام لی۔

”کہاں نہیں ہوگی.....؟“

”آپ کے سامنے، آپ کے آس پاس۔“

اس کا بوجھ بھگ گیا۔

”دل میں جو ہو، اس کا کیا کروں.....؟“

”جہانزیب.....!“

اس نے بے یقینی سے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی نہ ہی انداز میں وارنگلی، بس لہجہ کی سچائیوں کا ہلکا سا ٹکس آنکھوں میں لہرا رہا تھا اور اس کے لئے یہی بہت تھا۔ وہ ان کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور ان کے ہاتھ تھام کر بولی۔

”بس.....! مجھے دل میں ہی رہنے دیں۔“

”دل میں تو ہو، لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

وہ انہیں خود سے اُلجھتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”چنانچہ میں کیا چاہتا ہوں.....؟ جب تم سامنے آتی ہو تو مجھے غصہ آنے لگتا ہے اور جب نظروں سے اوجھل ہوتی ہو تو میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں.....؟“

انہوں نے سادگی سے پوچھا تو وہ جو یہ اطمینان حاصل کر چکی تھی کہ وہ نہ تو اس سے متنفر ہیں اور نہ ہی کوئی انتہائی قدم اٹھائیں گے، ان کی آنکھوں میں دیکھ کر ہلکی سی شوخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اب ویسے بھی آپ مجھ سے دُور جا رہے ہیں، وہاں تنہائی میں جب مجھے دیکھنے کو دل چاہے تو میرا تصور کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیجئے گا، پھر جیسے ہی مجھ پر غصہ آئے تو فوراً آنکھیں کھول کر.....“

”لاحول پڑھ لیا کروں۔“

وہ ہر جتہ بولے اور خود ہی بے ساختہ ہنسنے بھی تو وہ انہیں گھورنے لگی۔

”بہت خراب ہیں آپ.....!“

”اسی لئے تمہیں یہاں سے نکال رہا ہوں۔ چلو اپنا سامان باندھو۔“

وہ ہنسی روک کر عرب سے بولے۔

”کیا مطلب.....؟“

وہ ایک دم کھڑی ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

”بس.....! اب تم یہاں نہیں رہو گی۔“

”کیا.....؟“

اس کی ساری شوخی پل میں ہوا ہو گئی۔

”جلدی کرو، وقت کم ہے۔“

انہوں نے غلٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوبارہ اپنا سوٹ کیس کھولا اور اسے الماری کی طرف دھکیل دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے.....؟ الماری کا پتہ تھام کر چپ چاپ انہیں دیکھنے لگی۔ اسی وقت اماں اونچی آواز میں بولتی ہوئی ان کے کمرے میں آ گئیں اور آتے ہی ان سے کہنے لگیں۔

”میں تو کہتی ہوں، ابھی ڈھن کو بیس رہنے دو۔ خبر سے بچے ہو جائے، پھر بلا لینا۔“

”یہ اماں کیا کہہ رہی تھیں.....؟“

وہ فوراً ان کی طرف متوجہ ہوئی تو پیچھے سے ان کی آواز آئی۔

”نہیں اماں! میرے ساتھ جائے گی۔“

”آپ کے ساتھ؟“

”وہ فوراً آگے بڑھ آئی۔“

”کیوں؟ تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا؟“

”انہوں نے اس کی تھمرا آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔“

”نہیں!“

وہ گزشتہ سارے دنوں کی کدورتیں بھلا کر مسکرائی اور اماں کی موجودگی کی وجہ سے مزید کچھ کہہ نہ سکی، پھر بھی الماری کی طرف بڑھتے بڑھتے شونی سے بھر پور مسکراہٹ ان کی نذر کر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

حنانہ یونیورسٹی سے سیدھی ادھر ہی آگئی تھی۔ آگے سیمادانت کچپا کچپا کر ”دانیال، دانیال“ کا ورد کر رہی تھی۔ حنانے چند لمحے رک کر اسے دیکھا بلکہ سنا، پھر قریب آ کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا آپا؟“ یہ ”دانیال، دانیال“ کیا کر رہی ہیں؟“

”دامخ خراب ہو گیا ہے میرا، جب ہی دانیال، دانیال کر رہی ہوں۔“

سیمانے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا تو حنانہ بجائے خائف ہونے کے ہنسنے لگی۔

”بند کرو اپنا منہ، زہر لگ رہی ہے مجھے تمہاری ہنسی۔“

سیمانے مزید غصہ دکھایا تو حنانہ چڑ کر بولی۔

”کیا ہو گیا ہے آپا؟ کسی کا غصہ مجھ پر کیوں نکال رہی ہیں؟“

”تو اور کس پر نکالوں؟ تمہارے لئے ہی میں نے اتنے چکر چلائے اور نتیجہ صفر!“

”کیوں صفر؟ کیا ٹائیڈ واپس آ رہی ہے؟“

حنانہ فوراً پوچھا۔

”وہ تو نہیں آ رہی، دانیال جارہا ہے اس کے پیچھے، وہ بھی ڈی۔“

سیمانے تھلاہٹ عروج پر تھی۔

”ڈی؟“

حنانہ سچھی نہیں۔

”ہاں! یہی کہہ رہا تھا دانیال کہ ٹائیڈ ڈی چلی گئی ہے اور اب میں بھی یہاں نہیں رہوں گا۔“

”سب بکو اس ہے۔ دانیال نے کہا اور آپ نے مان لیا؟ ہونہ۔! کہیں نہیں جائے گا دانیال۔“

حنانے سر جھٹک کر کہا تو سیمانہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”آئے تو خود ہی پوچھ لیتا۔“

”کہاں گیا ہے؟“

”چنانچہ! نکلا تو آفس ٹائم پر تھا، اب چنانچہ آفس گیا ہے یا کہیں اور؟“

سیمانہ کہہ کر کچن میں چلی گئی اور حنانہ اپنے دامخ کو فضول سوچوں میں نہیں الجھانا چاہتی تھی، اس لئے بچوں

کے کمرے میں آ کر سو گئی تھی۔

پھر ابھی دوپہر نہیں ڈھل چکی تھی جب سیمانے آ کر اسے اٹھانے کے ساتھ دانیال کے آنے کا بتایا تو وہ جلدی

سے منہ ہاتھ دھو کر بیڑھیاں پھیلا نکتے ہوئے دانیال کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی تھی۔

”دانیال! یہ میں کیساں رہی ہوں؟“

”کیساں لیا؟“

وہ بریف کیس سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

”یہی کہ تم باہر جا رہے ہو؟“

اس نے قصداً تشویش ظاہر کی تھی۔

”کو شش کر رہا ہوں، ڈعا کرو۔“

وہ اطمینان سے بولا تھا۔

”جیری ڈعاؤں میں اثر ہوتا تو میں یوں تمہارے پیچھے بھاگ رہی ہوتی؟“

اس کی افسردگی پر دانیال نے ہونٹ ہینچے تھے۔

”تمہیں میرا یقین نہیں ہے دانیال! تو پوچھو خدا سے، میں نے کتنا مانگا ہے تمہیں اس سے۔“

”تم جھوٹی ہو۔“

وہ سلک کر گویا ہوا تھا۔

”تم نے مجھے خدا سے نہیں مانگا، بلکہ اپنے حسن اور اداؤں سے چھیننے کی کوشش کی، اور اس حسین جال

میں، میں تقریباً پچھس چکا تھا، لیکن ٹائیڈ کی محبت نے مجھے کھینچ لیا۔“

”ٹائیڈ تم سے محبت نہیں کرتی دانیال!۔“

وہ ناگواری سے زور دے کر کہنے لگی۔

”اگر اسے تم سے محبت ہوتی تو کبھی تمہیں چھوڑ کر نہ جاتی۔ تم یہ بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟“

”اب تو سمجھ میں آ رہا ہے کہ ٹائیڈ کیوں چلی گئی؟“

وہ چپکا کر بولا تھا۔

”کیونکہ۔“

”بس۔۔۔!“

دانیال نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

”اچھا ہوگا کہ تم اپنے مقام پر رہو۔ مجھے اور ثانیہ کو ڈسکس مت کرو۔“

”تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے دانیال۔۔۔! جو تم ایسے بی ہو کر رہے ہو۔“

وہ روہانی ہو گئی تھی۔

”تم جاؤ پلیر۔۔۔! اور آئندہ بنا دستک دیے میرے کمرے میں مت آنا۔“

دانیال نے کہہ کر رُخ موڑ لیا تو وہ چند لمحے غیر یقینی سے اس کی پشت کو دیکھتی رہی، پھر سیما کے پاس آتے

ہی اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے بولی تھی۔

”آپا۔۔۔! وہ تو بچ جا رہا ہے۔ اس کے دل میں پھر سے ثانیہ کی محبت جاگ گئی ہے۔ وہ جا رہا ہے

ثانیہ کے پاس۔“

”تو تم رو کیوں رہی ہو۔۔۔؟ تمہیں تو خود بہت بھروسہ تھا، دانیال کہیں نہیں جائے گا۔ اس وقت یہی کہا

تھا ناں تم نے۔۔۔؟“

سیما نے تپ کر اسے لتاڑا۔

”آپا۔۔۔! اب طنز کر کے مزید نہ میرا دل جلائیں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔۔۔؟ کیسے رو کوں

اسے۔۔۔؟“

وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

”میں کیا بتاؤں۔۔۔؟ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ اچانک پانا کیسے پلٹ گیا۔۔۔؟“

”کیسے پلٹا۔۔۔؟ کیوں پلٹا۔۔۔؟ ان باتوں کو چھوڑیں آپا۔۔۔! آپ بس دانیال کو روکیں۔ وہ اگر چلا

گیا تو میرا کیا ہوگا۔۔۔؟ اب خدا کے لئے یہ مت کہہ دیجئے گا کہ آپ میرے لئے دانیال سے اچھا لڑکا ڈھونڈیں گی۔

میں شادی کروں گی تو صرف دانیال سے، ورنہ کسی سے نہیں۔“

وہ کہہ کر پھر رونے لگی تو سیما زچ ہو گئی۔

”اچھا۔۔۔! تم دو موت۔ کون سا دانیال ہمیشہ کے لئے جا رہا ہے۔۔۔؟ ایک آدھ سال میں آ جائے گا

واپس دیکھ کر کھا کر۔“

”بس۔۔۔! اب آپ مجھے جھوٹی آس مت دلائیں۔“

وہ کسی طرح نہیں بھل رہی تھی۔

”تمہیں تو خیر میں نے پہلے بھی کہا تھا، دانیال کا خیال چھوڑ دو۔ سرخاب کے پر نہیں لگے اس میں۔ لیکن

تمہیں ہی ضد ہو گئی تھی۔ خیر۔۔۔! اچھا ہے جو وہ جا رہا ہے، ورنہ اسے یہاں سے نکالنے کے لئے مجھے پھر سے مغز ماری کرنی پڑتی۔“

سیما نے کہا تو وہ اچھل کر بولی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔؟“

”تو اور کیا اسے میں صرف تمہاری وجہ سے برداشت کر رہی تھی۔۔۔؟ جب وہ تمہارا نہیں ہوا تو۔۔۔“

”ثانیہ کا بھی نہیں ہونا چاہئے۔“

وہ فوراً بولی تھی۔

”ثانیہ کا تو خیر کبھی نہیں ہونے دوں گی اسے۔“

سیما کے زور پر حنا کو اطمینان ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

”لہجے ابا۔۔۔! یہ آپ کی اچھی ڈیوٹی ہے۔“

ثانیہ نے شوبی کا اسکول بیگ خواجہ صاحب کو تھماتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر بولے۔

”ہاں بیٹا۔۔۔! اس ڈیوٹی نے مجھے پھر سے جوان کر دیا ہے۔ چلو بیٹا شوبی۔۔۔! خالہ کو اللہ حافظ کہو۔

”اللہ حافظ خالہ۔۔۔!“

شوبی نے اسے ہاتھ ہلا کر کہا۔

”اللہ حافظ بیٹا۔۔۔!“

اس نے جھک کر شوبی کا سر چوما، پھر اسے خواجہ صاحب کی انگلی پکڑے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اچانک

مشعال کا خیال آیا تو تیزی سے کمرے میں آ گئی۔ مشعال بچکے کود کچھ کر خوش ہو رہی تھی۔

”مگر یارانی۔۔۔!“

وہ مشعال کے پاس بیٹھ گئی، پھر اس کا ننھا سا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

”تمہارے پاپا کو پتا ہی نہیں ہے کہ تم اس دنیا میں آ چکی ہو۔ شاید وہ سوچتے بھی نہیں ہوں گے۔“

مشعال کی شکل رونے والی ہو جانے لگی تو اس نے ایک دم اسے اٹھا لیتی۔

”ارے رے۔۔۔! میں ہوں ناں۔ پاپا کو پرواہ نہیں ہے تو کیا ہوا۔۔۔؟ ماما کی جان ہو تم۔! چلو

تمہیں دکھاؤں تمہارے بابا کیسے ہیں۔۔۔؟“

وہ مشعال کو لئے ہوئے اٹھی اور الماری میں سے اپنی اور دانیال کی تصویر نکال کر اسے دکھاتے ہوئے

بولی۔

”دیکھو، یہ تمہارے پاپا ہیں۔ ظالم، سنگ دل اور پتا نہیں کیا کیا۔“
مشعال ایک دم رونے لگی تو اسے ہنسی آگئی۔

”اچھا، نہیں نہیں! تمہارے پاپا بہت اچھے ہیں، اچھے ہیں جب ہی تو دوسروں کو اپنی طرح سمجھ کر لٹ گئے۔“

اس کی اپنی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ مشعال کو سینے سے لگا کر اسے چپ کرانے لگی۔ تب ہی خولجہ صاحب آکر پوچھنے لگے۔

”کیا ہو گیا ہے اسے؟ کیوں اتنا رورہی ہے؟“

”پتا نہیں ابا!“

وہ نظریں چرا لگی۔

”بھوک تو نہیں ہے؟“

”نہیں! ابھی دس منٹ پہلے فیڈر پلائی تھی۔ لیجئے، آپ پکڑیں اسے، میں آپ کے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔“

وہ مشعال کو خولجہ صاحب کی ہانپوں میں ڈال کر جلدی سے کچن میں آگئی اور چائے بناتے ہوئے خود کو سرزنش کرنے لگی۔

”یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ اتنی سی بچی سے کیسی باتیں کر رہی تھی؟ پاگل ہو گئی ہوں میں۔“

اس نے سر جھٹکا، پھر ناشتے کی ٹرے لے کر خولجہ صاحب کے پاس آگئی۔

”تم ناشتہ نہیں کرو گی؟“

خولجہ صاحب نے ایک آدی کا ناشتہ دیکھ کر پوچھا۔

”ابھی دل نہیں چاہ رہا ہے، پھر کر لوں گی۔“

اس نے مشعال کو ان کی گود سے لیتے ہوئے کہا۔ پھر جانے لگی کہ خولجہ صاحب نے پکار لیا۔

”ٹائیہ! میرے پاس بیٹھو۔“

”جی۔“

وہ بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ خولجہ صاحب نے پراسٹے کا نوالہ منہ میں ڈالا، پھر چائے کا سپ لے کر اسے دیکھنے لگے۔

”کیا ہوا ابا؟“

وہ ان کے دیکھنے سے کچھ اُلجھ گئی تھی۔

”تم بتاؤ بیٹا! کیا بات تمہیں پریشان کر رہی ہے؟“

خولجہ صاحب نے پوچھا اور اس کے نفی میں سر ہلانے پر کہنے لگے۔

”میں تمہارا باپ ہوں ٹائیہ! تمہارا دکھ کچھ پہچانتا ہوں۔ اندر کچھ دنوں سے تمہیں بے کُل اور اداس

دیکھ رہا ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے؟“

خولجہ صاحب کے نرم شفیق لہجے نے پھر اس کی آنکھیں گیلی کر دیں۔

”کوئی بات نہیں ہے ابا! بس ایسے ہی کبھی کبھی دل گھبرانے لگتا ہے۔“

”کہیں آتا جانا بھی تو نہیں ہے تمہارا۔ خود کو اتنا پابند مت کرو بیٹا! کہ دم گھٹنے لگے۔ آس پڑوس میں

اچھے لوگ ہیں، ان سے ملا جلا کرو۔“

خولجہ صاحب نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”جی! ایسے فوزیہ سے اچھی دوستی ہو گئی ہے میری۔“

”ہاں! دن میں اس کے پاس چلی جایا کرو۔ وہ بھی تو آتی ہے۔“

”جی! اصل میں ابا! بچوں اور پھر گھر کے کاموں میں میرا کہیں جانا نہیں ہو پاتا۔“

اس کی معذوری سمجھتے ہوئے خولجہ صاحب نے اثبات میں سر ہلایا، پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ

کھڑے ہوئے۔

”اچھا بیٹا! میں چلتا ہوں، گیٹ بند کرلو۔“

”جی! اللہ حافظ ابا!“

وہ گیٹ بند کر کے واپس آئی تو مشعال کو جھولے میں ڈال کر دھیرے دھیرے جھولا جھلاتے ہوئے اسے

اپنی بچی پر ترس آنے لگا، جس کے نصیب میں جانے باپ کی شفقتیں تھیں بھی کہ نہیں۔

”کتنے ظالم ہوتے ہیں مرد۔“

وہ سوچنے لگی۔

”شولی کے باپ نے بھی تو پلٹ کر اسے نہیں پوچھا۔ حالانکہ وہ اسے دیکھ چکا ہے، اور میری مشعال کے

باپ نے تو اسے دیکھا ہی نہیں، پھر اسے کیا احساس ہو گا بھلا!؟“

”نہیں! مجھے اسے احساس دلانا چاہئے۔“

اس کی ذہنی رو بھٹک گئی اور پھر اس نے کچھ نہیں سوچا۔ مشعال کے سوتے ہی اس نے پہلے دانیاں کے

آفس کے نمبر پر فون کیا تو وہاں سے معلوم ہوا کہ دانیاں ایک مہینہ پہلے وہاں ریزائن دے کر جا چکے ہیں۔ وہ مایوس

ہونے کے ساتھ کوفت میں مبتلا ہو گئی۔ کوفت میں یوں کہ اب اسے گھر کا نمبر ڈائل کرنا تھا۔ اس نے خود کو باز رکھنے کی

کوشش نہیں کی اور فوراً گھر کا نمبر ملا ڈالا تو ادھر سے سیما کی آواز آئی تھی۔

”ہیلو!“

وہ بری طرح جھنجھائی، پھر بھی ضبط سے بولی تھی۔

”میں ثانیہ بات کر رہی ہوں۔“

”ثانیہ؟“

سیما کے لہجے میں حد درجہ ناگواری سمٹ آئی تھی۔

”جی.....! مجھے دانیال سے بات کرنی ہے۔“

اس نے کہا تو سیما سخر انداز میں بولی تھی۔

”دانیال اب یہاں کہاں.....؟ وہ تو شادی کرتے ہی حنا کو لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔“

”جی.....؟“

وہ یک لخت زلزلوں کی زد میں آ گئی تھی۔

”بھئی.....! اب وہ تمہاری خاطر جوگ تو نہیں لے سکتا تھا۔ ایسی حور پری تو نہیں تھی تم جو.....“

اس نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر سیما کی آواز بند کی تھی، لیکن پھر بھی اس کی ساعتیں سچ رہی تھیں۔

”وہ تو شادی کرتے ہی حنا کو لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔“

”نہیں نہیں.....! دانیال ایسا نہیں کر سکتے۔“

وہ اس شدت سے روئی کہ اگر کوئی سامنے ہوتا تو اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا، لیکن کوئی نہیں تھا۔ یہ درد اسے تنہا

جھیلنا تھا، شاید ساری عمر۔

☆.....☆.....☆

وقت کسی درد پر غم نہایت نہیں ہے۔ اس کا کام گزرتا ہے، گزرتا چلا جاتا ہے۔ دن، مہینے، سال، کتنے سال

بیت گئے۔ خواجہ صاحب بالکل ریاض ہو کر گھر بیٹھ گئے تھے۔ ثانیہ نے اسکول اور جنگ میں پڑھا کر شوہنی اور مشعال

کو پڑھایا تھا، اور اب تو اس کی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ اکثر بیار رہنے لگی تھی، جس سے اسکول کی جاب چلی

گئی۔ شوہنی ماسٹر کا ہاتھ اور مشعال نے اسی سال گر بجویشن کیا تھا اور اس وقت وہ ایک جگہ انٹرویو دے کر آئی تھی کہ

ثانیہ کو بیٹھ سے نیچے گرتے دیکھ کر اس نے بھاگ کر اسے تھاما تھا۔

”کیا ہوا امی.....؟“

”کچھ نہیں بیٹا.....!“

ثانیہ مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”پیاں لگی تھی، پانی لینے اٹھنے لگی تو.....“

”کیا ضرورت تھی آپ کو اٹھنے کی.....؟ پانی چاہئے تھا تو شوہنی کو پکار لیتیں۔ نکما بیٹھا تو ہے گھر۔“

ناراضی سے بولتے ہوئے مشعال نے اسے سیدھا بٹھایا، پھر کہنے لگی۔

”نانا ابا آ جائیں، میں ان سے کہوں گی، آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔“

”نہیں بیٹا.....! ابا سے کچھ مت کہنا۔ وہ بیچارے کہاں سے کریں گے.....؟“

ثانیہ نے فوراً ٹوکے ہوئے کہا۔

”چلیں، بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ میری جاب ہو جائے، پھر میں خود آپ کو اسپیشلسٹ کو

دکھاؤں گی۔“

اس نے خواجہ صاحب کا احساس کرتے ہوئے کہا تو ثانیہ پوچھنے لگی۔

”ابھی جہاں انٹرویو کے لئے گئی تھی، تو کیا ہوا.....؟“

”مجھ سے پوچھیں خالہ.....! کیا ہوا ہوگا.....؟“

شوہنی، ثانیہ کی بات سنتے ہوئے آیا تھا، اس سے پہلے بول پڑا۔

”اس کی سی دی دیکھ کر سر پیٹ لیا ہوگا انہوں نے۔ کیوں مشعال.....! ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں

میں.....؟“

”جی نہیں.....!“

وہ سلگ کر تھکے لہجے میں بولی تھی۔

”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مجھے جاب مل گئی ہے۔“

”کیا.....؟“

شوہنی ناممکن انداز میں نفی میں سر ہلانے لگا۔

”سچ کہہ رہی ہو مشعال.....؟“

ثانیہ نے پوچھا تو وہ کوشش سے خوشی کا اظہار کرنے لگی۔

”جی امی.....! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میری جاب ہو گئی ہے، اور مجھے کل سے ہی جوائن کرنی ہے۔“

”اچھا.....!“

ثانیہ کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

”آپ کو خوشی نہیں ہوئی امی.....؟“

اس نے پوچھا تو شوہنی پھر بول پڑا۔

”بس.....! اب یہ امونیشن ہو جائیں گی۔ بیٹا تمہارے ابا یہاں ہوتے تو تمہیں اتنی مشقت نہ کرنی

پڑتی، ہونہہ.....!“

”تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

اس کے چیخنے پر شوبی اسے چڑاتا ہوا بھاگ گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے جانے لگی، لیکن ثانیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یہ ایسا کیوں ہے امی؟“

وہ روہانسی ہو گئی۔

”تھک کرتا ہے بیٹا..... تمہیں، تمہاس کی باتوں کا پرانہ مانا کرو۔“

ثانیہ نے اسے پکڑا کرتے ہوئے کہا تو وہ روشے انداز میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو.....؟“

ثانیہ نے فوراً پوچھا۔

”کچن، آپ کے لئے سوپ بنا کر لاتی ہوں۔“

اس نے ثانیہ کی خاطر فوراً اپنا موڑ ٹھیک کیا، لیکن پھر کچن میں آتے ہی وہ اپنے آپ میں اُلجھنے لگی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے.....؟ شوبی کے چڑانے پر اس نے کہا تو دیا تھا کہ اس کی جاب ہو گئی ہے اور کل

سے جوائن بھی کرنی ہے، لیکن وہاں وہاں ہی بھر کر نہیں آئی تھی۔ کیونکہ جس پوسٹ کے لئے وہ گئی تھی، اس کے لئے ایک

تو اس کی تعلیم کم تھی، دوسرے کوئی تجربہ بھی نہیں تھا، اور اس نے اسے دوسری جاب آفر کر دی تھی اور اس کے لئے وہ

تیار نہیں تھی۔ سوچنے پر بھی اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی آفر قبول کرے۔

ثانیہ کے لئے سوپ چڑھاتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل اُلجھ رہا تھا کہ شوبی کے موبائل فون پر تیز نوٹ

سے وہ مزید جھنجھلا گئی۔ نوٹ مسلسل بج رہی تھی اور شوبی پتا نہیں کہاں تھا.....؟ وہ چوہا بھاگتا دھیمہ کر کے شوبی کے کمرے میں

آئی اور اسے کتاب پر نظریں جمائے دیکھ کر سلگ گئی۔ وہ یوں بیٹھا تھا جیسے بہرہ ہو۔

”شوبی.....! کس کا فون ہے.....؟ ریسو کیوں نہیں کرتے.....؟“

وہ جتنی تیز ہو کر بولی، وہ اسی قدر اطمینان سے بولا تھا۔

”کیونکہ مجھے بات نہیں کرنی۔“

”تو قیل آف کر دو۔ خواہ مخواہ شور مچا رہا ہے۔“

وہ کہتے ہوئے آگے آئی اور جھپٹ کر موبائل اٹھایا اور آف کرنا چاہتی تھی کہ رابعہ کا نمبر دیکھ کر بے سامانہ

بولی تھی۔

”ارے.....! یہ تو رابعہ خالہ ہیں۔“

”السلام علیکم رابعہ خالہ.....! کیسی ہیں آپ.....؟“

اس نے فوراً کال لی تھی۔

”جی خالہ.....! سب ٹھیک ہیں۔ امی، نانا بابا، اور شوبی بس ابھی کسی کام سے نکلا ہے۔“

اس نے شوبی کو گھورتے ہوئے بتایا تھا۔

”ارے نہیں رابعہ خالہ.....! بس اتفاق ہی ہے کہ جب آپ کا فون آتا ہے، شوبی موجود نہیں ہوگا۔ وہ

بھلا کیوں آپ سے بات نہیں کرنا چاہے گا.....؟ اتنا تو آپ کو یاد کرتا ہے۔

جی خالہ.....! میں کہہ دوں گی شوبی سے۔ وہ ضرور آپ کو فون کر لے گا۔

”اوکے.....! اللہ حافظ.....!“

وہ سیل آف کر کے شوبی کو گھورنے لگی۔

”ہو گئی بات.....؟ اب جاؤ یہاں سے۔“

”تمہیں تو میں کسی دن شوٹ کر دوں گی۔“

وہ سیل اس کے آگے پھینک کر واپس کچن میں آ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ رات دس بجے ہی لائٹ آف کر کے ثانیہ کے پاس آ کر لیٹی تو ثانیہ تعجب سے پوچھنے لگی۔

”تم اتنی جلدی سو رہی ہو.....؟“

”جلدی سوؤں گی امی.....! تو صبح جلدی اٹھوں گی۔ آفس جانا ہے ناں.....!“

اس نے کہا تو ثانیہ خاموش ہو رہی۔

”ارے ہاں امی.....!“

وہ اچانک یاد آنے پر کہنے لگی۔

”میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ رابعہ خالہ کا فون آیا تھا۔ آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔“

”علیکم السلام.....! شوبی سے بات ہوئی رابعہ کی.....؟“

ثانیہ نے فوراً پوچھا تو وہ سلگ کر بولی۔

”نہیں.....! میرا دل چاہ رہا تھا موبائل شوبی کے سر پر دے ماروں۔ بیچاری رابعہ خالہ کتنا تڑپتی ہیں،

کسی طرح اس کی آواز سن لیں۔ سچ امی.....! اگر میرے پایا کا فون آجائے تو میں خوشی سے چھلانگیں مارتی

بھروں۔“

”تم اپنے پایا کو مس کرتی ہو.....؟“

ثانیہ کی آواز نہیں دُور سے آئی تھی۔ وہ قدرے خائف ہوئی، پھر ثانیہ کا ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر بولی۔

”زیادہ نہیں امی.....! بس کبھی کبھی۔“

ثانیہ نے اس کی پیشانی چومی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر صبح آفس جاتے ہوئے وہ خاصی شش و پنج میں تھی۔ تمام راستہ دل یہی کہتا رہا کہ اسے واپس لوٹ چاہئے۔ لیکن جاب اس کی مجبوری تھی، جب ہی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ آفس پہنچ گئی اور سیدھی باس علی احمد کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تو انہوں نے قدرے غیر یقینی سے اسے دیکھا، پھر مسکرا کر بولے۔

”وعلیکم السلام.....! چلو میں تمہیں تمہارا روم دکھا دوں۔“

وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ پھر ایک روم میں داخل ہو کر وہ بولے تھے۔

”یہ میرے بننے شامان کا روم ہے اور اب تمہارا بھی۔“

وہ اندر سے بہت گھبراہٹ میں تھی اور گھبراہٹ اس کے چہرے سے بھی ظاہر تھی۔

”وہ تمہاری سیٹ ہے۔“

علی احمد کو نے میں رکھی ٹیبل کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

”شامان کو تمہارا یہاں بیٹھنا ناگوار تو گزرے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں یہاں سے نکل جائے!

کہے، لیکن تمہیں اس کی بات نہیں مانتی۔“

”جی.....!“

اور وہ گھبرا گئی۔

”ہوں.....!“

انہوں نے انہاں میں سر ہلایا، پھر کہنے لگے۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھو۔ میں نے ساری بات تمہیں سمجھا دی ہے، اور ہاں.....! تم اس کمپیوٹر پر ہاتھ صاف کر سکتی ہو۔“

”لیکن سر.....! مجھے تو کمپیوٹر، آئی مین اگر یہ مجھ سے خراب ہو گیا تو.....؟“

وہ گھبراہٹ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی، کیا کہے؟

”نو پرا بلیم.....! اور آجائے گا۔ اوکے! وٹس یو بیٹ.....!“

وہ مسکرا کر اسے حوصلہ دے کر چلے گئے۔ تب اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی اس نے پہلے کمرے کا جائزہ لیا،

کمپیوٹر آن کیا تھا کہ شامان علی خاصے لا پر واہ انداز میں سیدھا اپنی ٹیبل کی طرف بڑھا تھا، لیکن جب بیٹھے گا تب ال

پر نظر پڑتے ہی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

”آپ.....! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں.....؟“

انتہائی ناگوار سی سے کہا گیا۔

”کام.....!“

وہ جی کڑا کر کے بولی۔

”آئی مین، میں کل ہی اپائنٹ ہوئی ہوں۔ آج میرا پہلا دن ہے۔“

”میں نے یہ نہیں پوچھا، آپ کا پہلا دن ہے یا آخری۔ میرے روم میں آپ کو کس نے بٹھایا

“؟“

اس کے غصے سے وہ خائف ہو گئی۔

”وہ..... باس..... باس نے۔ آپ بے شک ان سے پوچھ لیں۔“

اس کی بات سنتے ہی وہ دانت پیستے ہوئے تیزی سے چلا گیا تو دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”مائی گاڈ.....! یہ تو شونی سے بھی برا ہے۔“

وہ غصے میں جھنجھلایا ہو اباس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا تھا۔

”ڈیڈ.....! میرے روم میں وہ لڑکی کیا کر رہی ہے.....؟“

”لڑکی.....؟ اوہ مشعل.....! اسے میں نے اپائنٹ کیا ہے۔“

علی احمد نے اطمینان سے بتایا تو وہ مزید جھنجھلا گیا۔

”اوہ ڈیڈ.....! میں یہ نہیں پوچھ رہا۔“

”ریلیکس.....! ریلیکس شامی.....! بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ اس کا روم تیار ہو جائے، پھر وہ وہاں

الٹ ہو جائے گی۔“

علی احمد نے نرمی سے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”نو آپ اسے کچھ دن بعد بلا لیں، جب اس کا روم تیار ہو جائے گا۔“

اس کے ضدی انداز پر علی احمد ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

”بیٹا.....! تمہیں کیا پرا بلیم ہے.....! وہ اپنا کام کرے گی۔“

”ٹھیک ہے.....! پھر میں کچھ دن بعد آؤں گا۔“

وہ کہہ کر جانے لگا کہ علی احمد جتنی سے پکار کر بولے۔

”شامان.....! یہ گھر نہیں ہے جہاں ہر بات میں تمہاری پسند نا پسند کا خیال رکھا جائے۔ مشعل وہیں

ہماری اور تم کام میں اس کی ہیلپ بھی کرو گے۔ انڈرا شیئنڈ.....!“

وہ خائف نہیں ہوا، ناراضی سے ان کے روم سے نکلا تو پھر آفس سے ہی نکل آیا تھا۔ گاڑی اشارت

کرنے سے پہلے اس نے سارہ کو فون کیا اور اس کی فیورٹ جگہ پہنچنے کا کہہ کر خود بھی دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا تھا۔

”کیا بات ہے.....؟ آج تم آفس نہیں گئے.....؟“

سارہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

”سہی تھا، لیکن دل نہیں لگا۔“

”دل نہ لگنے کی وجہ؟“

سارہ نے اتر کر اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

”تم..... تم جو جواسوں پر چھائی رہتی ہو۔“

”پھر تم اپنے می ڈیٹی سے بات کیوں نہیں کرتے؟“

سارہ نے فوراً کہا تو وہ سانس کھینچ کر بولا۔

”کر چکا ہوں بابا.....! کر چکا ہوں۔ میں انہیں تمہارے بارے میں بتا چکا ہوں۔“

”پھر کب آ رہے ہیں وہ تمہارا پر پوزل لے کر؟“

”آ جائیں گے، جلدی کیا ہے؟“

وہ کہہ کر خود ہی جھجھلا گیا تھا۔

”یار.....! کوئی اور بات کرو نا.....! میرا پہلے ہی موڈ ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوتا تمہارے موڈ کو؟“

”کچھ نہیں.....! چلو کہیں اور چلتے ہیں۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا تو سارہ نے نا سمجھنے کے انداز میں کندھے اچکائے تھے۔

☆☆☆☆☆

شوہنی گیٹ سے باہر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ ایسا لگتا تھا جیسے ساری دنیا سے خفا ہو۔ گرمی میں

ڈھوپ کا بھی احساس نہیں تھا۔ تب ہی اوپر بالکونی سے فوزیہ کی بیٹی روہی اسے پکار کر پوچھنے لگی۔

”سنو.....! ایک کام کرو گے؟“

”کیوں؟ تو کہہ دوں کیا تمہارا؟“

وہ کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔

”تو کر کی کیا بات ہے؟ کسی کا کام کرنے سے اعمال میں نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔“

روہی اسے چھیر کر محظوظ ہوتی تھی۔ شوہنی سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے کا تو وہ پھر اسے متوجہ کر کے

بولی۔

”سنو.....! کچھ نیکیاں کمالو، ورنہ یہاں کی طرح وہاں بھی اسی طرح مایوس کھڑے ہو گے۔“

”تم؟“

شوہنی نے نیچے سے پتھر اٹھا کر اسے کھینچ مارا، لیکن وہ اسے اٹھوٹھا دکھاتے ہوئے بھاگ گئی۔

”اسنو پڈ.....!“

وہ دانست پڑتا اندر آ کر لاؤنج میں بیٹھا تو دوسرے کمرے سے ثانیہ اور خواجہ صاحب کی باتوں کی آواز

اٹنے لگی۔ ثانیہ کہہ رہی تھی۔

”کہنے والے تو یہی کہیں گے ناں ابا.....! کہ شوہنی کی تربیت میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہے۔ رابعہ بھی

میں الزام دے گی۔“

”کیوں؟ رابعہ کیوں ہمیں الزام دے گی؟ اس پتا نہیں ہے شوہنی کے باپ اور چچا کیسے

.....؟“

خواجہ صاحب نے کہا تو شوہنی کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”خون رنگ دکھاتا ہے تو ساری تربیت دھری رہ جاتی ہے۔ بے حسی اور ہٹ دھرمی شوہنی کو ورثے میں

ملے۔ میرا تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم نہ زیادہ سوچا کرو۔“

”کیسے نہ سوچوں ابا.....؟ شوہنی کو میں نے صرف جنم نہیں دیا، پالا تو اپنی اولاد کی طرح ہے۔ اس کی

الوگی خراب ہوگی تو سب سے زیادہ تکلیف مجھے ہوگی۔“

ثنائیہ کی آواز میں دکھ تھا۔

”میں جانتا ہوں بیٹا.....! لیکن میں کیا کروں؟ میری تو وہ بات ہی ہیں سنتا۔ اُٹنا اور غصے میں آ جاتا

.....؟“

خواجہ صاحب کے لہجے میں بے بسی شوہنی کو محسوس ہوئی تھی۔

”ہاں.....! آپ کچھ کچھ نہ کہا کریں اس سے۔“

ثنائیہ فوراً بولی تھی۔

”کیا وقت آ گیا ہے؟ بچوں سے بھی ڈر کر بات کرنی پڑتی ہے۔ ہاہ.....!“

خواجہ صاحب نے آہ بھری، پھر کہنے لگے۔

”مجھے الزام دیتا ہے شوہنی کہ اس کی ماں کو میں نے اس سے دور کیا ہے۔ ہاں.....! کیا ہے، بھٹائے رکھتا

.....؟“

”بس کریں ابا.....! آپ نہ شوہنی کی باتوں کو دل پر لیا کریں۔“

ثنائیہ کے لہجے میں اس کے لئے کتنی شفقت تھی، وہ بے اختیار اٹھا تھا لیکن اندر جانے کی بجائے باہر نکل

.....

☆☆☆☆☆

مشعل کو آفس جوائن کئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ پہلے دن کے بعد پھر شامان نے اسے کچھ نہیں کہا تھا،

بلکہ وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ جبکہ وہ اسے نہ صرف دیکھتی بلکہ نوٹس بھی کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کام کرتا، پھر فون پر جانے کس سے لمبی بات، اس کے بعد جگت میں اٹھ کر چلا جاتا۔ اس وقت وہ فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔

”بس یار.....! دس منٹ میں نکلتا ہوں یہاں سے۔“

وہ اسے دیکھتے ہوئے پورے دھیان سے اس کی باتیں سننے لگی تھی۔

”کم آن سارو.....! کہتا تو ہے، سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔“

نہیں.....! کچھ خاص نہیں، بس تم تیار رہنا۔

ہاں.....! جہاں تم کیوگی۔

اوکے.....!“

شاہنماں نے سل فون کان سے ہٹایا، تب اس پر نظر پڑی اور اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر بگڑ گیا تھا۔

”تم کیا سن رہی ہو.....؟ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“

”اُف.....!“

وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔ جلدی سے اپنا بیگ لے کر اس سے پہلے ہی آفس سے نکل آئی تھی۔ گھر

آتے ہی اس کا دل چاہا کسی کونے میں چھپ کر خوب روئے۔ لیکن یہ خیال کہ کسی کے پوچھنے پر کیا جواب دے گی،

اسے رونے بھی نہیں دے رہا تھا۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آئی تو وہاں ثانیہ کو کھڑے دیکھ کر بگڑ گئی۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں امی.....؟ کیا پھر بیمار پڑھنے کا ارادہ ہے.....؟ چھوڑیں یہ سب، میں کر لوں

گی۔“

”بیٹا.....! تم خود چکی ہوئی آئی ہو۔“

”کوئی نہیں چکی ہوئی، آپ چلیں، اندر چلیں۔“

اس نے کہتے ہوئے چولہا بند کر دیا۔

”بیٹا.....! بیٹھ کر کھانے لے لو۔ بس دو چار روٹی ڈال لوں پھر.....“

”بالکل نہیں.....! انا اب آجائیں پھر میں روٹی ڈال دوں گی۔“

وہ زبردستی ثانیہ کو کھینچتے ہوئے اندر لے آئی۔

”سنو.....!“

ثانیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگی۔

”تم آفس میں پریشان تو نہیں ہوتی.....؟“

”نہیں تو، مگر کیوں.....؟“

وہ کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دیکھنے لگی تھی۔

”تمہارے نانا اب پریشان ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں، چٹائیں تم کام کر پاؤ گی کہ نہیں.....؟“

ثانیہ نے بتایا تو وہ ہنس پڑی۔

”نانا اب تو بس ابھی تک مجھے بچی ہی سمجھتے ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں، میں گریجویشن کر چکی ہوں۔“

”چٹا ہے انہیں۔“

ثانیہ اس کا گل تھک کر مسکرائی تھی۔

”اچھا.....! آپ آرام سے بیٹھیں، میں ذرا اوپر جا رہی ہوں۔ جب سے آفس جوائن کیا ہے، روٹی

سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“

”ہاں.....! وہ بھی شکایت کر رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے.....! میں جا رہی ہوں۔“

وہ جگت میں کہتے ہوئے سڑھیاں پھلانگ آئی تو پہلے فوزیہ سے ملاقات ہو گئی۔

”السلام علیکم آئی.....!“

”وعلیکم السلام.....! بڑے دنوں بعد آئی ہو۔ امی کیسی ہیں.....؟“

فوزیہ نے جواب کے ساتھ سوال کر دیئے۔

”امی اب کافی بہتر ہیں۔“

اس نے روٹی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے جواب دیا تو فوزیہ سمجھ کر بولی۔

”روٹی کمرے میں ہے، وہیں چلی جاؤ۔“

”جی.....!“

وہ سر ہلاتی ہوئی روٹی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس پر بگڑی گئی۔

”بڑی نواب ہو تم.....! اسی انتظار میں رہتی ہو کہ میں تمہارے پاس آؤں، تم نہیں آ سکتیں کیا.....؟“

”نہیں.....! تمہارے گھر میں وہ جو بھالور ہتا ہے نا، اسے میرا نانا پسند نہیں ہے۔“

روٹی نے کہا تو وہ سمجھ کر بولی۔

”شو بی کا تو دماغ خراب ہے۔“

”اچھا چھوڑو.....! یہ بتاؤ، تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے.....؟ مزہ آ رہا ہے.....؟“

روٹی نے پوچھ تو وہ براسا منہ بنا کر بولی۔

”کیا مزہ آ رہا ہے یار.....؟ یہ بھی کوئی جاب ہے.....؟“

”کیا مطلب.....؟“

روٹی کے ٹوکے پر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

”بتاؤ ناں کیا ہوا ہے.....؟“

روبی نے اس کا ہاتھ ہلا کر اصرار کیا تو وہ شش و پنج میں گھر کر بولی۔

”پہلے وعدہ کرو، کسی کو بتاؤ گی نہیں، میرا مطلب ہے، میری جاب کی نوعیت..... بس مجبوری سے کر رہی ہوں، ورنہ.....“

”اوہو.....! میں کس کو بتاؤں گی.....؟ چلو پھر بھی وعدہ کرتی ہوں۔“

روبی کو جانے کی جلدی تھی، فوراً ٹوک کر وعدہ کر لیا تو قدرے رک کر وہ کہنے لگی۔

”اصل میں میرے پاس ڈگری کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی کورس نہ تجربہ، اس لئے پہلے تو مجھے ریجنلک کر دیا گیا، لیکن پھر باس نے مجھے ایک اور جاب آفر کی، اور کہا کہ اس دوران میں آفیشل کام بھی سیکھ سکتی ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، تم اصل بات بتاؤ۔ کیا جاب آفر کی باس نے.....؟“

روبی کے صبر پری پروہ بدلی سے بتانے لگی۔

”باس کا ایک بیٹا ہے اور وہ کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ شاید اس سے شاید بھی کرنا چاہتا ہے، لیکن باس نہیں چاہتے، اور انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ان کے بیٹے کو اس لڑکی کے چنگل سے نکالوں۔“

”ہاہا.....!“

روبی ہنسنے لگی تو وہ دانت پیس کر بولی۔

”ہنس کیوں رہی ہو.....؟“

”تو اور کیا کروں.....؟ مزے کی جاب ہے۔ ویسے باس کا بیٹا ہے کیسا.....؟“

روبی نے محظوظ ہو کر پوچھا تو وہ چڑ کر بولی۔

”شوبی سے بھی بڑا.....“

”خیر.....! شوبی اتنا برا تو نہیں ہے۔“

اس نے اپنی پریشانی میں روبی کی بات محسوس ہی نہیں کی، اور پوچھنے لگی۔

”تم بتاؤ، اس سلسلے میں، میں کیا کر سکتی ہوں.....؟“

”کچھ نہیں.....! آرام سے آفیشل کام سیکھتی رہو۔ تجربہ بھی ہو جائے گا، پھر کہیں اور اپلائی کر دینا۔“

روبی نے بے نیازی سے کندھے اُچکا کر مشورہ دیا تو وہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس نے سارہ کو خوب شاپنگ کرائی تھی۔ پھر چائے و زکے بعد گھر لوٹا تو آگے علی احمد اپنی زویہ کے

ہاتھ جیسے اس کے انتظار میں ہی بیٹھے تھے، دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔

”کہاں چلے گئے تھے.....؟“

”جی..... وہ..... ایک دوست آ رہا تھا لندن سے، اسے ریسو کرنے چلا گیا تھا۔“

وہ اندر سے خائف ہو گیا تھا۔

”کون سا دوست.....؟“

علی احمد کے مشکوک انداز پر وہ جزبہ ہو کر بولا۔

”آپ نہیں جانتے اسے۔“

”اچھا.....! کوئی نیا دوست ہے کیا.....؟“

مزید جرح پر وہ چڑ گیا۔

”ڈیڈ.....! میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں.....؟“

”یہ میں نے کب کہا.....؟ میں تو پوچھ رہا ہوں۔ کوئی نیا دوست ہے جسے میں نہیں جانتا.....؟“

علی احمد شاید اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھے، جب ہی زویہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں کھانا لگواتی ہوں۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

وہ ناراضی سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر پہلے وہ سارہ کے ساتھ جتنا خوش تھا، اب اسی قدر

اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہوتا ہے کہ زویہ کے آنے پر ایک دم اٹھ بیٹھتا ہے۔

”شامی بیٹا.....! تمہیں اپنے ڈیڈی سے جھوٹ نہیں بولنا چاہئے تھا۔“

زویہ نے آنے ہی زری سے نوکا، لیکن وہ تلخ ہو رہا تھا۔

”سچ بول کر مجھے کون سا متغزل جائے گا.....؟ یوں بھی ڈیڈی سب جانتے ہیں، پھر مجھ سے سوال کیوں کرتے ہیں.....؟ کہاں جا رہے ہو.....؟ کہاں سے آ رہے ہو.....؟ ممی.....! میں کوئی چن نہیں ہوں۔“

”بچے نہیں ہو تو پھر سمجھتے کیوں نہیں.....؟“

زویہ زور سے ہنسنے لگی۔

”سب سمجھتا ہوں، آپ لوگ پتا نہیں کیا سمجھنا چاہتے ہیں مجھے.....؟ ڈیڈی نے بچپن میں مجھے اپنی انگلی

قہمانی تو پھر بھول ہی گئے کہ میری اپنی بھی کوئی سوچ ہو سکتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں میں ساری زندگی ان کی انگلی قہام کر

چلا رہوں، تو اب میں ان کے اشاروں پر نہیں چل سکتا۔ مجھے اپنی زندگی جینے دیں۔“

وہ انتہائی شامی ہو کر بول رہا تھا۔

”ضرور جیو، اپنی زندگی جیو، لیکن پہلے صحیح راستے کا تعین تو کرو۔ تم تو بھٹک رہے ہو۔“

زوبیہ نے کہا تو وہ مزید بولتا ہوا۔

”میں بھگ رہا ہوں.....؟“

”ہاں.....! تم نے اپنے لئے جس لڑکی کا انتخاب کیا ہے، اس کا بیک گراؤ نہ جانتے ہو.....؟“

”نہیں.....! اور میں جانتا بھی نہیں چاہتا۔“

اس کی ہٹ دھرمی پر زوبیہ کو غصہ آ گیا۔

”تو پھر تم بھی سن لو۔ تمہارے ڈیڈی اور میرے لئے بھی سب سے اہم بات یہی ہے کہ اس گھر کی بہو

وہی بن سکتی ہے جس کی پچھلی سات پشتوں میں کسی گندے خون کی آمیزش نہ ہو۔“

”مام.....! ایسا کچھ نہیں ہے۔ سارہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”شٹ اپ.....!“

زوبیہ سر جھٹک کر چلی گئی تو اس نے سارے کام غصے میں کئے تھے، یعنی جوتے اتار کر پھینکے، کپڑے

بدلے، پھر منہ سر پلیٹ کر سو گیا تھا، اور اگلے دن وہ کسی موڈ میں آفس آیا تھا کہ مشعال کو اپنی نبیل پر کچھ تلاش کرتے دیکھ کر مزید بگڑ گیا۔

”آپ میری نبیل پر کیا کر رہی ہیں.....؟“

”سر.....! وہ.....! یہ فائلیں..... میں نے سوچا۔“

وہ اس افتاد پر پریشان ہو گئی تھی۔

”دیکھیں مس.....!“

وہ وارننگ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہنے لگا۔

”آپ اپنے دماغ کو زحمت نہ دیں تو اچھا ہے، کم از کم میرے معاملات میں۔ نہیں یہاں سے۔“

”جی.....؟“

وہ خائف ہو کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھی۔ پھر کرن اکیوں سے اسے دیکھا، وہ لیپ ٹاپ میں مصروف ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ملازم جانے کی ٹرے لے کر آیا تو مشعال نے فوراً اٹھ کر اس سے ٹرے لے لی اور اسے جانے کا اشارہ کر

کے ٹرے شانمان کی نبیل پر رکھی۔ پھر کپ سیدھے کر کے پوچھنے لگی۔

”سر.....! شکر کتنی لیں گے.....؟“

”ایک چم.....!“

شانمان نے بلا ارادہ اسے دیکھا تھا۔ مشعال نے کپ میں چائے بنا کر پھر اسے متوجہ کیا۔

”سر.....! چائے۔“

وہ متوجہ نہیں ہوا، تب کہنے لگی۔

”سر.....! آپ کے آنے سے پہلے آپ کے لئے فون آیا تھا۔“

اس نے ابھی بھی نوٹس نہیں لیا تو وہ مزید گویا ہوئی۔

”سر.....! سارہ کا فون تھا، کہہ رہی تھیں، آپ اپنا سیل فون آن رکھا کریں۔“

سارہ کے نام پر جیسے اس نے فوراً دیکھا تھا، پھر فوراً جیب سے اپنا سیل فون نکال کر آن کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”خال.....!“

شو بی کپڑے تہہ کرتی ٹانیہ کو پکار کر پوچھنے لگا۔

”اس دن مانا کیا کہہ رہے تھے.....؟ میرا مطلب ہے، میرے باپ اور چچا کے بارے میں.....؟“

”جب تم سن چکے ہو تو پھر کیوں پوچھ رہے ہو.....؟“

ٹانیہ اندر سے جھٹکی ضرور تھی، لیکن اس پر ناگواری جاتی۔

”ہاں.....! سن لیا تھا میں نے، پھر بھی آپ بتائیں مجھے۔“

شو بی نے بدتمیزی سے کہا۔

”مجھے نہیں پتا، جو پوچھنا ہوا اپنے باپ سے پوچھو۔“

ٹانیہ نے سر جھٹک کر تہہ کئے ہوئے کپڑے الماری میں رکھے، پھر پلیٹ کر شو بی سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ

رو بی کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”والسلام علیکم آنتی.....!“

”والسلام علیکم السلام.....! کیا حال ہے بیٹا.....؟ امی کسی ہیں.....؟“

ٹانیہ نے کوشش سے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”جی ٹھیک ہیں۔ امی نے آپ کے لئے یہ آلو کے پراٹھے بھیجے ہیں۔“

رو بی پلیٹ ٹانیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے مزید گویا ہوئی۔

”یہ صرف آپ کے لئے ہیں آنتی.....! آپ ہی کھائیے گا، کسی اور کو مت کھلایے گا۔“

”کوئی اور کھاتا بھی نہیں ہے سڑے ہوئے پراٹھے۔“

وہ رو بی کا اشارہ سمجھ کر سلگ کر بولا تھا۔

”شو بی.....!“

ٹانیہ نے اسے ٹوکا تو رو بی فوراً بولی تھی۔

”ارے نہیں آنتی.....! میں نے برا نہیں مانا۔“

”اچھا تم بیٹھو، میں پائیں لے کر آتی ہوں۔“

ثانیہ کہتے ہوئے چلی گئی تو روہی اس کی طرف گھوم کر بولی۔

”یہ تم ہر وقت انگارے کیوں چباتے ہو.....؟ آرام سے، پیار سے بات نہیں کر سکتے.....؟“

وہ ہونٹ بھیج کر اسے گھورنے لگا، یوں جیسے کچا چبا جائے گا، اور وہ ذرا خائف نہیں ہوئی۔

”جتنا مرضی گھور لو، میری صحت پر اثر پڑنے والا نہیں ہے۔ اُلٹا تمہاری اپنی آنکھیں بھیگی ہو جائیں گی،

ایسے!“

روہی نے اپنی آنکھیں بھیگی کیں تو وہ تھلا کر اٹھا تھا اور اس سے پہلے کہ اس پر جھپٹتا، وہ بھاگ گئی۔

”بد تیز!“

وہ منہ ہی منہ میں اسے گالیاں دیتے ہوئے باہر نکل آیا۔ اس کے اندر اُلٹا دیکر رہا تھا۔ ثانیہ نے اس کی

بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ یہ کہہ کر اس نے بچا لیا کہ اپنے باپ سے پوچھو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، باپ سے کیا

پوچھے.....؟ اب تک تو وہ اپنی ماں کو قصور وار سمجھتا رہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس لئے وہ اس سے بات

نہی نہیں کرتا تھا۔

بہر حال اس دن خاصی تک و دو کے بعد وہ اپنے باپ کا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر اسی

وقت اسے فون کر ڈالا۔

”شعب بات کر رہا ہوں، بشوٹی۔“

اس نے کال ریسیو ہوتے ہی کہا تو ادھر سے چونک کر پوچھا گیا۔

”بشوٹی.....؟“

”لگتا ہے ماہ و سال کی گردش نے آپ کے ذہن سے میرا نام مٹا دیا ہے.....؟“

اس کے نظر پر ادھر عباد بے چین ہوئے تھے۔

”نہیں نہیں.....! کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا.....؟ تم..... تم کہاں ہو.....؟ مجھے بتاؤ، میں ابھی تمہارے

پاس آتا ہوں۔“

”جی نہیں.....! آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی دن خود حاضر ہو جاؤں گا۔“

وہ روڈ لی بولا تھا۔

”کسی دن کیوں بیٹا.....؟ ابھی آ جاؤ.....!“

بے قراری سے کہا گیا۔

”م بھی.....؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”ہاں ہاں.....! ابھی آ جاؤ، کوئی مسئلہ ہے کیا.....؟“

”مسئلہ تو اب ہوگا۔“

اس نے کہہ کر سیل آف کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شامان مسلسل سارہ کو فون پر منانے میں لگا ہوا تھا۔

”بی بیوی سارہ.....! میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔

اچھا.....! تم ناراض کیوں ہو رہی ہو.....؟ چلو غصہ تھوک دو۔

اوکے بابا.....! اوکے، میں شام میں آ جاؤں گا۔

ابھی نہیں.....! ابھی تو.....“

ادھر سے فون بند ہو گیا تو اس نے زچ ہو کر اپنے سیل فون کو دیکھا۔ پھر بار بار سارہ کا نمبر پیش کیا، لیکن

سارہ نے اس کی کال ریسیو نہیں کی۔ تب وہ بے چین ہو گیا اور علی احمد کی وارننگ کے باوجود سارہ کے پاس جانے کو

تیار ہو گیا۔ دروازے تک پہنچا تھا کہ مشعال نے ایک دم کپکپا لیا۔

”سر.....!“

اس نے رُک کر دیکھا تو مشعال نے جلدی سے گلہ ان میں سے گلاب کا پھول نکال کر اس کی طرف بڑھا

دیا۔

”سر.....! یہ..... آئی مین، آپ اپنی دوست کو گلاب دیں گے تو وہ فوراً مان جائیں گی۔“

”شیوور.....؟“

اس نے مشعال کے ہاتھ سے گلاب لیتے ہوئے کہا۔

”شیوور.....!“

”جھینک یو.....!“

وہ ہلکے سے مسکرایا، پھر جاتے جاتے رُک کر پوچھنے لگا۔

”وہ..... کیا نام ہے آپ کا.....؟“

”مشعال.....!“

”ہاں.....! بس مشعال.....! ڈیڈی اگر میرا پوچھیں تو کہنے گا، میں سائٹ پر گیا ہوں، اوکے.....!“

وہ کہہ کر باہر نکل آیا، اور پندرہ منٹ میں ہی وہ سارہ کے پاس تھا۔

”ہائے.....!“

وہ سارہ کے رونے چہرے پر نظر میں جما کر بولا۔

”کم آن یار.....! آتو گیا ہوں۔“

”بہت احسان کیا ہے مجھ پر۔“

سارہ تنک کر بولی تھی۔

”اوہو.....! اچھا دیکھو۔“

اس نے ایک دم یاد آنے پر کوٹ کی جیب سے گلاب نکال کر سارہ کے سامنے کیا تو وہ تھکے لہجے میں

بولی۔

”یہ کیا ہے.....؟“

”گلاب ہے، گلاب.....! میری محبت کا حسین تحفہ۔“

اس نے ہنستی محبت سے کہا، سارہ اسی قدر تحارت سے بولی تھی۔

”حسین تحفہ.....؟ اب یہ میری اوقات ہے.....؟ راہ چلتے پھول توڑ کے مجھے پیش کرو گے.....؟ محبت کا

حسین تحفہ.....؟ ہاہ.....! انہیں چاہئیں مجھے ایسے حسین تحفے۔“

سارہ نے پل میں گلاب نسل کر اس کے سامنے پھینک دیا تو وہ افسوس اور حیرت میں گھر گیا۔

”محبت کسی تحفے کی محتاج نہیں ہوتی شامی.....!“

سارہ نے فوراً بیٹہ ابدلاتھا۔

”میں جانتی ہوں تم میرے لئے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتے ہو، لیکن مجھے یہ سب نہیں چاہئے۔ میں

صرف تمہارا ساتھ چاہتی ہوں۔“

”میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت، ہر پل میرے ساتھ رہو۔“

اس نے کہا تو سارہ فوراً پوچھنے لگی۔

”پھر یہ ناممکن تو نہیں ہے۔“

”نہیں.....! کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اصل میں میرے ڈیڑی ذرا پرانے خیالات کے ہیں۔ انہیں

باپردہ، سلیقہ مند اور امور خانہ داری میں ماہر ہو چاہئے۔“

اس نے بتایا تو سارہ چیخ پڑی۔

”کیا.....؟ تمہارا مطلب ہے، اب میں برقع اوڑھنا شروع کر دوں.....؟ اور کمر میں دوپٹہ کس کر

سارے گھر میں جھاڑو لگاتی پھروں.....؟“

”نہیں نہیں.....! میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“

وہ ہنستا ہوا گیا تھا۔

”پھر کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”مطلب، مجھے ڈیڑی کے خیالات بدلنے میں کچھ وقت لگے گا۔“

اس نے بات بنائی تھی۔

”کچھ وقت.....؟ قائم رہنا اپنی بات پر۔ زیادہ وقت نہیں ہونا چاہئے، ورنہ میری ماما مجھے کسی اور کے

ہاتھ زخمت کر دیں گی۔“

سارہ نے کچھ وقت پر زور دے کر کہا تو وہ اسے نظروں کی گرفت میں لے کر پوچھنے لگا۔

”تم ہو جاؤ گی کسی اور کے ساتھ زخمت.....؟“

”کبھی نہیں.....!“

سارہ کے کھکھلاہٹ نے پر اس کی زکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔ پھر اس کے ساتھ اگلا وقت طے کر کے وہ

واپس آفس آیا تو علی احساس کے روم سے نکل رہے تھے۔

وہ پریشان ہو کر دوسری سمت بڑھا تھا کہ انہوں نے پکار لیا۔

”شامی.....!“

”جی ڈیڈ.....!“

اس نے اطراف میں نظر ڈالی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اس کے خیال میں ڈانٹ پڑنے والی تھی۔

”شام میں سرفراز والوں کی میٹنگ ہے، ہم پہنچ جانا۔“

علی احمد نے کہا تو وہ فوراً بولا۔

”پہنچ جاؤں گا ڈیڈ.....!“

”بھولنا مت.....!“

علی احمد کہتے ہوئے اپنے روم میں چلے گئے تو وہ شکر کرتے ہوئے اپنے روم میں آتے ہی مشعال سے

ابھنے لگا۔

”آپ نے ڈیڈ سے کیا کہا تھا.....؟“

”کچھ نہیں سر.....! میں نے کہا کہ آپ ابھی باہر گئے ہیں۔“

”تھینک گاڈ.....! اینڈ تھینک یو.....!“

وہ مسکرا کر اپنی ٹیبل کی طرف جاتے جاتے پھر پلٹ آیا اور جیب سے مٹے ہوئے گلاب کی پتیاں نکال کر

مشعال کے سامنے ٹیبل پر ڈالتے ہوئے بولا تھا۔

”سوری مس.....! سارہ ایسی محبت پر یقین نہیں رکھتی جو چٹکیوں میں مسل دی جائے۔“

مشعال کا چہرہ پیکا پڑ گیا تھا اور وہ دھیرے سے کچھ بولی بھی جسے سن کر بھی وہ آن سنی کر کے اپنی ٹیبل کی

طرف بڑھ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

شوہی اپنے باپ کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کی پچھلی بانہوں کو یکسر نظر انداز کئے انتہائی جھپتی ہوئی نظر سے انہیں دیکھ جا رہا تھا۔

”بیٹا.....! میں بہت ترپا ہوں تمہارے لئے، ایک بار میرے سینے سے لگ جاؤ۔“

عباد نے کہا تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولا تھا۔

”پہلے آپ میری بات کا جواب دیں۔ آپ نے میری ماں کو طلاق کیوں دی تھی.....؟“

”وہ..... میں..... میں مجبور تھا بیٹا.....!“

عباد گڑبڑا گئے تھے۔

”آپ مجبور تھے.....؟“

شوہی کے چہیتے طنز نے انہیں لا جواب کر دیا۔

”بتائیں عباد صاحب.....! میں اصل حقیقت جانتا چاہتا ہوں۔“

”اصل حقیقت.....؟ بیٹا.....“

”مت کہیں مجھے بیٹا۔“

شوہی بد لحاظ ہو رہا تھا۔

”میں کسی کا بیٹا نہیں ہوں۔“

”ایسا مت کہو شوہی.....! میں مانتا ہوں، میں تمہارا گتہ نگار ہوں۔ میں نے ظلم کیا تم پر، تمہاری ماں

لیکن اس کے بعد یقین کرو، میں خود کبھی چین سے نہیں رہا۔ اپنا گھر میں نے خود اجاڑا تھا۔ تمہاری ماں کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس نے تمہیں جو بتایا ہوگا، وہی سچ ہے۔“

عباد بہت عاجزی سے بول رہے تھے۔

”میری ماں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

اس کے لہجے میں ماں کے لئے بھی ناراضی تھی، جسے محسوس کر کے عباد پوچھنے لگے۔

”پھر تم مجھ سے بدگمان کیوں ہو.....؟“

”صرف آپ سے نہیں، میں اپنی ماں سے بھی بدگمان ہوں۔ آپ دونوں خود غرض تھے۔ اپنی ال

دنیاؤں میں مگن ہو گئے۔ میرا کسی کو خیال نہیں آیا۔ جب ایسے ہی لاوارثوں کی طرح مجھے چھوڑ دینا تھا تو پھر پیدا کیا

تھا.....؟“

اس کے اندر غبار بھرا تھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا.....؟ تمہاری ماں.....“

عباد جیسے کچھ کر بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔

”جیسے آپ میری ماں کہہ رہے ہیں، وہ اپنے دوسرے شوہر کے بچے پال کر ثواب کما رہی ہے، اور آپ

یقیناً اپنے بچوں میں مگن ہوں گے۔“

شوہی نے نخوت سے سر جھکا تھا۔

”نہیں بیٹا.....! ایسا نہیں ہے۔ قدرت نے مجھے میرے کئے کی سزا دی ہے شاید کہ پھر مجھے اولاد کی نعمت

بخشی ہی نہیں۔“

عباد اعتراف کر کے نام نہاد نظر آنے لگے تھے۔ شوہی کے چہرے پر ایک لحظہ کو طنزیہ مسکراہٹ چمکی تھی۔ پھر

وہ سر جھٹک کر جانے لگا کہ عباد تیزی سے اس کے سامنے آگئے اور زبردستی اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا، تو پہلے اس

نے جیسے کوئی راہ فرار نہ پا کر ان کے سینے میں منہ چھپایا تھا، لیکن پھر اسے لگا جیسے یہاں سے فرار ممکن ہی نہیں ہے۔

”ابو.....! ابو.....!“

وہ بہت ٹوٹ کر رو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

مشعل صبح کے لئے اپنا سوٹ پریس کرتے ہوئے اپنی ہی کسی سوچ میں تھی کہ ثانیہ کی آواز سن کر چونک

کر پوچھنے لگی۔

”کچھ کہہ رہی ہیں امی.....؟“

”ہاں.....! میں کہہ رہی ہوں۔ شوہی ابھی تک نہیں آیا، پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے.....؟ تمہارے نانا ابا

پریشان ہو رہے تھے۔“

ثانیہ کے لہجے میں بھی تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔

”خواہ خواہ پریشان ہوتے ہیں نانا ابا اور آپ بھی۔ شوہی بچہ نہیں ہے، آجائے گا۔“

اس نے استری کا پلگ نکالنے ہوئے کہا، پھر ثانیہ کی تشویش محسوس کر کے اس کا دھیان بنانے کی غرض

سے بولی تھی۔

”ویسے امی.....! مجھے لگ رہا ہے، شوہی کسی لڑکی کے پکڑ میں آ گیا ہے۔“

”شوہی نے تم سے کچھ کہا ہے کیا.....؟“

ثانیہ نے فوراً پوچھا تو وہ ہنستا گئی۔

”نہیں.....! کہا تو نہیں ہے، لیکن.....“

”بس.....!“

ثانیہ نے اسے ٹوک دیا۔

”اپنے آپ فضول باتیں نہ فرض کر لیا کرو۔“

”چلیں، آپ فرض کر لیں، اگر ایسا ہوا تو.....؟“

”مشعال.....!“

ثانیہ سختی سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ شوبی کے آنے پر فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگی۔

”کہاں چلے گئے تھے.....؟“

”دیکھیں خالہ.....! میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں.....؟“

شوبی نے جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھوں میں پکڑے شاپنگ بیگ اوپر اٹھا کر کہا تو ثانیہ کے

ساتھ مشعال کے چہرے پر بھی حیرت پھیل گئی تھی۔

”خالہ.....! یہ آپ کے لئے ساڑھی اور یہ سوٹ، اس میں آپ کی شال ہے اور یہ نانا بابا کا سوٹ۔ یہ

مشعال.....! تمہارے لئے، اس میں تمہارے سوٹ ہیں۔“

وہ ایک ایک شاپنگ بیگ دکھا کر رکھ رہا تھا۔

”شوبی بیٹا.....! یہ سب کہاں سے آئے.....؟“

ثانیہ نے حیرت میں گھرے پوچھا تو شوبی لا پرواہی سے بولا۔

”بازار سے.....!“

”بازار سے تو آئے ہیں، لیکن پیسے..... پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس.....؟“

”آگئے کہیں سے بھی، آپ آم کھانے سے مطلب رکھیں خالہ.....! پیڑ گئے کھڑی ہوں گی تو سر میں

چاندی اتر آئے گی۔“

شوبی اسی بے نیازی سے کہہ کر کمرے سے نکل گیا تو وہ جو حیرت میں کھڑی تھی، ثانیہ کے دیکھنے پر یک

دم حرکت میں آگئی اور تمام شاپنگ بیگ اٹھا کر تیزی سے شوبی کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی تمام بیگز

اس کے سامنے پھینک کر بولی تھی۔

”تم کیا سمجھتے ہو تمہاری ان چیزوں سے میں، امی اور نانا بابا خوش ہو جائیں گے.....؟“

”میں کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں لایا۔“

”پھر.....؟“

وہ جتنی بھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ضرورت کی چیزیں ہیں، اگر لے آیا ہوں تو کون سی قیامت آگئی ہے.....؟“

شوبی کو غصہ آ گیا تھا۔

”قیامت چیزوں سے نہیں، اس بات سے آئی ہے کہ تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے.....؟“

اس نے کہا تو شوبی مزید چڑ گیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، چوری کی ہے میں نے یا ڈاکو ڈالا ہے.....؟“

”اگر تم سچ نہیں بتاؤ گے تو ہم یہی سمجھیں گے۔“

وہ ذرا اسے رعایت دینے کو تیار نہیں تھی۔ شوبی خاموش ہو گیا تو وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔

”بتاؤ شوبی.....! امی بہت پریشان ہو رہی ہیں اور صبح جب نانا بابا کو پتا چلے گا تو وہ امی سے زیادہ پریشان

ہوں گے۔“

”تو سچائی سن کر کون سا خوش ہو جائیں گے.....؟“

شوبی عاجز ہو گیا تھا۔

”نہ ہوں خوش، لیکن انہیں یہ اطمینان تو ہو جائے گا کہ تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ بتاؤ شوبی.....! چلو،

میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“

اس نے مصطفیٰ دوستانہ انداز اختیار کیا تو وہ چڑ کر بولا۔

”بتا بھی دوں تو مجھے فرق نہیں پڑے گا۔ میں اپنے ابا کے پاس گیا تھا۔“

”کک..... کیا.....؟ تمہارے ابا.....؟“

وہ بے ساختہ چپٹی تھی۔

”ہاں.....! او ویلا چمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابا نے اگر مجھے پیسہ دیے ہیں تو کوئی احسان نہیں کیا۔

میرا حق ہے ان پر۔“

”ٹھیک ہے، تمہارا حق ہے، ہمارا نہیں۔“

وہ کہہ کر ہلٹی تھی کہ شوبی اس کے سامنے آ گیا۔

”ایک بات بتاؤ ممش.....! اگر تمہارے ابا تمہارے سامنے آ جائیں تو کیا تم ان سے منہ موڑ لوگی.....؟“

”ہاں نہیں.....!“

وہ اسے دیکھ کر اس کے کمرے سے نکل آئی تھی، پھر اس نے ثانیہ کو مطمئن کر دیا، لیکن خود ڈسٹرب

ہو گئی تھی۔

شائمان کی ضد سے زوبیہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرے؟ شائمان اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اب وہ اس کی خوشیاں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی، جلدی اس کی شادی ہو اور پھر اس کے بچوں سے گھر میں رونق ہو۔ اصل میں وہ تنہائی سے بھی گھبرا گئی تھی۔

بہر حال اس وقت اس نے شائمان کو اس کی ضد سے باز رکھنے کی کوشش کی تو وہ اُلٹا اسے سمجھانے لگا۔
”آپ سمجھتی کیوں نہیں می؟ سارہ کے گھر والے اسے میرے انتظار میں بٹھائے نہیں رکھیں گے۔ اس کی شادی کہیں اور کر دیں گے، اور آپ سن لیں، اگر سارہ کی کہیں اور شادی ہو گئی تو پھر میں کبھی شادی نہیں کروں گا، مگر کبھی نہیں۔“

”شامی؟“

زوبیہ نے تڑپ کر ٹوکا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟“

”ہاں! ہو گیا ہوں پاگل، اور آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟ میں جیوں یا مروں۔“

شائمان نے مزید اسے تڑپا دیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا؟ میں تمہارے دشمن۔“

”بس رہنے دیں می! جب آپ کو اور ڈیڈی کو کچھ سے محبت ہی نہیں ہے تو پھر میرے ساتھ جو بھی

ہو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے سارہ نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔“

”اللہ نہ کرے۔ مجھے بتاؤ، کہاں رہتی ہے سارہ؟ میں اس کے گھر جاؤں گی۔ تمہارے ڈیڈی نہیں

مانتے نہ مانیں۔ میں تمہاری سارہ سے شادی کراؤں گی۔“

زوبیہ مانتا سے مجبور ہو گئی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں بیٹا! میرا یقین کرو۔“

”ایسے نہیں می! پہلے آپ ڈیڈی کو منائیں، پھر آپ دونوں میرا پرپوزل لے کر جائیں گے اور یہ

کام جلدی ہونا چاہئے۔“

شائمان نے اپنی خوشی ظاہر نہیں ہونے دی، ہنوز رد و مذاہن اختیار کئے رکھا تو زوبیہ اس کا گال تھپک کر

بولی۔

”میں بھی تو جلدی تمہاری شادی کرنا چاہتی تھی، اور میں ابھی تمہارے ڈیڈی سے بات کرتی ہوں۔“

”صرف بات نہیں کرنی ہے می! انہیں منانا بھی ہے۔“

اس نے کہا تو زوبیہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ علی احمد فون پر کسی سے

بات کر رہے تھے۔ زوبیہ خاموشی سے بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ جب وہ فارغ ہوئے تو اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر

کہنے لگی۔

”کیا بات ہے بھئی؟“

”وہ..... علی! میں آپ کو شامی کا بتانا چاہتی ہوں۔ بہت اموشل ہو رہا ہے۔ مرنے مرنے کی حالت میں لگا ہے۔“

زوبیہ بتاتے ہوئے رو ہائی ہو گئی، پھر بھی علی احمد نے تھے۔

”اچھا!۔“

”علی! پلیز، اس بات کو مذاق میں نہ لیں۔ خدا نخواستہ شامی نے اگر اپنے ساتھ کچھ کر لیا تو.....؟“

اس نے کہا تو علی احمد یک دم سخت ہو گئے۔

”کچھ نہیں کر سکتا وہ، محض تمہیں اموشل بلیک میل کر رہا ہے۔ تم اس کی دھمکیوں میں مت آؤ۔“

”پھر میں کیا کروں.....؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔“

اس کی بے بسی پر علی احمد مزید جھنجھلا گئے۔

”کیا سمجھ نہیں آ رہی؟ تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر شامی تمہیں زیادہ فورس کرے تو

ماتے کہو، مجھ سے بات کرے، میں اس کے مزاج ٹھکانے لگا دوں گا۔“

”فارگا ڈسک علی! میں دلگاہ نہیں چاہتی۔“

”پھر کیا چاہتی ہو؟“

”آپ پیار سے شامی کو سمجھائیں اور اگر اس کی بات بھی سن لیں تو.....“

”نہیں!۔“

علی احمد نے فوراً انگلی اٹھائی تھی۔

”مجھے اس کی کوئی بات نہیں سننی اور ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”ایسا کیسے چلے گا علی؟“

وہ عاجز ہو کر بولی۔ علی احمد نے کوئی جواب نہیں دیا، اٹھ کر چلے گئے تو وہ سچ رو پڑی۔

☆.....☆.....☆

ناشتے پر علی احمد نے اس کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی تھی کہ وہ آفس ٹائم میں جب چاہے اٹھ کر ادھر

بٹھ جاتا ہے، اور آخر میں انہوں نے دارنگ دی تھی کہ وہ آئندہ اس کی ایسی حرکت نظر انداز نہیں کریں گے۔

وہ سر جھک کر خاموشی سے سنتا رہا تھا اور پھر ناشتے کے بغیر ان سے پہلے ہی آفس کے لئے نکل آیا تھا۔ وہ

لہو لہو کا ضرور اس کی مٹی سے سارہ کی بات کی ہوگی، جس کا غصہ انہوں نے اس طرح نکالا تھا۔

بہر حال اسے یہ سب منظور تھا، لیکن سارہ سے دستبرداری منظور نہیں تھی۔ جب ہی ساری باتیں اہل سے جھٹک کر وہ آفس میں داخل ہوتے ہی رُک گیا اور بے ساختہ نظریں اور گردن گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ طرف گلاب کے پھول سجے تھے اور دیوار پر پچی برتھ ڈے کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوش گوار تاثر تھا کہ مشعل سامنے آ کر بولی تھی۔

”پچی برتھ ڈے سر!“

وہ چونک کر مشعل کو دیکھتے ہی یک دم بگڑ گیا۔

”یہ سب کیا ہے؟“

مشعل نے بوکھلا کر اسٹاف کے دوسرے لوگوں کو دیکھا تو وہ ان سب کی طرف رخ موڑ کر غصے ۔

بولے۔

”کس نے کیا ہے یہ سب؟ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔ کس نے کیا ہے یہ سب؟“

”سر! وہ! میں!“

مشعل کے حلق میں لفظ اُٹک گئے۔

”آپ؟“

وہ فوراً اس کی طرف گھوما تھا۔

”آپ یہاں کام کرنے آئی ہیں یا پکنک منانے؟ اپنے ساتھ باقی لوگوں کا بھی وقت خراب کر لیں۔“

”آپ؟“

”آئی ایم سوری!“

”سٹ آپ! جانیں آپ لوگ اپنی سیٹ پر۔“

سب لوگ سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔

”ہٹائیں یہ سب۔“

وہ مشعل سے کہہ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ اس کے موبائل کی ٹون بجنے لگی۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور اسکرین پر سارہ کا نام دیکھتے ہی کال ریسپونڈ کی تھی۔

”جناب! ابھی ابھی آفس پہنچا ہوں۔“

اس کا موبائل ایک لحظہ خوش گوار ہو گیا تھا۔ سارہ سے باتیں کرتے ہوئے اس کی نظریں بلا ارادہ مشعل کی

دیکھ رہی تھیں جو خلوص سے سجائے گئے گلدستے سمیٹ رہی تھی۔ پھر وہ سب لے کر روم سے نکل گئی اور جب وہاں آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھی تو اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ شامان نے نہ اس کا جانا محسوس کیا اور نہ آنا، وہ اب سارہ،

منار ہا تھا۔

”یار! شام کو رکھ لو ناں، اس وقت آفس سے نکلنا بہت مشکل ہے۔“

اچھا پلیز! ناراض مت ہو۔

ٹھیک ہے بابا! ٹھیک ہے۔“

وہ سیل آف کر کے سوچنے لگا کہ اب علی احمد سے کیا بہانہ کرے؟ ابھی صبح ہی تو انہوں نے اسے

وارننگ دی تھی۔ سوچتے ہوئے اس کی نظر مشعل پر پڑی تو اچانک اسے بہانہ سوچھ گیا۔ فوراً اٹھا، لیکن پھر سنبھل کر

مشعل کی ٹیبل پر آ کر کہنے لگا۔

”مس مشعل! آئی ایم سوری! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

مشعل نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”مشعل! پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔ آئی ایم ریلی ویری سوری! ام! میں نے آپ کو بہت

ہرٹ کیا۔ یقین کریں، میں بہت گلی تیل کر رہا ہوں۔ آپ چائیں تو۔“

اس کے دیکھنے پر ایک لحظہ رُک کر بولا۔

”میرا مطلب ہے، چلیں۔ ہاں بس چلیں۔“

”سر! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں بالکل نہیں سمجھ رہی۔“

وہ واقعی اس کی آخری بات نہیں سمجھتی تھی۔

”میں سمجھتا ہوں، سب سمجھتا ہوں۔ آپ آئیے پلیز!“

اس کے اصرار پر مشعل ابھی بھی نہ سمجھنے کے انداز میں اُٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی، اور جب آفس

سے نکل کر اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ مزید الجھ گئی۔

”سر! آپ!“

”بیٹھیں پلیز!“

وہ اسے سمجھنے اور بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے ہی فوراً دروازہ بند کیا اور خود

ڈرائیونگ سیٹ پر آتے ہی گاڑی اشارت کر کے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

”سر! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

مشعل پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے جواب نہیں دیا تو وہ رو ہنسی بھی ہو گئی۔

”سر! پلیز، آپ مجھے یہی اُتار دیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ پلیز سر! گاڑی روکیں۔“

”ریٹکس مشعل! آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ میں آپ کو کہیں بھگا کر نہیں لے جا رہا۔“

اس کے دھرج سے کہنے پر وہ جھلملائی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اصل میں میری دوست سارہ مجھے برتھ ڈے وٹس کرنا چاہتی ہے۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔“

اس نے بتا تو وہ اُلجھ گئی۔

”سر! میں..... میرا مطلب ہے، آپ مجھے کیوں لے جا رہے ہیں.....؟“

”کیونکہ میں نے آپ کو ہرٹ کیا ہے۔ خیر! اب میں اس لئے آپ کو ساتھ لے جا رہا ہوں تاکہ

اپنے رڈیے کی خلائی کرسکوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں تھی۔“

وہ اس کی بات سن کر جڑ بڑھ گئی تھی۔

”لیکن مجھے ضرورت تھی، اور ہاں..... ڈیڈی کو پتا نہیں چاہئے کہ ہم کہاں گئے تھے.....؟“

اس نے کہا، تب سارا معاملہ سمجھ کر مشعال کا دل چاہا، صاف منہ کر دے کہ وہ علی احمد سے غلط بیانی نہیں

کرے گی، لیکن اس وقت وہ اس کے رحم و کرم پر تھی، اس لئے ہونٹ بھیج کر خشے سے باہر دیکھنے لگی، اور جب گاڑی

ڑکی تب اس نے یہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ کہاں آگئی ہے.....؟ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

شائمان نے اسے ایک فیمل پر بٹھایا اور خود سارہ کے پاس دوسری فیمل پر آگیا، جہاں سارہ اس کے لئے ایک سجائے

بیٹھی تھی۔

”ایمان سے تم بہت تنگ کرتی ہو۔“

اس نے کہا تو سارہ کھلکھلا کر بولی۔

”مزہ آتا ہے تمہیں تنگ کر کے۔“

”اچھا چلو، اب جلدی سے ایک کاٹو۔ میں آفس میں بہت ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔“

اس کے کہتے ہوئے پھری اٹھا کر سارہ کی طرف بڑھائی تو وہ ٹوکتے ہوئے بولی۔

”کیا ہو گیا ہے شامی.....؟ برتھ ڈے تمہاری ہے۔“

”اوہاں..... ایہ لو۔“

اس نے کیک پر چھری چلا دی، پھر سارہ کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ پھر جلدی کرتے کرتے بھی اسے وہاں سے

نکلنے میں خاصی دیر ہو گئی تھی، اور ابھی راستے میں ہی تھا کہ علی احمد کا فون آگیا۔

”ڈیڈ کا فون ہے۔“

اس نے پہلے ساتھ بیٹھی مشعال کو مطلع کیا، پھر فون ریسیو کیا تھا۔

”جی ڈیڈی.....!“

”کہاں ہو تم.....؟“

علی احمد نے فوراً پوچھا تو وہ اطمینان سے بولا۔

”بس.....! ابھی آرہا ہوں ڈیڈی.....!“

”آؤ رہے ہو، گئے کہاں تھے.....؟“

انہوں نے غصے سے کہا تھا۔

”وہ..... ڈیڈی.....! مشعال کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔“

اس کے جھوٹ پر وہ سلگ کر اسے دیکھنے لگی۔

”مشعال کو ڈاکٹر کے پاس.....؟ کیا ہوا ہے مشعال کو.....؟“

علی احمد کے لہجے میں اب قدرے تشویش تھی۔

”پتا نہیں ڈیڈ.....! آفس میں پکڑا کر رکھی تھیں۔“

وہ بتاتے ہوئے مشعال کو دیکھ کر مسکرایا، لیکن وہ سناٹے میں بیٹھی تھی۔

”اوہ.....! کوئی سیریس بات تو نہیں ہے.....؟ ابھی کہاں ہے مشعال.....؟“

”میرے ساتھ ہے۔ لیجئے، آپ خود بات کر لیں۔“

اس نے کہہ کر زبردستی موبائل مشعال کو ہاتھ دیا تو وہ بوکھلا گئی اور اس کے اشارے پر موبائل کان سے لگا کر

بولی۔

”جی سر.....!“

”کیا ہوا ہے مشعال.....؟ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری.....؟“

انہوں نے پوچھا تو وہ جڑ بڑھ کر بولی۔

”اب بہتر ہے سر.....!“

”اچھا ٹھیک ہے.....! ابھی تم آرام کرو، آئی مین، شامی سے کہو تمہیں گھر چھوڑ دے۔“

علی احمد نے کہہ کر فون بند کر دیا تو وہ ناراضی سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا.....؟“

”آپ کے ڈیڈ کہہ رہے ہیں، مجھے میرے گھر چھوڑ دیں۔“

”ارے.....! یہ تو اچھی بات ہے۔“

وہ ہنسا تھا۔

☆.....☆.....☆

ثانیہ کو شوبی پر غصہ آ رہا تھا کہ ماں سے تو بات نہیں کرتا اور باپ سے ملنے چلا گیا۔ مزید پوچھنا تو درکنار،

بتا کر بھی نہیں گیا۔

”ابا ٹھیک کہتے ہیں، اپنے باپ بچا پر گیا ہے۔“

وہ بڑی کانتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ شوبی آکر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور دوستانہ انداز میں بولا۔

”لایئے خالہ.....! میں کاٹ دوں۔“

”نہیں.....! بس رہنے دو۔ میں کاٹ تو رہی ہوں۔“

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی تھی۔

”چلیں، میں مفر چھیل دیتا ہوں۔“

شوبی بڑی کی باسکٹ اپنی طرف کھینچ کر مڑ چھیلنے لگا۔ جبکہ نظریں ثانیہ پر تھیں، جو خود کو بہت مصروف ظاہر کر رہی تھی۔

”خالہ.....! آپ مجھ سے ناراض ہیں کیا؟“

شوبی نے پوچھا تو اس نے اختصار سے کام لیا۔

”نہیں.....!“

”پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہیں؟“

”کیا بات کروں.....؟ تم سنتے ہو کوئی بات.....؟“

وہ شاکہ ہوئی۔

”کیوں نہیں سنتا.....؟ سب سنوں گا، آپ کہیں تو.....!“

”کیا کہوں.....؟ تم بتاؤ، کیا سنتا چاہتے ہو.....؟“

وہ براہ راست شوبی کو دیکھنے لگی۔

”وہی بات جس پر آپ کو غصہ آ رہا ہے، لیکن آپ ظاہر نہیں کر رہیں۔“

شوبی نے کہا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

”فضول باتیں مت کرو۔ کام کا وقت ہے، مجھے کام کرنے دو۔ ابھی اب آ جائیں گے، کھانا نہیں پکا ہو گا تو

مجھ کے سوجائیں گے۔“

شوبی کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، پھر پوچھنے لگا۔

”آپ اس لئے ناراض ہیں خالہ.....! کہ میں ابو کے پاس گیا تھا.....؟“

وہ کچھ نہیں بولی، بڑی کی باسکٹ اٹھا کر کچن میں آگئی تو شوبی اس کے پیچھے چلا آیا۔

”بتائیں خالہ.....! اگر آپ نہیں چاہتیں تو منع کر دیں، میں آئندہ ابو سے نہیں ملوں گا۔“

”کیوں.....؟ میں کیوں منع کروں.....؟“

وہ تنک کر بولی تھی۔

”آپ منع کر سکتی ہیں مجھے، کیونکہ آپ میرے لئے میری ماں سے بڑھ کر ہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں

خالہ.....! میرے لئے پہلے آپ اور نانا ابابا ہیں۔ میں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی آپ کی گود میں آ گیا تھا، تو کیا آپ

کو اپنی ممتا پر بھروسہ نہیں ہے.....؟“

شوبی جذباتی ہو گیا تھا، تو اس نے بے اختیار اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

”شوبی.....!“

”میں آپ کا بیٹا ہوں خالہ.....! آپ نہیں چاہتیں تو میں پھر اب اسے کبھی نہیں ملوں گا۔“

”ارے نہیں بیٹا.....! میں کیوں نہیں چاہوں گی.....؟ خون کے رشتے بھی کبھی ٹوٹتے ہیں بھلا.....؟ تم

اپنے ابو سے ضرور ملو، لیکن پہلے اپنے نانا ابابا سے پوچھ لو۔ ان کا مان بڑھ جائے گا۔“

اس نے کہا تو شوبی پوچھنے لگا۔

”نانا ابابا منع تو نہیں کریں گے.....؟“

”نہیں.....! وہ کیوں منع کریں گے.....؟“

”اچھا چلیں، اب آپ اندر چلیں، مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔“

شوبی یک دم مشتاق ہو گیا تھا۔

”ہاں.....! تم چلو، میں کھانا بنا کر آتی ہوں۔“

”جلدی آئیے گا۔“

شوبی کہہ کر کچن سے نکل گیا تو اس نے جلدی سے سبزی چڑھا دی اور ساتھ ساتھ روٹیاں بھی ڈال لیں۔

پھر خوب صاحب کے آتے ہی دسترخوان بچھا دیا۔ خوب صاحب کے ساتھ شوبی بھی ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آکر بیٹھا تو

وہ کہنے لگی۔

”ابا.....! شوبی امتحان دے لے، پھر رابعہ سے ملنے دینی جائے گا۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو یا شوبی.....؟“

خوب صاحب پوچھتے ہوئے باری باری دونوں کو دیکھنے لگے۔

”ایک ہی بات ہے نانا ابابا.....! خالہ چاہتی ہیں، میں امی سے مل آؤں تو مل آؤں گا۔“

شوبی نے کہا تو خوب صاحب تعجب سے بولے تھے۔

”یعنی تمہارا اپنا دل نہیں چاہتا ماں سے ملنے کو.....؟“

”چاہتا ہے نانا ابابا.....! بس یہ ہے کہ میں آپ سے دور نہیں ہونا چاہتا۔ آپ کہہ دیجئے گا امی سے، مجھے

زیادہ دل اپنے پاس نہ رکھیں۔“

شوبی نے اعتراف کے ساتھ کہا۔

”ہاں ہاں.....! رابعہ تمہیں مجبور نہیں کرے گی، جتنے دن تم رہ سکو۔“

ثانیہ فوراً بولی، تب ہی مشعال نے آکر سلام کیا تو شوبی نے اسے دیکھتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔
”ارے! آج تم جلدی آگئی؟“

”ہاں بس!“

مشعال کا کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟“

ثانیہ اسے دیکھتے ہی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

”جی امی! بس صبح سے سر میں درد تھا، کوئی کام ہی نہیں ہو سکا، جب ہی آگئی۔“

”اچھا آؤ، کھانا کھا لو!“

”ابھی بھوک نہیں ہے، پہلے تھوڑی دیر سوؤں گی۔“

مشعال کہتے ہوئے کمرے میں چلی گئی تو ثانیہ پریشانی سے خواجہ صاحب کو دیکھنے لگی۔

”دیکھو، کیا بات ہے؟“

خواجہ صاحب نے کہا تو شوبی بول پڑا۔

”اوہو نا! پہلے حالہ کو کھانا تو کھانے دیں۔“

”بس! میں نے کھالیا۔“

وہ کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے میں آئی اور مشعال کو تختے میں منہ چھپائے لیٹے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی۔

”مشعال! کیا بات ہے بیٹا؟ کیا زیادہ درد ہو رہا ہے؟“

”ہوں!“

”تو بیٹا! ٹیبلٹ لے لو، چائے بنا دوں؟“

ثانیہ نے اس کے منہ پر سے ٹکیہ ہٹا کر پوچھا تو وہ تنگ پڑ کر بولی۔

”نہیں امی! میں نے آفس میں چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لے لی تھی۔“

”چلو، پھر سو جاؤ تھوڑی نیند لے لو گی تو درد میں آرام آ جائے گا۔“

ثانیہ نے جھک کر اس کی پیشانی چومی، پھر جانے لگی کہ مشعال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں امی؟ میرے پاس بیٹھ جائیں ناں۔“

وہ ذرا سا مسکرائی، پھر بیٹھ کر مشعال کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ مشعال نے آنکھیں بند کر

لیں۔

”مشعال!“

قدرے ڈک کر کسی خیال کے تحت اس نے مشعال کو پکارا تھا۔

”جی امی!“

”بیٹا! تمہیں آفس میں کوئی پرابلم تو نہیں ہے ناں؟“

اس نے پوچھا تو مشعال اُلٹا پوچھنے لگی۔

”کیسی پرابلم امی؟“

”جیسی لڑکیوں کو ہوتی ہے، کوئی تنگ کرے تو۔“

وہ مشعال کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

”نہیں امی! مجھے کوئی تنگ نہیں کرتا، بلکہ کسی کو بھی کوئی تنگ نہیں کرتا۔ آفس کا ماحول بہت اچھا

ہے۔ سب لڑکیاں بہت خوش ہیں۔“

مشعال نے بتایا تو وہ اور لڑکیوں کا سن کر مطمئنان سے ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے جب سے سارہ نے یہ بتایا تھا کہ اس کے لئے ایک دو بہت اچھے پروزل آتے ہیں تو وہ بہت

پریشان ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کی ماب زیادہ انتظار نہیں کر سکتیں، اس لئے وہ ان پروزل پر غور

کر رہی ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے فون پر وہ پھر یہی باتیں کر رہی تھی۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا، جب ہی سیل آف کرتے

ہی وہ زویہ کے پاس آ کر پوچھنے لگا۔

”ممی! آپ نے ڈیڑی سے سارہ کی بات کی تھی؟“

”نہیں بیٹا! ابھی میں ان کا موڈ دیکھ رہی ہوں۔ کچھ دنوں سے کافی آپ سیٹ لگ رہے ہیں۔ شاید

کوئی آفیشل پرابلم ہو۔“

زویہ نے مبالغہ آرائی کی تھی، وہ جڑ گیا۔

”آفس میں کوئی پرابلم نہیں ہے ممی! سب ٹھیک چل رہا ہے۔“

”تمہیں کیا پتا تم آفس میں کتنے کب ہو؟ تمہارے ڈیڑی بتا رہے تھے، ذرا دیر آفس میں بیٹھے ہو،

پھر کہیں غائب ہو جاتے ہو۔ کہاں جاتے ہو؟“

زویہ نے جتنا تے ہوئے پوچھا۔

”کہاں جاؤں گا؟ آفس ہی کے کام سے جانا ہوتا ہے۔ ڈیڑی کو سب پتا ہے۔ خیر! آپ یہ

بتائیں، آپ کو میری شادی کرنی ہے کہ نہیں؟“

اس کی ہٹ دھرمی پر زویہ جزبہ ہو کر بولی۔

”کیوں نہیں؟ میں تو آج ہی تمہاری شادی کرنے کو تیار ہوں، تم ہی سنجیدہ نہیں ہوتے۔“

”میں سنجیدہ نہیں ہوتا.....؟ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں می.....؟“
وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم پہلے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو۔ تمہارے ڈیڈی تمہاری شادی پر اسی وقت رضامند ہوں گے جب انہیں آفس میں تمہاری کارکردگی نظر آئے گی۔“
زوبیہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سوری می..... میں ڈیڈی کے معیار پر شاید کبھی پورا نہیں اتر سکتا۔“
”کیوں نہیں.....؟ تم کوشش تو کرو۔ ابھی بھی دیکھو جنہیں ذرا احساس نہیں کہ تم آفس سے لیٹ ہو رہے ہو۔ تمہارے ڈیڈی کب کے جا چکے ہیں۔“

زوبیہ نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی تو وہ ناراضی سے سر جھٹک کر باہر نکل آیا۔ اس کا موڈ مزید خراب ہو گیا تھا۔ آفس جانے کا بالکل دل نہیں چاہا، لیکن اب اس کے ڈیڈی کچھ زیادہ جرح کرنے لگے تھے۔ پھر سارہ کو پانے کے لئے اسے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اندر ہی اندر تمللاتے ہوئے وہ ہلکی اسپینڈ سے گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا کہ ایک جگہ اسٹاپ پر مشعال کو کھڑے دیکھ کر اس نے گاڑی اس کے قریب روک دی اور شیشہ گر اکرا سے نام سے پکارا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

”آئیے.....! میں آفس ہی جا رہا ہوں۔“
اس نے کہا تو وہ شش و پنج میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
”کم آن گرل.....!“

اس نے پھر کہا، تب وہ جیسے مجبوراً بیٹھی تھی۔

”آپ آفس ہی جا رہی ہیں ناں.....؟“

اس نے کسی خیال کے تحت پوچھا تھا۔

”جی سر.....! آج میں کچھ لیٹ ہو گئی ہوں۔“

وہ لیٹ ہونے پر خائف تھی۔

”ہوتا ہے، کبھی کبھی.....!“

اس نے بے نیازی سے کہہ کر گاڑی کی اسپینڈ بڑھا دی اور دس منٹ میں ہی آفس پہنچ گیا۔ مشعال قصداً اس سے دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ اس نے دھیان نہیں دیا، بلکہ لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے وہ تقریباً اسے بھول ہی گیا تھا۔ وہ تو جب مشعال نے اچانک اس کا بازو تھاما، تب وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ لیکن مشعال اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اس کا دھیان نہ جانے کہاں تھا، اور نہ جانے کیا ہوا تھا اسے، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ جبکہ اس کے بازو پر مشعال کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے وہ عجیب سے احساس میں

گھبر گیا اور بے اختیار اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
”کیا بات ہے مشعال.....؟“

”سر.....! وہ.....“

وہ چونک کر اسی قدر بولی تھی کہ لفٹ رکنے پر دروازہ کھلتے ہی دوسرے افراد باہر نکلے تو وہ بے چین ہو کر پھر بولی۔

”سر.....! وہ.....“

”ریٹکس.....! آئیے۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر لفٹ سے نکلا تو اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھنے لگا، لیکن سمجھ نہیں پایا کہ وہ کسے دیکھ کر حواس کھو رہی تھی۔ تب اس سے پوچھنے لگا۔
”کیا بات ہے.....؟ آپ کسے دیکھ کر پریشان ہو رہی ہیں.....؟“

”جی.....! وہ.....“

مشعال کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے.....؟

”سوری.....! اگر آپ بتانا نہیں چاہتیں تو.....“

اس نے کندھے اُچکانے تو وہ خود پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ بات نہیں ہے سر.....! اصل میں، میں خود نہیں جانتی، یا شاید جانتی ہوں، یا شاید نہیں۔“

”یا شاید جانتا چاہتی ہیں۔“

اس نے کہا تو وہ ناگہمی میں بولی۔

”جی.....!“

”ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا، کسی کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، لیکن یہ یاد نہیں آتا کہ کہاں

دیکھا ہے.....؟ تو ایسے میں بندہ مستقل اُبھرتا رہتا ہے، ہے ناں.....؟“

اس نے آخر میں تصدیق چاہی تو وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”جی.....!“

”چلیں، آپ روم میں جائیں، میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔“

وہ کہہ کر واپس لفٹ میں داخل ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دانیال حسن تھے جنہیں دیکھ کر مشعال حواسوں میں نہیں رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے

پاپا کو اتنے قریب سے دیکھ رہی ہے، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ انہیں پکارے، پھر انہیں بتائے کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ لیکن اتنے لوگوں کے بیچ متاثرہ بننے کے خیال سے ہی خود کو روکنے کی سعی میں وہ بے اختیار شائمان کا بازو تھام گئی تھی، اور اسے احساس نہیں تھا۔ جبکہ شائمان علی کو اچانک اس کا احساس ہوا تھا۔ ایسا احساس جو اس کے اندر کی دنیا تہہ بالا کر گیا تھا۔ ایسا تو اس نے سارہ کی رفاقت میں بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

بہر حال اپنی سیٹ پر آکر بھی مشعل گم سم تھی۔ بظاہر کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے، لیکن اس کا ذہن دانیال جس کو سوچ رہا تھا۔ جب ہی شائمان علی کے آنے کا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ وہ تو جب موبائل کی ٹون بجی، تب اس نے چونک کر شائمان کو دیکھا۔ شائمان اپنی جگہ گم سم بیٹھا تھا۔

”سر.....! آپ کا فون۔“

اس نے کہا تو وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

”مجھ سے کچھ کہا.....؟“

”جی سر.....! آپ کا فون بج رہا ہے۔“

اس نے اس کے موبائل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”اوہ.....!“

شائمان نے موبائل اٹھا کر دیکھا، لیکن کال ریسپونڈ نہیں کی۔ ٹون بند ہو گئی، تب موبائل رکھ کر ایک فائل اٹھالی اور اسے چیک کر کے اسے پکار کر بولا۔

”مشعل.....! یہ فائل پاس سے سائن کروا کے سلیم صاحب کو بھجوا دیں۔“

”جی.....!“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس سے فائل لے کر علی احمد کے روم میں داخل ہوتے ہی رک گئی۔ سامنے دانیال حسن علی احمد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کھڑے تھے۔

”اچھا یار.....! میں چلتا ہوں۔“

”اوکے.....! رات میں گھر پر ملاقات ہوگی۔“

”اچھی بات ہے.....!“

دانیال حسن مسکرائے، پھر اس کے قریب سے نکل کر چلے گئے۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

”آئیے سن مشعل.....!“

علی احمد نے اسے مخاطب کیا، جب وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”ارے.....!“

علی احمد اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی ٹیبل پر رکھا موبائل دیکھ کر کہنے لگے۔

”یہ شاید دانیال کا ہے۔“

”جی.....؟“

وہ سمجھی نہیں۔

”ابھی جو صاحب یہاں سے گئے ہیں، جاؤ یہ انہیں دے دو۔“

علی احمد نے موبائل اس کی طرف بڑھا کر کہا تو اس کے اندر جیسے بجلی دوڑ گئی۔ فوراً موبائل لے کر روم سے نکل اور لابی میں آتے ہی اچانک کسی خیال کے تحت دانیال حسن کے موبائل سے اپنے موبائل پر ٹیل دی، پھر تیزی سے ان کے پیچھے جا کر پکارا تھا۔

”سر.....!“

دانیال حسن نے پلٹ کر دیکھا تو اس نے موبائل ان کی طرف بڑھا دیا۔

”سر.....! یہ آپ کا سیل فون۔“

”او جھٹکس.....!“

دانیال حسن موبائل لے کر ذرا سا مسکرائے تھے۔ وہ انہیں جہاں تک دیکھ سکتی تھی، دیکھتی رہی۔ پھر واپس اپنے روم میں آئی تو پہلے ان کا نمبر سیکھ لیا تھا اور اس روز گھر پہنچنے پر جب وہ سونے کے لئے لیٹی تو ٹائیڈ کا ہاتھ تھام کر لاڈ سے بولی تھی۔

”امی.....! مجھے میرے پاپا کے بارے میں بتائیں۔“

ٹائیڈ نے ایک دم اسے دیکھا تو وہ اس کا ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر مزید لجاجت سے بولی تھی۔

”بتائیں ناں امی.....! میں ان کے بارے میں جانا چاہتی ہوں۔ مجھے بتائیں وہ کہاں ہیں.....؟“

”پتا نہیں بیٹا.....! میں نہیں جانتی۔ مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ہے۔“

ٹائیڈ نے گہری سانس کھینچے ہوئے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

”اور انہیں خبر ہے کہ ہم کہاں ہیں.....؟“

ٹائیڈ سوچتے انداز میں نفی میں سر ہلانے لگی۔

”اچھا.....! آپ مجھے شروع سے بتائیں، کیا ہوا تھا.....؟“

وہ ہچل گئی۔

”بس بیٹا.....! ہم دونوں دشمن کی سازش کا شکار ہو گئے۔ میں تو سمجھ رہی تھی، لیکن تمہارے پاپا انہیں

مجھے، اور پتا نہیں اب بھی سمجھے ہوں گے کہ نہیں.....؟“

ٹائیڈ کے رخ تازہ ہو گئے تھے۔

”دشمن کون تھے.....؟“

ٹانیہ کے چہرے پر کرب پھیلتا دیکھ کر اس نے مزید تفصیل نہیں پوچھی۔

”دُشمن کوئی غیر نہیں اپنے ہی تھے، جن پر تمہارے پاپا کو بہت مان تھا۔ ماں کا درجہ دیتے تھے وہ اپنی بھابی کو۔ وہ جو کہتی تھیں، وہی دانیاں کے لئے حرفِ آخر ہوتا تھا، اور انہوں نے ہی اپنی بہن ستا کو دانیاں کی زندگی میں شامل کرنے کے لئے مجھے ان کی زندگی سے نکال دیا تھا۔“

ٹانیہ نے بتایا تو وہ شاکد ہو کر پوچھنے لگی۔

”تو کیا پاپا نے ان کی بہن سے شادی کر لی تھی؟“

”ہاں! آخری بار جب میں نے فون کیا تھا تو سیما بھابی نے یہی بتایا تھا کہ دانیاں شادی کر کے“

کے ساتھ باہر چلے گئے ہیں۔“

ٹانیہ کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔

”پھر پھر آئے نہیں؟ میرا مطلب ہے، اتنے برس بیت گئے، درمیان میں کبھی تو آئے ہوں گے۔“

”جانتی نہیں! آئے بھی ہوں تو ہمیں نہیں معلوم۔“

ٹانیہ کا انداز کھویا ہوا تھا۔ اس نے اپنے اندر اٹھتے مزید سوالوں پر بند باندھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆ ☆ ☆

”نہیں! مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی۔“

”تم سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔“

روبی یک دم جذباتی ہو گئی تھی۔

”کوئی اتنی مشکل تو نہیں ہوں میں۔ تم اکاؤنٹنگ میں سرکھپاتے ہو۔ سیدھا سادا پلس مائنس کا سوال

تمہاری سمجھ میں نہیں آتا، حیرت ہے۔“

”حیرت تو مجھے بھی ہے کہ آخر تمہیں مجھ میں کیا نظر آتا ہے۔؟ میں ٹھہرا خشک، اکھڑ۔“

”اب میں کیا کروں۔؟ مجھے تمہارا اکھڑ پن ہی اچھا لگتا ہے۔“

وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”اچھا!۔“

وہ اپنی گدی کھانے لگا۔ ہونٹوں میں محسوس کی جانے والی مسکراہٹ دہلی تھی۔

”ہاں! اور یہ تم اتنے بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو۔؟“

روبی نے پوچھا تو وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”چلو گی۔؟“

”کہاں۔؟“

روبی نے فوراً پوچھا تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”سوال جواب نہیں، چلنا ہے تو چلو، نہیں تو میں جا رہا ہوں۔“

”ایک منٹ! میں امی سے کہہ آؤں۔“

وہ جگت میں بھاگی تھی اور وہ ٹانیہ سے کہہ کر باہر نکل آیا۔ کچھ دیر بعد روبی آئی تو اسے گاڑی میں بیٹھے دیکھ

کر حیرت میں گھر گئی۔

”اب جلدی بیٹھو۔“

اس نے روبی کی طرف کا دروازہ کھول کر کہا تو وہ بیٹھے ہی پوچھنے لگی۔

”یہ گاڑی کس کی ہے۔؟“

”اپنی ہے۔“

اس کی بے نیازی پر وہ تنک کر بولی۔

”اپنی سے مطلب۔؟“

”مطلب میرے باپ کی ہے۔ باپ کی چیز اپنی ہی ہوتی ہے، سمجھی۔؟“

اس نے کہتے ہی اسپید سے گاڑی آگے بڑھانی تھی۔

شوبی اپنے ابو سے گاڑی لے آیا تھا اور اس وقت کہیں جانے کو تیار ہو کر خود کو آسینے میں دیکھ رہا تھا کہ روبی آندھی طوفان کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھنے لگی۔

”شوبی! اسنا ہے تم ڈنسی جا رہے ہو۔؟“

”ٹھیک سنا ہے تم نے۔“

وہ آسینے میں اسے دیکھ کر بے نیازی سے بولا تھا۔

”کیوں۔؟ میرا مطلب ہے، سکنے دنوں کے لئے۔؟“

روبی ہمیشہ سے اس پر اپنا حق سمجھتی تھی۔

”ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں، تاکہ تم سے جان چھوٹ جائے۔“

وہ اس کی طرف گھوم کر بولا۔

”ایسے ہی جان چھوٹ جائے۔ میں تمہاری جان چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ ذہنی تو یہ کھڑا ہے، تم اگر ادا

کے آخری کو نے میں بھی جاؤ گے تو میں وہاں بھی پہنچ جاؤں گی۔ سمجھے مشر شوبی۔؟“

روبی نے ایک سانس میں بول کر اسے چڑایا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

”اس کا مطلب ہے، تم امیر باپ کی اولاد ہو، چھٹی بگڑے ہوئے ہو۔“

روہی نے کہا تو وہ خاصا مظلوم ہوا۔

”اب جیسا بھی ہوں، تم ہی نے پہل کی تھی۔ بالکونی سے جھانک جھانک کر اشارے کرتی تھیں۔“

”کوئی نہیں.....!“

وہ ہلش ہو گئی۔

”اچھا.....! یہ بتاؤ، کیا کھاؤ گی.....؟“

”مٹس کریم.....!“

”صرف آئس کریم.....؟“

”اس کے بعد تمہارا جدول چاہے کھلا دینا۔ بلکہ ایسا کرو، پہلے کچھ کھاتے ہیں، پھر آئس کریم۔“

روہی کی فرمائش پر اس نے گاڑی پیزا ہاٹ پر روک لی اور وہ وہیں پیزا آرڈر کر کے اسے دیکھنے لگا۔

”سنو.....! تم ڈینی جا کر مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے.....؟“

روہی اس کے دیکھنے سے قدرے زرد ہو کر پوچھنے لگی۔

”بھول گیا تو کیا کرو گی.....؟“

اسے جیسے بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔

”میں بہت روؤں گی اور بس روئی رہوں گی۔“

”اور جب کوئی پوچھے گا، کیوں رو رہی ہو.....؟ تو کیا کہو گی.....؟“

اس نے کہا تو وہ یک دم تیز ہو گئی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟ تم چاہتے ہو میں روئی رہوں.....؟“

”نہیں.....! ایسا تو میں نہیں چاہتا۔“

وہ ہلش مسکرا ہٹ چھپا رہا تھا۔

”پھر یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا، تمہیں ہر بل میری یاد ستائے گی، بتاؤ ستائے گی

میری یاد کہ نہیں.....؟“

وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

”ہاں.....! یاد تو آؤ گی۔“

وہ معصوم بن گیا۔

”پھر تم جلدی آ جاؤ گے ناں.....؟“

روہی نے فوراً پوچھا تو وہ ہنسنے لگا۔

”پاگل ہو تم بالکل.....! میں کہیں نہیں جا رہا، اور اگر گیا بھی تو تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔ چلو گی

ہاں.....؟“

اسے خود ابھی ادراک ہوا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔

☆.....☆.....☆

وہ ہمیشہ سارہ کے بلانے پر سر کے بل بھاگا آتا تھا۔ ابھی بھی اسی طرح اپنے ضروری کام چھوڑ کر آیا تھا،

لیکن جب سارہ نے ہمیشہ کی طرح بے باکی سے اس کا بازو تھام کر خوشی کا اظہار کیا تو جانے کیا ہوا، وہ ایک دم خاموش

ہو گیا تھا۔

”ہائے شامی.....! اتنے خوب صورت موسم میں میرا دل چاہ رہا ہے کہ.....“

سارہ اس کے بازو پر سر ٹکاتے ہوئے جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ اس نے ایک دم اپنا بازو چھڑا کر ٹوک

دیا۔

”یہ کیا حرکت ہے.....؟“

”کیا ہوا.....؟“

سارہ نا سمجھی میں اسے دیکھنے لگی تو وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر بولا۔

”کچھ خیال کرو، ہم پبلک پلےس پر ہیں۔“

”اوگا ڈشامی.....! کیا ہو گیا ہے تمہیں.....؟“

وہ زور سے ہنسی، پھر کہنے لگی۔

”میں تم پر اپنے ڈیڈی کا رنگ تو نہیں چڑھ رہا.....؟ پلیز، اب یہ مت کہہ دینا، دوپٹہ اوڑھا کر دو، سر جھکا

کر چلو، راستے میں مت ہنس۔ اوگا ڈ.....! مجھے تو سوچ کر ہی وحشت ہو رہی ہے۔“

وہ ہونٹ سمیٹ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو شامی.....؟ ہم کوئی پہلی بار تو یہاں نہیں آئے.....؟“

وہ کچھ نہیں بولا، گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو سارہ جھنجھلا گئی۔

”کیا ہو گیا ہے شامی.....؟ کیوں یور کر رہے ہو.....؟ اگر موڈ نہیں تھا تو منع کر دیتے۔ کیا ضرورت تھی

آنے کی.....؟“

”واقعی.....! غلطی ہو گئی۔“

وہ بے اختیار بولا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

اس وقت وہ ان کا نمبر دیکھتے ہوئے اسی شش و پنج میں بیٹھی تھی۔ شامان ابھی آفس نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک نظر اس کی خالی چیز کو دیکھا، پھر ایک دم دانیال حسن کا نمبر پیش کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف تیل جاری تھی۔ پھر ان کی آواز ابھری تھی۔

”ہیلو.....!“

”پاپا.....!“

اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔

”ہیلو.....! ہیلو.....!“

دانیال حسن متوجہ کر رہے تھے۔ اس نے گہرا کرا لائن کاٹ دی۔ اسے اپنے چہرے سے بھاپ نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جبکہ ہاتھ ہٹھنڈے ہو گئے تھے۔ کچھ دیر ہٹھنڈے ہاتھوں سے چہرہ تھپتھپانے کے بعد اس نے دوبارہ انہیں کال کی تھی۔

”ہیلو.....!“

ان کی آواز سنتے ہی وہ بول پڑی۔

”مشعال بات کر رہی ہوں۔“

”جی بی بی.....! آپ نے شاید رانگ نمبر ڈائل کیا ہے۔“

انہوں نے کہا تو وہ ان کے سلجھے ہوئے لہجے میں کھو کر گویا ہوئی۔

”جی نہیں.....! مجھے دانیال حسن صاحب سے بات کرنی ہے اور یقیناً وہ آپ ہی ہیں۔“

”جی ہاں.....! میں ہی دانیال حسن ہوں۔ کہئے.....!“

انہوں نے اس کی بات آپک کر کہا تو وہ سنبھل کر کہنے لگی۔

”میرا نام مشعال ہے، مشعال حسن، اور میرے ولایت کے خانے میں آپ کا نام لکھا جاتا ہے، یعنی دانیال حسن۔ کتنی عجیب بات ہے، جس شخص کو میں نے دیکھا نہیں، جسے میں جانتی نہیں، اس کے نام کے بغیر میرا تعارف ہی مکمل نہیں ہوتا۔“

”آپ..... تم.....“

ادھر دانیال حسن غالباً سائے میں تھے۔

”کیا نام بتایا تم نے اپنا.....؟“

”مشعال.....!“

اس نے نام بتانے کے ساتھ ہی سیل فون آف کر دیا۔ اس کا دل بڑی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک ساتھ متضاد کیفیات تھیں۔ اس نے سر جھٹک کر اپنی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر جمادیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دونوں

ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ تب ہی ملازم نے آکر باس کا بیج دیا تو وہ بمشکل خود پر قابو پا کر باس کے روم میں آئی تو وہ جیسے اس کے انتظار میں بیٹھے تھے، دیکھتے ہی بولے۔

”آؤ مشعال.....! بیٹھو۔“

”جی.....!“

وہ سامنے بیٹھ کر منتظر نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”ہاں.....! اب بتاؤ، کیا رپورٹ ہے.....؟ آئی مین، شامان کے معاملے میں تم نے اب تک کیا

کیا.....؟“

انہوں نے پوچھا تو وہ جڑ بڑ ہو کر بولی۔

”آئی ایم سوری سر.....! کسی کے پرسنل میں زبردستی انوالو ہونا عجیب بھی ہے اور مشکل بھی، کچھ وقت

لگے گا۔“

”ہوں.....!“

علی احمد سوچ انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

”سر.....! کیا اس کے بعد میری جاب ختم ہو جائے گی.....؟“

اس نے پوچھا تو وہ چونک کر بولے۔

”نہیں.....! تمہاری جاب کیوں ختم ہوگی.....؟ بلکہ میں تمہیں پرامنٹ کر دوں گا۔ آفس کا کام تو تم کافی

حد تک سمجھ ہی گئی ہو۔“

”جی.....!“

”اچھا.....! یہ بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے.....؟“

انہوں نے پوچھا۔

”جی.....؟“

وہ سمجھی نہیں۔

”میرا مطلب ہے گھر میں، تمہارے والد کیا کرتے ہیں.....؟“

ان کی وضاحت پر اس کا دل چاہا، انہیں بتانے کہ اس روز جو دانیال حسن ان کے آفس آئے تھے، وہ ان کی بیٹی ہے، اور پھر ان سے دانیال حسن کے بارے میں پوچھے۔ لیکن اس کے بعد اپنی پوزیشن سوچ کر وہ نفی میں سر ہلا

کر بولی تھی۔

”جانتا نہیں سر.....! میں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا۔ میری پیدائش سے پہلے ہی وہ دوسری شادی کر کے

باہر چلے گئے تھے۔“

”اوہ.....! اور کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے؟“

انہوں نے انہوس کے اظہار کے ساتھ پوچھا۔

”کوئی نہیں سر.....!“

سیدھا سادا جواب تھا۔ علی احمد کچھ دیر اسے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے۔

”تم بہت بہادر لڑکی ہو، یقیناً اپنی ماں کی طرح۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہہ دینا۔“

”تھینک یوسر.....!“

وہ قصداً مسکرائی تھی۔

اور اس شام گھر آتے ہی وہ الماری میں سے دانیال حسن کی تصویر نکال کر دیکھنے لگی۔ ان سے بات

کرنے کے بعد اب اس کا دل ان سے ملنے کو مچھلنے لگا تھا۔ تصویر میں جس طرح دانیال اور ثانیہ کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایسے ہی وہ بھی مسکرانے لگی کہ اچانک ثانیہ کی پکار پر اس نے بوکھلا کر الماری تو بند کر دی، لیکن تصویر ہاتھ میں رہ گئی۔

”یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

ثنانیہ نے یوں ہی پوچھا تھا۔

”یہ..... میں..... یہ دیکھ رہی تھی۔“

اس نے تصویر دکھائی تو ثانیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

”اصل میں امی.....! میں نے ابھی کچھ دن پہلے ایسا ہی چہرہ دیکھا تھا۔ شاید یہی تھے۔“

اس کی توجہ پر ثانیہ نے سر دلچھے میں پوچھا تھا۔

”کہاں دیکھا تھا؟“

”بھیسٹر میں، میرا مطلب ہے، آفس جاتے ہوئے لوگوں کی بھیسٹر میں نظر آئے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے دانیال یہیں ہیں؟“

ثنانیہ کی خود کلامی سن کر اس نے فوراً بے نیازی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

”کہیں بھی ہوں، ہمیں کیا.....؟ کوئی فرق نہیں پڑتا ہمیں امی.....! وہ اگر اپنی دنیا میں خوش ہیں تو ہم

بھی سکون سے ہیں۔ اتنے برسوں میں انہیں اگر ہمارا خیال نہیں آیا تو ہم کیوں پرواہ کریں؟“

”کیا واقعی تمہیں پرواہ نہیں ہے؟ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا اپنے باپ سے ملنے کو؟“

ثنانیہ نے یک دم اس پر گرفت کی تھی۔ وہ ڈھمکے۔

”امی.....!“

ثنانیہ کے سینے میں منہ چھپا کر وہ سسک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسے جب ثانیہ کے سونے کا یقین ہو گیا، تب وہ بہت احتیاط سے اٹھی تھی اور دبے پاؤں کمرے سے نکل کر شوبی کے کمرے میں جھانکا اور اسے اسٹوڈیو ٹیبل پر بیٹھے دیکھ کر اندر داخل ہوئی تو آہٹ پر شوبی نے چونک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”وہ..... تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

اس نے کہا تو شوبی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا بات؟“

”پہلے وعدہ کرو، تم امی سے نہیں کہو گے۔“

اس کی بات پر شوبی مشکوک ہو گیا۔

”ہیں.....؟ ایسی کیا بات ہے جو تم خالہ سے چھپا رہی ہو.....؟“

”بس.....! ہے ایک بات، تم وعدہ کرو ناں.....!“

وہ زچ ہوئی۔ شوبی لٹی میں سر ہلانے لگا۔

”پہلے بات بتاؤ.....!“

”شوبی.....! اچھا تمہیں میری قسم، کسی کو مت بتانا۔“

”اتنا تجسس کیوں پھیلا رہی ہو.....؟ میں خالہ کو بلاتا ہوں، خا.....“

شوبی نے منہ کھولا تھا کہ وہ اس کے بازو پر منگھا کر بولی۔

”پاگل ہو گئے ہو.....؟ سوری ہیں امی۔“

”اور تانا بابا.....؟“

”وہ بھی سوری ہیں۔“

”تو پھر جاؤ صبح بات کریں گے۔“

شوبی واپس ٹیبل پر جا بیٹھا۔

”نہیں.....! میں ابھی بات کروں گی، ورنہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔“

وہ چار حاندا انداز میں شوبی کے پاس آئی تو وہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر بولا۔

”جو کہتا ہے، جلدی کہو.....!“

”وہ بات یہ ہے کہ میں نے اپنے پاپا کو دیکھا ہے۔“

وہ روانی سے شروع ہو گئی۔

”بہت قریب سے دیکھا ہے اور مجھے ان کا نمبر بھی مل گیا تھا، پھر میں نے انہیں فون بھی کیا تھا، لیکن ان کی بات نہیں سنی۔“

”پھر؟“

”پھر تم بتاؤ، میں کیا کروں؟“

وہ الجھتی تھی اور اس کی الجھن سمجھتے ہوئے ہی شوبی کہنے لگا۔

”کرنا کیا ہے؟ اگر تمہارا دل اپنے پاپا سے ملنے کو چاہتا ہے تو ضرور ملو۔“

”دل تو چاہتا ہے شوبی! لیکن میرے اندر یہ خوف بھی ہے کہ ان کے دوسرے بچوں کے سامنے میں نظر انداز ہو جاؤں گی۔ تب مجھے زیادہ دکھ ہوگا۔“

وہ آزرگی میں گھر گئی تھی۔

”تو پھر انتظار کرو۔ میرا مطلب ہے، اگر انہیں تم سے ملنے کی ترپ ہوگی تو وہ خود تمہارے پاس آئیں گے۔“

شوبی نے کہا تو وہ بے بسی سے پوچھنے لگی۔

”کیسے آئیں گے؟ انہیں تو پتا ہی نہیں ہے کہ ہم کہاں رہتے ہیں؟“

”یہ پتا کرنا ان کا کام ہے۔ ان کی لگن جی ہوگی تو وہ ضرور تم تک پہنچ جائیں گے، کبھی؟“

شوبی نے دھیرے سے کہا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

”چلو اب جاؤ، خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔“

شوبی کہنے کے ساتھ اسے دھکیلتے ہوئے دروازے تک لے آیا تو وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”جاؤ شاہاش!۔“

مزید شوبی نے اسے پکار کر باہر نکالا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔

”اف! اللہ کرے۔“

وہ منہ ہی منہ میں اسے کوستے ہوئے اپنے کمرے میں آئی اور دم سے اپنی جگہ پر بڑھ گئی تو ثانیہ نے جو سختی انداز میں اٹھ کر جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور اب یوں آتے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی تھی اور اسے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی بے خبر کیسے رہی؟

”میں یہ کیسے بھول گئی کہ شوبی میرا بیٹا نہیں ہے۔ نہ مشعال اس کی لگن بہن ہے۔ کبھی سوچا ہی نہیں میں نے کہ یہ دونوں اب بڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے ان پر نظر رکھنی چاہئے۔ خدا غواستہ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو؟“

ثانیہ بے حد خائف ہو گئی تھی۔ درزیدہ نظروں سے مشعال کو دیکھا، وہ سو گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے ٹینڈر اُڑ چکی تھی۔ صبح وہ پڑمرہ سی روزمرہ کے کام نہتا رہی تھی کہ خواجہ صاحب نے اسے پکار کر پوچھ لیا۔

”ثانیہ! تم مجھے پریشان لگ رہی ہو بیٹا! کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں ابا!۔۔۔۔۔! بس ایسے ہی میں مشعال اور شوبی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

وہ بے دھیانی میں سچ بول گئی۔

”مشعال اور شوبی؟“

خواجہ صاحب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”ہاں ابا!۔۔۔۔۔!“

وہ ایک دم ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”میں یہ سوچ رہی تھی ابا! کہ مشعال کی شادی شوبی کے ساتھ بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”بالکل ہو سکتی ہے، اگر مشعال اور شوبی کی مرضی ہو تو۔“

خواجہ صاحب نے تائید کے ساتھ کہا تو وہ فوراً بولی۔

”کیوں نہیں ہوگی مرضی؟ ساتھ لپے بڑھے ہیں، ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کے

بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔“

”ہوں!۔۔۔۔۔!“

خواجہ صاحب سوچنے لگے تو وہ ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ابا!۔۔۔۔۔! آپ رابعہ سے بات کریں ناں۔“

”ہاں!۔۔۔۔۔! رابعہ سے بھی بات ہو جائے گی، پہلے شوبی اپنے پیروں پر تو کھڑا ہو جائے۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو وہ بے صبری سے بولی۔

”ہو جائے گا ابا!۔۔۔۔۔! امتحان دے لے تو پھر جاب ہی کرے گا ناں۔“

”جاب اتنے آرام سے تو نہیں مل جاتی بیٹا! پھر ابھی تو تم نے شوبی کو بھئی جانے پر اکسا دیا ہے۔“

اگر اس کا وہاں دل لگ گیا تو پھر واپس نہیں آئے گا۔“

”تو کیا ہوا ابا!؟ شادی ہو جائے تو پھر مشعال بھی اس کے ساتھ ہی چلی جائے گی۔“

وہ گویا تہیہ کر چکی تھی۔ خواجہ صاحب اثبات میں سر ہلانے لگے۔

☆ ☆ ☆

وہ کچھ سوچ کر ہی خاصے خراب حلیے میں سارہ کے پاس آیا تھا اور وہ بھی خاصا لیٹ، جب ہی وہ اسے

دیکھتے ہی بگڑ گئی۔

”حد ہے شامی! کن کاموں میں اُلجھے ہوئے ہو تم؟ کیا مجھ سے زیادہ اہم ہیں تمہارے

کام؟“

وہ افسردہ شکل بنا کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

”پھر سیل کیوں آف کر رکھا تھا؟ اور یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ مائی گاڈ شامی! لوز کلاس کے فضول سے لڑ کے لگ رہے ہو۔“

سارہ نے اس کے حلیے پر سر پیٹ کر کہا تو وہ اسی افسردگی سے بولا۔

”بس! اُدعا کرو، بھکاری بننے کی نوبت نہ آئے۔“

”کیا مطلب؟“

سارہ بنور تیز تھی۔

”مطلب یہ میری جان! کہ میرے ڈیڈی نے مجھے اپنے بزنس سے الگ کر دیا ہے۔“

اس نے بتایا تو سارہ کو شک لگا تھا۔

”کک! کیا؟ مگر کیوں؟“

”کیونکہ تم مجھے کام نہیں کرنے دیتی۔ آفس ٹائم میں بلائی ہو۔ نہ آؤں تو ناراض ہو جاتی ہو اور تمہاری

ناراضگی کے ڈر سے میں کام چھوڑ کر بھاگا چلا آتا ہوں۔ ڈیڈی میرے روز روز کے بہانوں سے تنگ آ گئے تھے۔ آخر

انہوں نے مجھے نکال ہی دیا۔ خوش ہو جاؤ اب تم۔ اب میرا سارا وقت تمہارے لئے ہے۔“

وہ پھٹ پڑا تھا۔

”اسی لئے میں کہتی تھی کہ شادی کر لو۔“

سارہ نے چیخ کر کہا تو وہ سانس کھینچ کر بولا۔

”ہاں! اب تو یہی کرنا پڑے گا۔ چلو ابھی کر لیتے ہیں شادی۔“

”کیا؟“

وہ چیخی تھی۔

”میں کچھ کرتا جو نہیں ہوں۔ آفس ٹائم میں کام چھوڑ کر تمہارے پاس آ جاتا ہوں۔ میں کیا کروں؟“

جب تک تمہیں دیکھ نہ لوں، میرا دن ہی نہیں گزرتا۔“

اس نے مسکین شکل بنائی تو سارہ شپٹا گئی۔

”وہ تو ٹھیک ہے شامی! لیکن کام بھی تو ضروری ہے۔“

”ہاں! کام بھی کروں گا۔ میں نے ابھی سے جاب کی کوشش شروع کر دی ہے۔“

”جواب؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے؟ آئی مین، تمہارے ڈیڈ کا

ایسا بڑا بزنس ہے۔“

سارہ نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”ہاں! لیکن ڈیڈ کا ہے ناں، میرا تو نہیں۔“

”تمہارا کیوں نہیں؟ تمہارے ڈیڈی کا سب کچھ تمہارا ہی ہو گا ناں۔ اب نہیں تو.....“

اس کے دیکھنے پر سارہ بوکھلا کر خاموش ہو گئی تھی۔

”بالکل نہیں!.....“

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

”میں اب ڈیڈی سے کچھ نہیں لوں گا۔ وہ کیا سمجھتے ہیں، میں ان کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا.....؟ سب کر سکتا

ہوں، مگر کے دکھاؤں گا۔ پھر تم میرے ساتھ ہو، میرے جینے کے لئے تمہاری محبت ہی کافی ہے۔“

”او نوشامی! تم جذباتی ہو رہے ہو۔ زندہ رہنے کے لئے صرف محبت ہی کافی نہیں ہوتی، پیٹ

کھانے کو مانگتا ہے۔ محبت سے پیٹ نہیں بھرتا۔“

وہ جھنجھلا رہی تھی۔

”اوہو! یہ پیٹ کہاں سے آ گیا؟“

وہ بد مزہ ہو کر بولا تھا۔

”سارا مسئلہ یہی پیٹ کا ہے شامی! اسے ہر حال میں دو وقت کی روٹی چاہئے۔“

سارہ نے زور دے کر کہا، پھر بھی وہ اطمینان سے بولا۔

”ہاں تو دو روٹی کما ہی لوں گا میں۔ آدھی تم کھانا، آدھی میں، یا ساری تم ہی کھا لینا، خوش؟“

”شٹ آپ!.....“

”کم آن یار! ذرا سوچو، کتنا مزہ آئے گا جب میں دن بھر مزدوری کے بعد تھکا ہارا گھر آؤں تو تم

ماٹ کے پردے کے ساتھ لگی میرا انتظار کر رہی ہوگی، پھر میرے ہاتھ دھلاؤ گی.....“

”اس کے بعد ہم چار پائی پر بیٹھ کر دال روٹی کھائیں گے.....؟“

وہ سلگ کر بولی تھی۔

”واہ! محبت میں دال روٹی شامی دسترخوان کا مزہ دیتی ہے۔“

اس کے مزے پر وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”محبت ہو گی تب ناں.....؟“

”کیا مطلب؟“

وہ ایک دم اسے دیکھنے لگا۔

”بس.....! چھوڑو یہ فضول باتیں اور جا کر اپنے ڈیڈی سے سوری کرو۔“

”وہ نہیں مانیں گے۔“

اس نے مایوسی کا اظہار کیا۔

”تمہیں انہیں منانا ہے شامی.....! کسی بھی طرح، جاؤ۔ مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔ جی انتظار کر رہی ہوں

گی۔ ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔“

وہ آخر میں غلت دکھاتی ہوئی چلی گئی اور وہ کتنی دیر وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

پھر کتنے دن گزر گئے۔ سارہ نے اسے فون ہی نہیں کیا، جس سے وہ خاصا ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ اسے کم از کم

یہ تو پوچھنا چاہئے تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی کو منانے میں کامیاب ہوا ہے کہ نہیں.....؟ یا وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ڈیڈی کو

منانے کی خوش خبری وہ اسے سنانے گا.....؟ وہ ایسی ہی باتیں سوچتا تھا۔ اس وقت وہ بار بار اپنا سیل فون اٹھا کر چیک

کر رہا تھا۔ ملازم چائے کی ٹرے اس کی ٹیبل پر رکھ کر گیا تو اس نے مشعل کو پکار لیا۔

”جی سر.....!“

وہ فوراً متوجہ ہوئی تھی۔

”پلیز.....! چائے بنادیں۔“

اس نے کہا تو مشعل اٹھ کر اس کی ٹیبل پر آگئی، اور کپ میں چائے ڈال کر اس کے سامنے رکھی تو وہ

پوچھنے لگا۔

”میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا.....؟ آئی مین، میرے آفس آنے سے پہلے.....؟“

”نوسر.....! آج تو کوئی فون نہیں آیا۔“

”اچھا.....!“

وہ سوچنے لگا، پھر مشعل کے پکارنے پر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”ایک بات پوچھوں سر.....! آپ برا تو نہیں مانیں گے.....؟“

”نہیں، پوچھیں.....!“

اس نے کہا تو مشعل قدرے جھجک کر بولی۔

”سر.....! وہ.....! آپ کی دوست سارہ..... میرا مطلب ہے، سارہ صرف آپ کی دوست ہے یا اس

سے کچھ زیادہ.....؟“

”آپ کو کیا لگتا ہے.....؟“

اس نے اُنشا مشعل سے پوچھا تو اب وہ سہولت سے بولی تھی۔

”سر.....! مجھے لگتا ہے، آپ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا ہی ہے ناں سر.....؟“

”ایسا ہی ہے۔“

وہ مسکرایا تھا۔

”پھر دیر کیوں کر رہے ہیں سر.....؟ میرے خیال میں آپ کے ساتھ کوئی پرابلم تو نہیں ہو سکتی.....؟“

مشعل نے کہا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔

”سب سے بڑی پرابلم، میرے ڈیڈی نہیں مان رہے۔ انہیں لگتا ہے، سارہ اچھی بیوی نہیں بن سکتی اور

انہیں یہ بھی لگتا ہے کہ سارہ کو مجھ سے نہیں، میرے اٹینٹس سے پیار ہے۔“

”آپ کو کیا لگتا ہے.....؟“

مشعل نے بے ساختہ پوچھا اور اس کے دیکھنے پر گڑبڑا گئی تھی۔ شامان نے چائے کا کپ رکھ کر ٹائم

دیکھا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹائم آف ہو گیا۔ چلیں میں آپ کو بھی ڈراپ کر دوں گا۔“

”جی.....؟“

وہ خائف ہو گئی۔

”چلیں مشعل.....! باقی باتیں راستے میں کریں گے۔“

اس کے دو تانہ انداز پر مشعل اُٹھتے ہوئے اپنا بیگ اٹھا کر اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔ پھر راستے میں

اسے ہی بات شروع کرنی پڑی۔ وہ جانے کس سوچ میں تھا.....؟

”سر.....! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”کون سی بات کا.....؟“

”وہی جو آپ کہہ رہے تھے کہ سارہ آپ سے نہیں، آپ کے اٹینٹس سے پیار کرتی ہے۔ میرا مطلب،

میا آپ کو بھی ایسا ہی لگتا ہے.....؟“

وہ اپنی بات ڈہرا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”نہیں.....! مجھے ایسا نہیں لگتا، اور میں اپنے ڈیڈی پر ثابت کر دوں گا کہ سارہ کو مجھ سے محبت ہے۔“

اس کے ٹھوس لہجے میں عزم جھلک رہا تھا۔

”کیسے ثابت کریں گے.....؟“

وہ پوچھے بغیر رہ نہیں سکی تو جانے کس خیال سے وہ اپنے آپ مسکرایا، پھر بولا تھا۔

”میں نے سارہ سے کہا ہے کہ مجھے ڈیڈی نے اپنے بزنس سے الگ کر دیا ہے۔“

”ایسا کیوں کہا آپ نے.....؟“

اب یہ سب جاننا اس کی مجبوری تھی۔

”یہ دیکھنے کے لئے کہ سارہ کو میری پرواہ ہے یا ڈیڈی کی دولت کی؟“

اس نے بتایا تو وہ اپنی جگہ جزبہ ہو کر بولی۔

”یہ آپ نے اچھا نہیں کیا سر.....!“

”کیوں.....؟“

شامان نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”کیونکہ اگر آپ کے ڈیڈی کی بات سچ ہوگی تو آپ کو بہت دکھ ہوگا۔ مشعال نے کہا تو وہ ایک دم گاڑی

کو بریک لگا کر بولا۔

”نہیں.....! مجھے دکھ نہیں ہوگا۔“

”دکھ نہیں ہوگا.....؟“

وہ حیرت اور افسوس میں گھر گئی۔

”جس کی محبت پر آپ اتنا بھروسہ کر رہے ہیں، وہ اگر آپ کی آزمائش پر پوری نہ اُترتی تو آپ کو دکھ

نہیں ہوگا.....! اپنی محبت ہار جانے کا دکھ بھی نہیں ہوگا.....؟ اس کا تو یہ مطلب ہوا سر.....! کہ آپ کا اپنا دل محبت

سے خالی ہے اور جہاں سر سے محبت ہی نہیں ہے، وہاں آزمائش کیسی.....؟ برامت ماننے کا سر.....! میں تو یہ کہہ

ہوں کہ سارہ سے تعلق توڑنے کا الزام آپ اسی کے سر رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسا مت کیجئے۔ اسے آزمانے سے پہلے

اپنے دل میں جھانک لیں۔“

وہ بولتی چلی جا رہی تھی اور وہ سنائے میں اسے دیکھنے لگا کہ اچانک مشعال نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا،

پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر بولی۔

”یہاں سے میرا گھر قریب ہے، میں چلی جاؤں گی۔“

پھر اترنے سے پہلے اسے دیکھ کر بولی تھی۔

”ایک بات اور، جیت کا مزہ تب ہی آتا ہے شامان علی.....! جب بار جانے کا ڈر بھی ہو۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اتر کر تیز قدموں سے اپنی سمت چل پڑی۔ شامان علی نے تب تک اس پر

نظریں نہیں بنائی تھیں، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

دانیال حسن اتنے برس بن باس کاٹ کر اب وطن واپس لوٹے تھے۔ درمیان میں ایک بار ان کا آنا

تھا، وہ بھی اپنے بھائی کمال حسن کی ناگہانی وفات پر، اور اس وقت انہوں نے سوچا تھا کہ ایسے وقت میں ان کی

میرا اور بچوں کو ان کی ضرورت ہوگی۔ لیکن سیدھا کو اب ان سے کوئی غرض نہیں تھی۔

اس لئے اس نے ایسا رویہ روا رکھا تھا کہ وہ بمشکل مہینہ بھر ہی ٹھہر سکے تھے اور اس دوران انہوں نے

قہوڑی بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح ٹائیپ تک رسائی ہو جائے، لیکن شاید ان کی قسمت میں ہی نہیں تھا جو وہ مایوس

لوٹ گئے تھے۔

اور اب وہ مستقل طور پر باہر کی دنیا کو خیر باد کہہ آئے تھے تو یہاں اپنا کوئی نہیں تھا۔ ان کا آبائی گھر بھی

میرا فروخت کر کے بچوں کے ساتھ جانے کہاں جا رہی تھی.....؟ کتنے پاسوں سے اس سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ جب

تک وہ اسی گھر میں تھی، وہ اس کے رُویے سے دل برداشتہ ہونے کے باوجود اپنا فرض سمجھ کر مہینے میں ایک دو بار فون

کر کے اس کی اور بچوں کی خیریت معلوم کر لیتے تھے۔ پھر اسی گھر کے نمبر سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ گھر کسی اور کا ہو

چکا ہے تو اس کے بعد سے ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔

بہر حال یہاں آ کر پہلے تو وہ اپنے لئے رہائش کے انتظام میں لگے رہے تھے، اور جب ٹھکانہ ہو گیا، تب

نئے سرے سے ٹائیپ اور خواجہ صاحب کو تلاش کرنے کے ساتھ بزنس کے سلسلے میں پرانے دوستوں سے رابطہ کرنے

میں لگ گئے۔ علی احمد کے آفس بھی وہ بزنس کے سلسلے میں ہی گئے تھے اور انہیں پتا بھی نہیں چلا تھا کہ جن کی کشش

انہیں دوبارہ وطن کھینچ لائی ہے، وہ ان کے اتنے قریب ہو سکتی ہے۔

اور پھر مشعال کے فون نے تو ان کی اندر کی دنیا تہہ بالا کر دی تھی۔ اتنے برسوں میں وہ اس کرب سے

نہیں گزرے تھے جس سے اب دوچار تھے۔ تم یہ تھا کہ وہ اپنی پہچان کروا کر خاموش ہو گئی تھی۔ وہ دن میں کتنی بار

اسے فون کرتے تو ادھر یا تو اس کا سیل آف ملتا یا نیل جاتی تھی تو وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ اس وقت بے مقصد

ڈرائیو کرتے ہوئے وہ دل شکستگی سے سوچ رہے تھے۔

”میری بیٹی نے مجھے ڈھونڈ لیا، میں اسے کہاں ڈھونڈوں.....؟ وہ میرا فون بھی ریسیو نہیں کر رہی۔

لیکٹ.....؟ ہاں، مجھے اسے نیکٹ بھیجنا چاہئے۔ اوگا.....! یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا.....؟“

انہوں نے فوراً سیل فون نکال کر میسج ٹائپ کر کے سینڈ کیا تھا۔

”مشعال بیٹا.....! ایک بار مجھ سے، اپنے باپ سے مل لو۔“

☆.....☆.....☆

خواجہ صاحب فون پر رابعد سے بات کر رہے تھے۔ ٹائیپ بڑے شوق سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ جب انہوں

نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کیا تو وہ کھنگی سے بولی۔

”ابا.....! آپ نے رابعد سے بات تو کی نہیں۔“

”کیا بات.....؟“

خواب صاحب نے نا سمجھنے کے انداز میں اسے دیکھا تو وہ جھنجھلا گئی۔

”لیجئے! اتنی جلدی بھول گئے؟ ابھی اس دن تو میں نے کہا تھا کہ راجہ سے مشعال اور شوبی کی بات کریں۔“

”ہاں! وہ تو مجھے یاد ہے۔“

”پھر آپ نے راجہ سے کہا کیوں نہیں؟“

اس کے شامی ہونے پر خواب صاحب اسے ٹوک کر کہنے لگے۔

”تمہیں اتنی جلدی کیا ہے؟ پہلے بچوں سے تو پوچھ لو، اور صرف بچوں ہی سے نہیں، ان کے باپوں

تک بھی بات پہنچانی پڑے گی۔“

”باپوں تک؟“

اسے جیسے کرکٹ لگا تھا۔

”ہاں! عباد اور دانیال، بچوں کی زندگی کے فیصلے ان کے بغیر نہیں ہو سکتے۔ تم نے اگر مشعال اور

شوبی کو پال پوس کر بڑا کر دیا، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب صرف تم ہی ان کی ولی وارث ہو، اور اپنے سر پر جو

چاہو کی کرو گی۔ ایسا تو میں بھی نہیں سوچتا۔“

خواب صاحب نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ابا! عباد، دانیال۔ انہوں نے بچوں کے کون سے حقوق پورے

کئے ہیں جو آپ ان کا حق جتا رہے ہیں؟“

”جتنائیں رہا، سمجھا رہا ہوں تمہیں۔ دیکھو بیٹا! ابھی تو یہ گھر کی بات ہے۔ فرض کرو، اگر مشعال کی

شادی غیروں میں کرنی پڑے، تب اس کے باپ کا پوچھا جائے گا کہ نہیں؟ یا تم اسی ڈر سے چاہ رہی ہو کہ بس فوراً

مشعال کی شادی شوبی کے ساتھ ہو جائے؟“

خواب صاحب کی آخری بات نے اسے پریشان کر دیا۔

”نہیں ابا! مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں ہے۔ مشعال کا باپ کوئی چورا چکا نہیں ہے، جس کے بارے میں

بتاتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہو۔“

”پھر کیا بات ہے جو یوں اچانک تم پر بچوں کی شادی سوار ہو گئی ہے؟“

خواب صاحب ہنوز نرم تھے۔

”اب میں آپ کو کیا بتاؤں ابا! مجھے عجیب واہموں نے گھیر لیا ہے۔“

وہ اپنے آپ میں اُلٹھ کر بولی تھی۔

”کیسے واہ ہے؟“

”جانتی نہیں!۔“

وہ زچ ہو کر ان کے پاس سے اُٹھ آئی اور کچھ کچھ میں نہیں آیا تو مشعال کو پکڑ لیا۔

”مشعال! میری بات سنو!۔“

”جی امی!۔“

مشعال پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”بیٹا! اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ تمہیں خیال کرنا چاہئے۔“

اس نے کہا تو مشعال سادگی سے پوچھنے لگی۔

”کس بات کا امی؟“

”ہر بات کا۔“

پھر نظریں چرا کر بولی۔

”اور یوں وقت بے وقت منہ اٹھا کر شوبی کے کمرے میں نہ چلی جایا کرو۔“

”امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

مشعال کو حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوا۔

”غلط نہیں کہہ رہی ہوں میں۔ تمہیں خود احساس ہونا چاہئے۔ بچی نہیں ہو اب تم!۔“

اس کے گھڑنے پر مشعال چڑ گئی۔

”پتا ہے، بڑی ہو گئی ہوں میں اور آپ بھی بوڑھی ہو گئی ہیں، جب ہی اُلٹا سیدھا سوچنے لگی ہیں۔ حد

ہے، شوبی کے کمرے میں نہ جاؤں، کھا جائے گا وہ مجھے؟“

آخر میں مشعال سر جھٹک کر اپنے آپ بولتے ہوئے چلی گئی تو وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ تھک گیا تھا۔ اس کی سماعتیں جھنجھٹ گئی تھیں جن میں مسلسل مشعال کی باتیں گونج رہی تھیں۔

”برامت ماننے کا سر! میں تو یہ سمجھی ہوں کہ سارہ سے تعلق توڑنے کا الزام آپ اسی کے سر رکھنا

چاہتے ہیں۔ ایسا مت کیجئے گا سر! اسے آزمانے سے پہلے اپنے دل میں جھانک لیں۔“

”اور پھر؟“

”جیت کا مزہ تب ہی آتا ہے، جب ہار جانے کا ڈر بھی ہو۔“

اور اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ مسلسل تین دنوں سے خود کو ٹٹول رہا تھا، اور پھر ایک نتیجے پر پہنچ کر ہی اس

نے خود سارہ کو فون کیا تھا اور اسے اس کی فیورٹ جگہ پر پہنچنے کا کہہ کر خود بھی وہیں پہنچ گیا تو پہلے مرطے پر ہی اس کی

آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”ایک بات بتاؤ سارہ..... تمہارے اندر ہارنے کا ڈر ہے؟“

”کیا مطلب؟ صاف بات کہو، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

سارہ جو یہ سننے کو بے چین تھی کہ اس نے اپنے ڈیڑی کو منالیا ہے، اس بات پر الجھ کر بولی تھی۔

”صاف بات ہی تو کر رہا ہوں۔ کیا تمہیں یہ خیال پریشان نہیں کرتا کہ اگر میں تمہیں نہ ملا تو کیا

ہوگا؟“

اس کی وضاحت پر سارہ چڑ کر بولی تھی۔

”نہیں..... میں ایسی فضول باتیں نہیں سوچتی۔“

”کیوں نہیں سوچتی؟ محبت میں ایسے اندیشے تو ہوتے ہیں۔ ملنے سے پہلے تجھڑنے کا خوف، اس

کے بعد ہی تو ملنے کا مزہ آتا ہے۔“

پھر جیسے وہ کھو گیا تھا۔

”جیت کا مزہ تب ہی آتا ہے، جب ہار جانے کا ڈر بھی ہو۔“

”آف شامی.....! بس کرو۔ کون سی دنیا میں رہنے لگے ہو تم؟“

سارہ نے جھنجھلا کر کڑک تو چوکنے کے ساتھ ہی اس کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

”ہاں.....! شاید وہ کوئی اور سی دنیا ہے جہاں محبت اندیشوں میں پروان چڑھتی ہے۔ بالکل اسی طرح

جیسے کانٹوں کے سچ گلاب۔ میں اس دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔ تم چلو گی میرے ساتھ.....؟“

اس نے آخر میں سارہ کی آنکھوں میں جھانکا، پھر آہستہ سے نفی میں سر ہلا کر گویا ہوا۔

”لیکن نہیں.....! تم نہیں، کیونکہ ہمارے درمیان سب کچھ ہے سوائے محبت کے، اور جو دل محبت سے

خالی ہوں، وہ زیادہ دُور تک ساتھ نہیں چل سکتے۔“

”یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہارا مجھ سے دل بھر گیا ہے۔ کوئی اور بھاگتی ہے تمہیں جس نے محبت کی جھوٹی

جی داستانیں سنا کر تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔“

سارہ بڑی طرح تملال گئی تھی۔ وہ ہونٹ بھیجنے کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو وہ اس کا بازو کھینچ کر بولی۔

”سچائی سے منہ کیوں موڑ رہے ہو شامی.....؟“

”سچائی وہ ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو فریب دے رہے تھے۔ شکر کرو کہ

مجھے کسی برے وقت سے پہلے احساس ہو گیا، ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی۔“

اس نے کہا تو سارہ چیخ پڑی۔

”شٹ آپ شامی.....! تم میری تو بین کر رہے ہو۔“

”نہیں.....! مجھے اگر تمہاری تو بین کرنی ہوتی تو آزمائش کی کوئی پر پہلے میں خود کو نہ رکھتا۔ آرام سے

الزام تمہارے سر رکھ دیتا کہ تم میرے ساتھ فخر نہیں ہو۔ تمہیں مجھ سے نہیں، میرے انٹینس سے پیار ہے۔“

وہ بہت ضبط سے بول رہا تھا۔

”تمہارا انٹینس.....؟ کیا ہے تمہارا انٹینس.....؟ اپنے ڈیڑے سے ہٹ کر تم کیا ہو.....؟“

سارہ نے چپستے ہوئے لہجے میں طنز کیا، تب بھی وہ آرام سے بولا تھا۔

”کچھ بھی نہیں.....! ڈیڑے سے ہٹ کر میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ تو بتاؤ، اب تمہیں میرا ساتھ منظور

ہے.....؟“

سارہ ایک دم چکر اگئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

”حت..... تم تو پاگل ہو۔“

یہ کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تو اس نے اسے دُور تک جاتے ہوئے نہیں

دیکھا، فوراً اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی راہ لی تھی۔ اب اسے ادھر ادھر نہیں بھٹکانا تھا۔ کچھ پانے کے لئے کھونا بھی پڑتا

ہے۔ سب سے پہلے شخصی آزادی، اور اس کے لئے وہ خود کو تیار کر رہا تھا۔

پھر اسی رات اس نے ایک آخری کوشش بھی کی۔ اپنے دل کی ساری گلیاں کھگال ڈالیں کہ کہیں سارہ کی

محبت تو نہیں گرلا رہی یا اس کے اندر کوئی ملال۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ گویا وہی سچ تھا کہ اس کے اور سارہ کے سچ

سب کچھ تھا، سوائے محبت کے۔

بہر حال وہ اطمینان سے ہو گیا اور پھر جس نے اسے اپنے اندر جھانکنے پر اکسایا تھا، اسے اپنا کارنامہ

سنانے کے لئے صبح وہ بہت جلدی آفس پہنچ گیا۔ اس وقت مشعل نہیں آئی تھی۔ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کس وقت

آتی ہے۔ وہ تو جب بھی آیا، اسے موجود ہی پایا۔ آج پہلی بار وہ اس سے پہلے موجود تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ پتا

نہیں لیٹ ہو گئی تھی یا اس کا نا تم ہی یہی تھا کہ دس بجے وہ درم میں داخل ہوئی تو وہ بے اختیار اپنی ریٹ وائچ پر نا تم

دیکھنے لگا۔

”سوری سر.....! میں آج کچھ لیٹ ہو گئی ہوں۔“

مشعل اس کے نا تم دیکھنے سے یہی سمجھی کہ وہ اس پر لیٹ ہونا جتا رہا ہے۔

”کچھ نہیں، بہت زیادہ.....!“

وہ اسے دیکھ کر بولا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اور آفس Ruil کے مطابق لیٹ آنے والے کو سزا دی جاتی ہے۔“

”جی.....؟“

وہ قدرے خائف ہو گئی تھی۔

”جی! اب آپ بتائیں، کیا سزا دی جائے آپ کو۔“

وہ بظاہر ہر سنجیدہ تھا۔ مشعال خاموش رہی تو خود ہی کہنے لگا۔

”چلیں، میں خود آپ کی سزا تجویز کرتا ہوں۔“

”سوری سر!“

”نوسوری! آپ کی سزا ہے دوستی۔“

اس نے کہہ کر ایک دم مشعال کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تو وہ قدرے پریشانی سے اس کے بندھے ہوئے

ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

”چلیں، اگر آپ مجھ سے دوستی نہیں کرنا چاہتے تو۔۔۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے مشعال نے اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ سکرا کر بولا۔

”تھیک یو۔۔۔ اب آپ بیٹھے گا نہیں، میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ جانے کیا سوچ چکا تھا، اسے حیران چھوڑ کر غلبت میں روم سے نکلا اور علی احمد کے روم میں داخل ہوا تو

وہ اسے دیکھتے ہی بولے۔

”کیا ہوا۔۔۔ کیا پھر باہر کا کوئی کام یاد آ گیا تمہیں۔۔۔؟“

”کام تو نہیں ڈیڈ۔۔۔ وہ۔۔۔ بس مشعال کو اپنے ساتھ لے چلے جانا چاہتا ہوں۔“

اس نے سہولت سے کہا تو علی احمد کی ہنسیوں اور اڑتھ گئیں۔

”کیوں۔۔۔؟ مشعال کو کیوں۔۔۔؟“

”میری مشعال کے ساتھ دوستی ہو گئی ہے ڈیڈ۔۔۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”میں جانتا ہوں، مشعال اچھی لڑکی ہے۔“

علی احمد کا لہجہ آفیشل تھا۔

”پھر آپ منع کیوں کر رہے ہیں۔۔۔؟“

”میں نے کب منع کیا ہے۔؟ ہاں، مشعال سے پوچھ لو۔ وہ جانا چاہے تو تھیک ہے۔“

انہوں نے کہا تو اس پر پھر غلبت سوار ہو گئی۔

”تھیک یو۔۔۔!“

وہ ”تھیک یو“ کہتے ہوئے تیزی سے نکلا تھا۔ علی احمد کے چہرے پر مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

شوہنی نے روہی سے کہا تھا کہ وہ اسے یونیورسٹی سے پک کرے گا اور اس وقت وہ وہیں جانے کے لئے

نکل رہا تھا کہ ثانیہ نے پکار لیا۔

”شوہنی!“

”جی خالہ۔۔۔!“

وہ پلٹ کر ثانیہ کے پاس آ گیا۔

”یہاں میرے پاس بیٹھو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

ثانیہ نے صوفے پر اپنے قریب ہاتھ مار کر کہا تو وہ ٹائم دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔

”جی خالہ۔۔۔! کہئے کیا بات ہے۔۔۔؟“

”وہ۔۔۔ بیٹا۔۔۔! میں تم سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تم اپنے ابو سے ملتے ہو۔۔۔؟“

ثانیہ نے کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”جی۔۔۔! بچے میں ایک بار ملنے چلا جاتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔! مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔؟ اچھی بات ہے، ضرور ملا کرو، اور ہاں! مجھے ان کا فون

نمبر دو، تمہارے تانا بابا بات کریں گے۔“

ثانیہ نے اسے حیرت میں ڈال دیا۔

”تانا، ابو سے بات کریں گے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔! کہہ تو رہے تھے۔“

”کیا کہہ رہے تھے تانا بابا۔۔۔؟ ابو سے کیا بات کرنی ہے انہیں۔۔۔؟“

اسے یقین نہیں آ رہا تھا یا وہ مشکوک ہو گیا تھا۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس کہہ رہے تھے کہ اب شوہنی کا جو بھی معاملہ ہوگا، اس کے باپ سے پوچھ

کر طے کریں گے۔“

ثانیہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

”میں سمجھا نہیں خالہ۔۔۔! میرا کون سا معاملہ ہے۔۔۔؟“

وہ ابھی اور ثانیہ جھنجھلا گئی۔

”ارے۔۔۔! کوئی ایک معاملہ ہے، تمہاری آگے تعلیم، دینی جانا، بھر شادی۔ ان سارے معاملات میں

تمہارے ابو کی رضامندی بھی شامل ہونی چاہئے۔ یہی کہہ رہے تھے تمہارے تانا بابا۔“

”بس رہنے دیں خالہ۔۔۔! مجھ اکیلی جان کو اتنی جھنجھٹ میں مت پھنسانیں۔ آپ کچھ کہیں گی، تانا بابا

کچھ، اور میرے ابو کچھ اور، پھر میں کسی کی مانوں گا۔۔۔؟ مجھے معاف کریں۔“

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”میرے لئے جو آپ سوچیں گی، مجھے وہی منظور ہوگا۔“
 ”سچ کہہ رہے ہو شوہن!..... میں جو سوچوں گی، جو چاہوں گی.....؟“
 وہ بیک دم ہڑ جوش ہو گئی۔
 ”بالکل.....! آپ کہیں گی، پھانسی چڑھ جاؤ تو چڑھ جاؤں گا۔“
 اس نے کہا تو ثانیہ دہل گئی۔
 ”اللہ نہ کرے۔“ خبردار جو ایسی بدفالیں منہ سے نکالی تو، تو بہ کر۔“
 ”تو بہ تو بہ.....!“

وہ کان پکڑ کر اونچی آواز میں تو بہ کا ورد کرتے ہوئے جیسے جان چھڑا کر وہاں سے بھاگا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ خائف نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا، پھر شہمان کو دیکھ کر کہنے لگی۔
 ”سر.....! آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں.....؟ مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اگر میرے کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو سمجھیں میری جاب ختم۔“
 ”ریٹیکس مشعال.....! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر تمہارا کوئی جاننے والا ابھی گیا تو میں سنبھال لوں گا۔ کہہ دوں گا ہم آفس مینٹگ پر ہیں، اور پلیز.....! اب یہ سر، ور کہنا چھوڑ۔ ہم نے دوستی کی ہے۔ دوستوں میں تکلف نہیں ہوتا، سمجھی.....؟“

اس نے خود تکلف کی دیوار گرا دی تھی۔

”اچھا.....! وہ..... سارہ نہیں آئی.....؟“

اسے یقین تھا کہ وہ اسے سارہ کی وجہ سے ہی یہاں لایا ہے۔

”سارہ کیوں آئے گی.....؟“

شہمان نے کہا تو اس نے نا سمجھی میں پوچھا۔

”کیوں.....؟ آپ نے اسے نہیں بلایا.....؟“

”نہیں.....! سارہ اب کبھی نہیں آئے گی۔“

وہ کہہ کر ویر کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ اُٹھن آئینہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”پوچھو گی نہیں کیوں.....؟“

شہمان نے ویڑے سے فارغ ہو کر اسے دیکھا تو وہ جزبہ ہو کر بولی۔

”نہیں.....! یہ آپ کا پرسنل میٹر ہے۔“

”اس وقت بھی میرا پرسنل میٹر تھا، جب میں سارہ کی آزمائش کرنے جا رہا تھا، پھر تم نے مجھے آئینہ کیوں دکھایا تھا.....؟ یہ کیوں کہا تھا کہ میں پہلے اپنے اندر جھانک لوں.....؟“
 شہمان نے فوراً جتایا تو وہ بھی بے ساختہ بولی تھی۔
 ”تو کیا آپ نے.....؟“
 ”ہاں.....! میں نے اپنے دل کی ساری گلیاں کھگال ڈالیں، کوئی بہت دھیرے دھیرے چل رہا تھا، لیکن وہ سارہ نہیں تھی۔“

”پھر.....؟“

اسے اپنی آواز دُور سے آتی ہوئی لگی تھی۔

”کیا پھر.....؟“

شہمان نے اسے اپنی نظروں کی گرفت میں لیا تو وہ شپٹا گئی۔

”میرا مطلب ہے، آپ نے سارہ سے کیا کہا.....؟“

”یہی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے، اس لئے ہم زندگی کے ساتھی بھی نہیں بن سکتے۔“

قصہ ختم.....!“

شہمان نے یوں ہاتھ اٹھائے جیسے قصے کے ساتھ اب یہ موضوع بھی ختم ہو جانا چاہئے، اور وہ سمجھ کر خاموش ہو گئی۔ لیکن اس کے اندر عجیب سا شور اُٹھنے لگا تھا۔ پھر اس کے لئے وہاں ٹھہرنا دو بھر ہو گیا۔

”میں چلوں گی سر.....! آئی ایم سوری، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ کہنے کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہو گیا ہے مشعال.....؟ اچھا ٹھہرو، میں آرڈر کینسل کروا کے آتا ہوں، پھر تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔“

وہ اس کے چہرے کی بدلتی رنگت سے پریشان ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

”نوسر.....! آپ زحمت نہ کریں، میں چلی جاؤں گی۔“

وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل آئی اور اس سے پہلے کہ شہمان آرڈر کینسل کروا کر آتا، وہ رکشہ میں بیٹھ چکی تھی۔ گھر آتے ہی وہ واش روم میں بند ہو گئی۔ اس کا دل چیخ چیخ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ واش بیسن کا ٹیپ کھولنے کے ساتھ اس نے آنسوؤں پر بندہ بند بھی توڑ ڈالے، تو پھر اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سے یہاں کھڑی ہے۔ جب آنسو خود ہی ختم گئے، تب اس نے منہ پر پانی کے چھپکے مارے اور ٹیپ بند کر کے واش روم سے نکل آئی۔ سامنے تو لیوئر نہیں آیا تو الماری کھول کر دوسرا تو لیوئر نکال رہی تھی کہ ثانیہ پکار کر پوچھنے لگی۔

”مشعال.....! الماری میں کیا تلاش کر رہی ہو.....؟“

”اُف.....!“

اس نے زور سے الماری کا پٹ بند کر دیا اور ثانیہ کو دیکھ کر ناراضی سے بولی۔
 ”کیا ہو گیا ہے امی؟ یہ کیسی فکریں پال لی ہیں آپ نے؟ میں کیا کر رہی ہوں؟ کہاں کھڑی، کہاں بیٹھی ہوں؟ پہلے تو کبھی آپ نے نہیں ٹوکا۔“
 ”تو ابھی کیا کہا ہے میں نے؟ یہی تو پوچھا ہے ناں کہ کیا تلاش کر رہی ہو۔۔۔؟“
 ثانیہ کو بھی غصہ آ گیا۔
 ”کیا تلاش کروں گی میں؟ خزانہ چھپا رکھا ہے ناں آپ نے الماری میں، وہی تلاش کر رہی تھی۔“
 کہیں کا غصہ کہیں نکل رہا تھا۔
 ”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تمہارا۔۔۔؟ یہ کیسے بات کر رہی ہو تم۔۔۔؟“
 ”آپ کی فضول سوچوں سے ہی میرا دماغ خراب ہوا ہے۔“
 وہ سر جھٹک کر جانے لگی کہ ثانیہ نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔
 ”کیا فضول سوچا ہے میں نے؟ بتاؤ۔“
 ”مجھے نہیں پتا۔“
 وہ اپنا بازو چھڑا کر پرے ہٹ گئی، اب اس کا چہرہ دیکھ کر ثانیہ ٹھک گئی۔
 ”کیا ہوا ہے تمہیں؟ روتی رہی ہو کیا؟ کیوں روتی رہی تھی؟ بتاؤ۔“
 اس کی آنکھیں پھر لبریز ہو گئیں۔
 ”آپ کو کیا؟ بس آپ میری فکر نہ کریں۔“
 ”میں تمہاری فکر نہ کروں تو اور کون ہے تمہاری فکر کرنے والا۔۔۔؟“
 ثانیہ نے ڈھک سے اسے دیکھا، پھر یک دم نرم پڑ کر کہنے لگی۔
 ”بیٹا۔۔۔! میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی تھی تم سے، جو تم نے دل پر لگالی۔ ٹھیک ہے، شوبی اور تم ساتھ کھیلے، ساتھ بڑے ہوئے ہو، لیکن اب۔۔۔۔“
 ”اب کیا۔۔۔؟ بتائیں اب کیا ہوا ہے۔۔۔؟“
 اس کے لہجے میں تنفر تھا۔
 ”اب میں تم دونوں کی شادی کا سوچ رہی ہوں۔“
 ثانیہ نے بڑے آرام سے اس کے سر پر ہم دے مارا تھا۔
 ”سک۔۔۔ کیا۔۔۔؟“
 وہ حد درجہ شاکو تھی۔
 ”ہاں۔۔۔! مجھے یہی مناسب لگ رہا ہے کہ میں تم دونوں کی شادی کروں۔“

ثانیہ اپنی دھن میں تھی۔
 ”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی۔۔۔؟ آپ نے یہ سوچا کیسے؟ کہیں بہن بھائی کی شادی بھی ہوتی ہے۔۔۔؟“
 ”سگے بہن بھائی نہیں ہوتے۔“
 ثانیہ نے کہا تو وہ پھٹ پڑی۔
 ”تو یہ بات آپ کو ہمیں پہلے سمجھانی چاہئے تھی، بچپن میں ہی۔ اس وقت تو بس ایک ہی رشتے پر زور تھا۔ بہن بھائی، بہن بھائی۔“
 ”تو بیٹا۔۔۔! معصوم بچوں کے ساتھ ایسی ہی باتیں کی جاتی ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاتا کہ بڑے ہو کر تم دونوں کی شادی ہوگی۔“
 اس کے چہنچہ سے پریشان ہو کر ثانیہ بے چارگی سے بولی تھی۔
 ”بس کریں امی۔۔۔! میں مر جاؤں گی، اگر آپ نے ایسا سوچا بھی۔“
 وہ رو پڑی۔
 ”آپ نے تو مجھے میری نظروں میں گرا دیا ہے۔ شوبی سنے گا تو وہ کتنا ہرٹ ہوگا کہ آپ ہم دونوں پر شک کر رہی ہیں۔“
 ”میں شک نہیں کر رہی ہوں بیٹا۔۔۔! تم۔۔۔ مشعال۔۔۔! تم روتو نہیں بیٹا۔۔۔!“
 ثانیہ اس کے رونے پر پریشان اور بوکھلا بھی گئی تھی۔ آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا تو وہ اور شدت سے رونے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ لیب ٹاپ پر مصروف تھا کہ موبائل کی ٹون نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ لیکن اس نے اپنی مصروفیت ترک نہیں کی اور موبائل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔
 ”ہیلو۔۔۔!“
 ”تم نے میرے ساتھ فاول کھیلا ہے شامی۔۔۔!“
 دوسری طرف سارہ تھی۔
 ”دھوکہ دیا ہے تم نے مجھے، اور یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ دو سال مجھے شادی کی آس میں رکھ کر اب کہتے ہو، ہمارے بیچ سب کچھ سوائے محبت کے۔ محبت نہیں تھی تو میری فون کا لڑپر بھاگ بھاگ کر کیوں آتے تھے۔۔۔؟“
 ”سارہ۔۔۔! دیکھو تم مجھے غلط مت سمجھو۔“

وہ دھیرج سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن سارہ غصے میں تھی۔
 ”میں اب تمہیں صحیح سمجھ چکی ہوں۔ تم ایک نمبر کے فرائڈ ہو اور میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔“
 سارہ نے دھمکی کے ساتھ فون بند کر دیا۔
 ”ہائ سنس!“

اس نے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔ کام سے بھی جی اچاٹ ہو گیا۔ لیپ ٹاپ رکھ کر اس نے ٹائم دیکھا،
 ابھی صرف دس بجے تھے۔ اتنی جلدی نیند آنے والی نہیں تھی۔ لیکن اب کرنے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ اس نے بے دلی سے
 ٹی وی کار میوٹ کنٹرول اٹھایا تھا کہ زوبیہ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر بولی۔
 ”شامی! تمہارے لئے گڈ نیوز ہے۔“

”اچھا!“

وہ بے ساختہ مسکرایا۔

”آجائیں می! کیا گڈ نیوز ہے؟“

”خوش ہو جاؤ۔“

زوبیہ اندر آتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں نے تمہارے ڈیڈی کو منا لیا ہے۔ وہ تمہاری سارہ کے ساتھ شادی پر ایگری ہو گئے ہیں۔“

”کیا؟“

وہ پریشان ہو گیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں می؟“

”وہی جو تم چاہ رہے تھے۔ لیکن تم خوش کیوں نہیں ہوئے؟ پریشان کیوں ہو گئے ہو؟“

زوبیہ اس کی پریشانی سے اُلجھ گئی۔

”کیونکہ مجھے سارہ کے ساتھ شادی نہیں کرنی۔“

اس نے زور دے کر کہا تو زوبیہ کی حیرت فطری تھی۔

”ہیں؟ سارہ کے ساتھ شادی نہیں کرنی؟؟ کل تک تو تم اس کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔“

”کل تک؟؟ کل گزر گئی می! اور کل کے ساتھ سارہ بھی میری زندگی سے نکل گئی۔“

”لیکن کیوں؟؟ میرا مطلب ہے، کیسے؟ کیا اس کی کہیں اور شادی ہو گئی ہے؟؟ ہاؤ

شامی! کیا ہوا ہے؟“

زوبیہ نے مزید اُلجھ کر پوچھا تو وہ اسے کندھوں سے تھام کر بولا۔

”یہ سب چھوڑیں می! یہ بتائیں آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔؟“

”خوشی۔؟“

زوبیہ نے کندھے اُچکائے، جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔

”ہاں! ہے تو خوشی کی بات۔ تم نے مجھے نئی مصروفیت دے دی۔“

”نئی مصروفیت؟“

وہ سمجھا نہیں۔

”ہاں! اب میں تمہارے لئے لوکی تلاش کروں گی۔ لیکن پہلے میں تمہارے ڈیڈی کو بتا دوں۔“

زوبیہ اچانک بڑ جوش ہو کر غلت میں چلی گئی تو وہ کسی خیال سے مسکرایا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہ جاب جاری نہیں رکھے گی اور ابھی بھی اس کا آفس جانے کو بالکل دل
 نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن اسے ریزائن تو دینا تھا، اور یہی سوچ کر کہ آج وہ ریزائن دے آئے گی، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی
 تیار ہو گئی۔ پھر بیک اٹھا کر اس میں کرایہ وغیرہ چیک کر رہی تھی کہ شوبی ہاتھ میں چائے کا کپ لئے آ گیا۔

”آفس جاری ہو۔؟“

”ظاہر ہے، اور کہاں جاؤں گی؟“

وہ اپنی مصروفیت ترک کئے بغیر بولی۔

”ہاں! ظاہر ہے، اور کہاں جاؤں گی؟“

شوبی نے کہہ کر آواز کے ساتھ چائے کا سپ لیا تو وہ منگ کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔؟“

شوبی غالباً اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

”دیکھ رہی ہوں، آج کل تم ہواؤں میں اُڑ رہے ہو۔ کوئی کمال نہیں ہے باپ کے پیسے پر اتارنا۔ خود

کماؤ پھر جو مرضی کرو۔“

وہ اسے بے نقطہ سنا کر باہر نکل آئی۔ اس کے اندر کسی ایک بات کا غصہ نہیں تھا، بہت ساری باتیں تھیں،

جب ہی وہ بات بات پہ تھمتے سے اکھڑ رہی تھی، اور اس کے اندر خود اپنے ساتھ بھی جنگ جاری تھی۔ دل الگ

بغاوت پر آمادہ تھا اور ذہن سوچنے سمجھنے سے قاصر۔ جب ہی وہ خود کو سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ بس چاہتی تھی، پلک جھپکنے

میں وہ ہر منظر سے غائب ہو جائے، اور جتنا وہ بھاگنا چاہ رہی تھی، اسی قدر اسے تلخ حقائق کا سامنا تھا۔

ابھی اپنے روم میں داخل ہوئی تھی کہ عجب سے ملازم پکار کر بولا۔

”مس! آپ کو باس بلار ہے ہیں۔“

وہ بے دلی سے بیک ٹیبل پر رکھ کر باس کے روم میں داخل ہو کر بولی۔

”السلام علیکم سر.....!“

”وعلیکم السلام.....!“

علی احمد نے جواب کے ساتھ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ان کے چہرے سے ان کے موڈ کا اندازہ کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”ویری گڈ مشعال.....!“

اس کے بیٹھنے ہی علی احمد اسے سراہ کر بولے۔

”تم نے وہ کام کر دیا ہے جو میں نہیں کر سکا۔“

”جی.....؟“

وہ سمجھی نہیں۔

”آئی ایم سو پی مشعال.....! شائمان نے سارہ کو گڈ بائے کہہ دیا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ تمہیں

جاتا ہے۔ میں اور میری سسر تو اس میٹر میں بالکل ناکام ہو گئے تھے۔“

”لیکن سر..... میں.....“

اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن علی احمد نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی شائمان کو سارہ کے جھٹکل سے نکال لو گی۔ کیونکہ وہ سارہ کے

خلاف کچھ سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ تم نے چاہیں کیسے.....“

”سر.....! میں نے کچھ نہیں کیا۔“

وہ یہ بات چیخ چیخ کر کہنا چاہتی تھی، لیکن اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

”سر.....! میں نے شائمان کو کسایا ضرور تھا، لیکن سارہ کے خلاف نہیں۔“

”پھر.....؟“

علی احمد نے پوچھا ضرور، لیکن غالباً انہیں جواب سے غرض نہیں تھی، جب ہی ٹیلی فون کی ٹیل پر انہوں

نے فوراً ریسیور اٹھا لیا تھا اور بات کرتے ہوئے اسے یوں نظر انداز کر دیا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ وہ کچھ دیر بے

بسی سے انہیں دیکھتی رہی، پھر اٹھ کر اپنے روم میں آ گئی اور بیٹھنے ہی کیپیوٹر آن کر کے اپنا ریزائن لیٹر ٹائپ کرنے لگی۔

لیکن بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے دُھند چھا رہی تھی۔ لفظ گڈ ہو رہے تھے۔ پھر بھی اس نے پرواہ نہیں کی۔ لیٹر

ٹائپ کر کے پرنٹ آؤٹ نکالا، پھر لفافے میں ڈال کر سوچنے لگی۔

”کیا واقعی میں نے شائمان کو سارہ سے الگ کیا ہے؟ نہیں نہیں.....! میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں

کی ہے۔ میں نے تو صرف شائمان کو خود کو آزمانے کو کہا تھا، کیونکہ مجھے کسی لڑکی کی توہین منظور نہیں تھی۔“

”ہیلو.....!“

شائمان کی آواز پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کہاں گم تھیں.....؟“

اس نے پوچھا تو وہ بس نفی میں سر ہلا سکی۔

”اگر کچھ سوچنا باقی رہ گیا ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔“

اس نے کہا تو وہ پھکی سکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”آپ کیوں جاتے ہیں سر.....؟ جانا تو مجھے ہے۔“

”تمہیں.....؟ تمہیں کہاں جانا ہے.....؟“

”جہاں.....!“

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بس.....! مجھے جانا ہے۔“

”مشعال.....!“

”سر.....! پلیز، آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی، اور میں کیوں بتاؤں آپ کو.....؟

بھری مرضی، میں جہاں بھی جاؤں۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے.....؟“

وہ یہاں بھی تھیں سے اکھڑ گئی۔ اسے خود پر بالکل اختیار نہیں رہا تھا۔ بیک اٹھا کر تیزی سے نکلی تھی۔

”مشعال.....!“

شائمان اسی تیزی سے اس کے ساتھ ساتھ چیمبر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بلڈنگ سے نکلا تھا کہ

اچانک وہ سامنے آ گئی۔ حیرت سے دونوں کو دیکھا، پھر حقارت سے مشعال کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔

”تو اس کے لئے تم نے مجھ سے محبت نہ ہونے کا بہانہ کیا تھا؟ شٹ.....! ایک معمولی لڑکی کی خاطر

تم نے مجھے.....“

”شٹ آپ سارہ.....! تم ہماری توہین کر رہی ہو۔“

اس نے مشعال کا ہاتھ تھام کر غصے سے سارہ سے کہا تو وہ سلگتے لہجے میں بولی۔

”ہماری.....؟ میں نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا شامی.....!“

”مجھے کھویا اسے، ایک ہی بات ہے، اور پلیز.....! ہٹ جاؤ ہمارے راستے سے۔“

”تم مجھے راستے سے نہیں ہٹا سکتے شامی.....! میں کوئی بے جان پتھر نہیں ہوں جسے تم ٹھوکر مارتے ہوئے

لڑ جاؤ گے۔“

شائمان نے ہونٹ بھیج کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی، کیونکہ اس کے ہاتھ میں مشعال کا ہاتھ کانپ رہا

تھا۔

”کیا سمجھتے ہو، میں اتنی آسانی سے ہار مان لوں گی؟ وہ بھی اس معمولی لڑکی کے مقابلے میں؟“
ہرگز نہیں.....! اسے تو میں اس کی اوقات پر لا کر چھوڑ دوں گی۔“

سارہ انگارے چباری تھی۔

”جانتی ہو اس کی اوقات کیا ہے؟“

وہ ضبط سے لفظ چپا چپا کر بولا تھا۔

”شائمان علی کے دل میں سب سے اونچے مقام پر بیٹھی ہے، جہاں تمہاری نظریں بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ چلو مشعال.....!“

اس کے ساتھ ہی وہ مشعال کو کھینچتے ہوئے گاڑی تک لایا اور جب گاڑی کا دروازہ کھولا تب مشعال نے

ایک دم جیسے ہوش میں آکر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

”آئی ایم سوری مشعال.....! میری وجہ سے تم ہرٹ ہوئی۔“

وہ کچھ نہیں بولی، البتہ آنسو روانی سے جھلک گئے تھے۔

”پلیز مشعال.....! تم اس کی باتوں کو سیریس مت لو۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہی تھی۔ آئی ایم سوری

یار.....! میں معافی مانگ رہا ہوں نا تم سے، اور تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ معمولی تم نہیں، معمولی سارہ ہے، اور اس

نے خود ثابت کر دیا ہے۔ تم پلیز رومت۔ مجھے تمہارے آنسوؤں سے تکلیف ہو رہی ہے۔“

وہ اس کے رونے سے پریشان ہو کر بولے چلا جا رہا تھا۔

”دیکھو، اس طرح تمہارا گھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ سر راہ تماشا مت بناؤ، پلیز.....!“

وہ آخر میں جھنجھلا کر اسے ہاتھ سے پکڑ کر گاڑی میں بٹھانا چاہتا تھا، لیکن وہ بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹ

گئی۔

”تماشا آپ بنا رہے ہیں مسٹر شائمان.....! پلیز، آپ جائیں یہاں سے۔ مجھے آپ کے ساتھ نہیں

تو نہیں جانا، بس.....!“

وہ غصے سے کہہ کر تیز قدموں سے دوسری سمت چل پڑی۔ اس کا ضدی انداز بتا رہا تھا کہ وہ نہڑ کے کی

پلٹ کر دیکھے گی، اور ایسا ہی ہوا۔ وہ جلتی چلی گئی۔ اسے خود پتا نہیں تھا، وہ کہاں جا رہی ہے؟ آنسوؤں کے

راستہ ڈھنڈلا رہا تھا۔ اسے اندسہ صاف کرنے کا ہوش تھا نہ رواں ٹریفک کا، اور روڈ پار کر رہی تھی، پھر کسی گاڑی

بریک بڑی زور سے چرچائے تھے۔ اس کی سماعتوں میں مختلف آوازیں گونڈ ہو رہی تھیں، اور پھر خاموشی مہما کی

دیز خاموشی۔

”حد ہے رابعہ.....! ایسی بھی کیا مصروفیت؟ پھر وہی کوئی دنیا کے آخری کوٹے میں نہیں ہے۔ لوگ

تو آخری کوٹے سے بھی آتے جاتے ہیں۔ تم ہو کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔“

ثانیہ اس وقت فون پر رابعہ سے بات کرتے ہوئے بہت شاکہ ہو رہی تھی۔

”کیا تمہارا دل بھی نہیں چاہتا ہم سب سے ملنے کو؟ سال بھر کا شوبہ کو چھوڑ کر گئی تھیں، اب ماشاء اللہ

وہ جوان ہو گیا ہے۔ کیا تمہارا اس کے تمہارا دل اس کے لئے بھی نہیں تڑپتا؟“

”کیوں نہیں تڑپتا؟ لیکن میں کیا کروں؟ شیراز میری ہر بات مانتے ہیں، لیکن جہاں پاکستان

جانے کا کہتی ہوں، صاف منع کر دیتے ہیں، اور پھر کتنے دن ان کا موڈ آف رہتا ہے۔“

رابعہ نے اپنی مجبوری بتائی۔

”عجیب ہیں شیراز بھائی۔ چلو خود نہ آئیں، تمہیں تو بھیج دیں۔“

اس نے کہا تو رابعہ فوراً بولی۔

”ہاں.....! اس بات کے لئے میں انہیں آہستہ آہستہ کنکس کر رہی ہوں۔ اچھا، یہ بتاؤ، شوبہ کیا

ہے.....؟ تم نے اس کی شادی وادی کا سوچا کہ نہیں؟“

رابعہ نے بات بدلے ہوئے شوق سے پوچھا۔

”ہاں.....! آج کل تو میں بس یہی سوچ رہی ہوں۔ شوبہ جلدی سے اپنے ہیروں پر کھڑا ہو تو میں اس کی

شادی کروں۔ شادی پرتو تو آؤ گی ناں.....؟“

”بالکل آؤں گی، اور پتا ہے ابھی میں نے تمہیں اسی سلسلے میں فون کیا ہے کہ اگر تم مناسب سمجھو تو شوبہ

اور مشعال.....“

رابعہ قصداً خاموش ہو گئی تھی اور وہ ہنس پڑی۔

”ہاں.....! سوچا تو میں نے بھی یہی تھا، لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

رابعہ نے پوچھا تھا کہ لائن کٹ گئی

”لو.....!“

اس نے کریڈل پر ہاتھ مارا، پھر نمبر ڈائل کرنے لگی تھی کہ خوبصورت صاحب کو آتے دیکھ کر باقی باتیں بعد کے

لئے اٹھا رکھیں اور ریسیور رکھ کر خوبصورت صاحب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”السلام علیکم یا.....!“

”خوش رہو.....! کس کا فون تھا؟“

خوبصاحب نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

”رابعہ کا!“

اس نے اسی قدر کہا تھا کہ خوبصاحب پوچھنے لگے۔

”پھر تم نے شوئی اور مشعال کی بات کی؟“

”ارے نہیں ابا! اتفاق سے ادھر رابعہ بھی یہی چاہ رہی تھی۔ لیکن ہم غلط سوچ رہے تھے۔“

اس نے کہا تو وہ نہ سمجھنے کے انداز میں بولے۔

”کیوں؟ اس میں کیا غلط ہے؟ اچھا ہے، گھر کی بات گھر میں طے ہو جائے گی۔“

”ہاں! لیکن مشعال اور شوئی کسی نئے رشتے پر آمادہ نہیں ہیں۔“

”تم نے بات کی بچوں سے؟“

خوبصاحب نے فوراً پوچھا تھا۔

”جی! مشعال سے بات کی تھی، اور ابا! وہ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔ بہت روئی، کہنے لگی، کہیں

بہن بھائی کی بھی شادی ہوتی ہے؟“

”اچھا!۔“

خوبصاحب ہنستے ہوئے بولے۔

”تم نے پرورش ہی ایسی کی ہے۔ خیر! اچھی بات ہے۔“

”اچھی بات تو ہے ابا! لیکن اب یہ بتائیں، ان کی شادیاں کیسے ہوں گی؟“

وہ اچانک فکر مند ہو گئیں۔

”کیسے ہوں گی سے مطلب؟ جیسے سب کی ہوتی ہیں۔“

خوبصاحب کے اطمینان پر وہ زچ ہو گئی۔

”ابا! امیر مطلب ہے، اچھے رشتے ہوں گے، تب ناں!۔“

”پھر مایوس کیوں ہوتی ہو؟ جب اللہ کو منظور ہوگا، پتا بھی نہیں چلے گا، سب کام ہو جائیں گے۔“

”انشاء اللہ! چلیں آپ آرام کریں، میں جلدی سے کھانا بنا لوں۔“

وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆.....☆.....☆

اس نے کتنی دُور تک مشعال کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر پریشان آفس لوٹا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اچانک کیا ہو گیا ہے؟ وہ اس سے کیوں ناراض ہو گئی ہے؟ مزید سارہ نے اس کی توہین کر لے

اسے اور اس سے متنفر کر دیا تھا۔

”لیکن اس سے پہلے کیا ہوا تھا؟“

وہ سوچنے لگا۔ لیکن کچھ سمجھ میں آیا تو اٹھ کر اس کی ٹیبل پر آ گیا کہ شاید وہ اس کے لئے کوئی میز چھوڑ گئی

ہو، اور میز تو نہیں، اس کا ریزائن لیٹر تھا۔

”ریزائن؟ مشعال نے ریزائن کیوں دیا؟“

وہ اُٹھتے ہوئے لیٹر پھینک کر علی احمد کے روم میں آ کر ان سے پوچھنے لگا۔

”ڈیڈی! مشعال آئی تھی؟“

”ہاں! آئی ہے مشعال، اپنے روم میں ہوگی۔“

علی احمد نے کہا تو وہ ان کی لاعلمی پر متعجب ہوا۔

”مشعال روم میں نہیں ہے ڈیڈی! وہ ریزائن چھوڑ گئی ہے۔“

”واٹ؟ بٹ وائے؟ مجھ سے تو اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

علی احمد نے کہا تو وہ پوچھنے لگا۔

”آپ کے پاس آئی تھی وہ؟“

”ہاں! اچھی! کچھ دیر پہلے بیٹھی تھی وہ۔ میں نے اس کے کام کو سراہا تھا۔ پھر اس نے ریزائن

کیوں دے دیا؟ کال کر دے۔“

علی احمد کو خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس طرح کیوں چلی گئی؟

”جی!۔“

وہ جیب سے موبائل نکالتے ہوئے ان کے روم سے نکل آیا۔ پھر کتنی دیر وہ بار بار اس کا نمبر لٹائی کرتا رہا،

لیکن ادھر اس کا سیل فون آف تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے کسمسا آکھیں کھولی تھیں، لیکن ذہن ماؤف تھا، جب ہی سمجھ نہیں پائی کہ وہ کہاں ہے؟

خالی نظریں ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی ایک جگہ جا کر ٹھہر گئیں تو پھر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

”پاپا؟“

وہ جھٹکے سے اٹھی اور دیوار پر لگی دانیال اور ثانیہ کی تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ تب ہی عقب سے

آواز آئی۔

”جھٹک گاڈ! آج ہمیں ہوش آ گیا۔“

وہ فوراً اٹھتی تھی۔

”شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تم وہاں روڈ پر گر گئی تھیں۔“

دانیال حسن نے کہا تو اس وقت اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی، بس ایک بات کہ وہ اپنی پناہ گاہ میں

آگئی ہے۔

”پاپا!.....!“

وہ بھاگ کر ان کے سینے سے جا لگی۔

”پاپا!.....! میں مشعال ہوں، میں مشعال ہوں پاپا!.....! آپ کی بیٹی، مشعال!.....!“

”مشعال!.....!“

دانیال حسن نے ایک دم اسے ہانپوں میں سمیٹ لیا۔

”میری بیٹی مشعال!.....!“

”پاپا!.....!“

وہ بری طرح رو رہی تھی۔

”میری جان!.....! میں بہت برا ہوں، مجھے معاف کر دو، میں تمہیں ڈھونڈنے میں ناکام ہو گیا۔ میں

دنیا کا ناکام ترین شخص ہوں۔“

وہ اپنی ناکامی پر پشیمانی سے رو رہے تھے۔

”تمہیں پاپا!.....! ایسا نہ کہیں۔“

وہ تڑپ گئی۔

”بری تو میں ہوں جو میں نے آپ کو اتنا ستایا۔ آپ کا قانون ریسیو نہیں کیا۔“

”یہی میری سزا تھی اور پتا نہیں بیٹا!.....! آپ کی امی مجھے معاف کریں گی کہ نہیں!.....! کیسی ہیں آپ کی

امی!.....!؟ آپ مجھے ان کے پاس لے چلو۔“

”چلیں!.....!“

وہ فوراً تیار ہو گئی۔

”لیکن بیٹا!.....! پہلے آپ یہ جوس پی لو۔“

انہوں نے اسے صوفے پر بٹھایا اور پھر جوس کا گلاس اسے تھما کر پوچھنے لگے۔

”کیا ہو گیا تھا آپ کو؟.....!“

”پتا نہیں پاپا!.....! اچانک چکر آ گیا تھا۔“

وہ نظریں چرا کر بولی تھی۔

”کمزوری سے ہوتا ہے، آپ جوس پیو اور جب تک آپ یہ ختم کرو، میں فریش ہو کر آتا ہوں، پھر چلتے

ہیں، ٹھیک!.....!“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو دانیال حسن اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ تب جوس پیتے ہوئے اسے

اچانک خاموشی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے اطراف دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا کہ جہاں وہ بیٹھی ہے، وہ کمرہ وسط

میں ہے۔ پھر بھی ادھر ادھر کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔

”امی نے تو بتایا تھا، پاپا شادی کر کے باہر چلے گئے تھے۔“

اس نے سوچا، تب ہی دانیال حسن آ کر بولے۔

”دچلیں بیٹا!.....!“

”جی!.....!“

وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور خود کو روکتے روکتے بھی پوچھ گئی۔

”پاپا!.....! گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟.....!“

”اور کون ہو گا بیٹا!.....!؟ ہاں، اب آپ اور آپ کی امی آج سب تو پھر یہ گھر خالی، ویران نہیں لگے گا۔“

انہوں نے کہا پھر اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے کر چل پڑے۔

کچھ دیر پہلے وہ بہت دل گرفتہ تھی اور کہیں دُور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن اب دانیال حسن کے ساتھ

بیٹھی وہ خود کو بہت مضبوط لگ رہی تھی۔ پھر تقریباً بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس نے اپنے گھر کے سامنے گاڑی

رکوائی تو دانیال حسن اسے یوں دیکھنے لے جیسے پوچھ رہے ہوں۔

”میں باہر ہی سے تو نہیں لوٹا یا جاؤں گا!.....!“

وہ سمجھی یا نہیں، لیکن مسکرائی ضرور، پھر اتر کر بولی۔

”آئیے ناں پاپا!.....!“

دانیال حسن اتر کر اس کے پاس آگئے تو وہ ان کا ہاتھ تھام کر سیدھی اندر آگئی۔ پھر سیننگ روم میں ان کا

ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ کر پکارنے لگی۔

”امی!.....! امی!.....!“

”آ رہی ہوں بیٹا!.....!“

ثانیہ کہتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی کہ اس کے پیچھے دانیال حسن کو کھڑے دیکھ کر وہیں ساکت ہو گئی۔

جبکہ اس کے ذہن میں جھکڑے چلنے لگے تھے۔ مشعال نے پلٹ کر دانیال حسن کو دیکھا، ان کی نظریں ثانیہ پر جمی

تھیں۔ تب مشعال قصداً درمیان سے ہٹ کر کمرے میں چلی گئی۔

”ثانیہ!.....!“

دانیال حسن نے پکارا، تب ہوش میں آتے ہی اس کے اندر تفر بھر گیا تھا۔

”کیوں آئے ہیں آپ.....؟ کیا کوئی زخم لگا باقی رہ گیا تھا.....؟“

”نہیں.....! اپنے زخم دکھانے آیا ہوں۔“

ان کی آواز بوجھل تھی۔

”اپنے زخم.....؟“

ثانیہ کے لہجے میں حد درجہ کڑواہٹ تھی۔

”ہاں.....! تمہارے زخموں پر تو شاید وقت نے کھر نڈ جمادی ہوگی، لیکن میں برسوں سے اپنا بولہ بوجھ

لئے در بدر پھر رہا ہوں۔“

انہوں نے کہا تو وہ مزید چیخ گئی۔

”در بدر تو میں ہوئی ہوں دانیال حسن.....! آپ تو خوشی سے نئی دنیا بسانے چلے گئے۔ یہ جاننے کو بھی

نہیں رکے تھے کہ اللہ نے آپ کو بیٹی دی ہے یا بیٹا.....؟ کیونکہ آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔“

”میں تمہیں جھٹلاؤں گا نہیں ثانیہ.....! کیونکہ اگر مجھ پر سیما بھابی اور حنا کی حقیقت نہ نکلتی تو شاید یہی جج

ہوتا۔“

”شاید.....؟“

وہ طنز یہ بھی تھی۔

”ہاں شاید.....! کیونکہ جج یہ ہے کہ جب میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا اور پھر مجھے یہ معلوم

ہوا کہ تم سب رابعہ کے ساتھ ڈھنی چلے گئے ہو، تب میں بھی مایوس ہو کر یہ ملک چھوڑ گیا تھا۔“

ان کی بات پر اس نے منموڑ لیا تو وہ اس کے قریب چلے آئے۔

”میرا یقین کر دو ثانیہ.....! اس کے بعد جو چاہے سرادو۔ میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔ لیکن پھر خدا کے

لئے مجھے معاف کر دینا۔“

انہوں نے عاجزی سے کہا۔

”معاف کر دو بیٹی.....!“

خولید صاحب جانے کب وہاں آن کھڑے ہوئے تھے، ثانیہ فوراً ان کی طرف گھومی تھی، جبکہ دانیال نے

انہیں دیکھ کر سر جھکا لیا تھا۔

”صبح کا بھولا شام میں لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“

خولید صاحب کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”ثانیہ.....!“

دانیال حسن نے بے تابی سے اسے کندھوں سے تھام لیا اور اگلے پل وہ ان کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”علی.....! میں تو جج کی بوکھلا گئی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا شامی کی کہاں بات کروں.....؟ شاہد صاحب

کے ہاں جاؤں یا مسز بھال کے ہاں، اور بیٹی تو عقیل صاحب کی بھی بہت پیاری ہے۔“

زوبیہ کی بوکھلاہٹ پر علی احمد خامے معظوظ ہو رہے تھے۔

”آپ بتائیں ناں، پہل کہاں سے کروں.....؟“

زوبیہ نے خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے کہا تو وہ فوراً دونوں ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”بھئی.....! مجھے معاف رکھو۔ یہ خالصتا تمہارا شعبہ ہے، اگر نہیں سمجھ میں آ رہا تو شامی سے پوچھ لو۔“

”شامی تو بات مذاق میں اڑا دیتا ہے۔ مجھے بتائیے، وہ کیا کہے گا.....؟“

”کیا کہے گا.....؟“

”کہے گا، ماما،! پرچیاں بنالیں، پھر آنکھیں بند کر کے ایک پرچی اٹھالیں، جس کا نام نکلے، پہلے اسی

کے ہاں پر پوزل لے جائیں۔“

زوبیہ روٹھے انداز میں بول رہی تھی۔ علی احمد بے ساختہ تہقیر لگا کر نیسے تو وہ مزید عاجز ہو گئی۔

”علی.....! پلیز، بی سیریس۔ میں اب جلدی شامی کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے بچے کھانا چاہتی

ہوں۔ اگر اس لڑکی سارہ کا معاملہ نہ ہوتا تو اب تک شامی کے دو بچے یہاں کھیل رہے ہوتے۔“

”یہ تو ہے.....!“

علی احمد تائیدی انداز میں سر ہلانے لگے۔

”پھر بتائیں ناں، میں کیا کروں.....؟“

”دیکھو، جو بات تم مجھ سے کہہ رہی ہو، وہ شامی سے کہو کہ اب تک اسے دو بچوں کا باپ بن جانا چاہئے

فہا۔ پھر تم اس سے پوچھو، بلکہ پوچھو مت، بتاؤ کہ تم مسز جمال کے ہاں اس کا پر پوزل لے کر جا رہی ہو۔“

علی احمد نے شجیدہ ہو کر کہا تو وہ بلا ارادہ بولی تھی۔

”اور اگر اس نے منع کر دیا تو.....؟“

”منع کرے تو دوسرا پر پوزل اس کے سامنے رکھ دینا۔ کسی ایک پر تو وہ ہامی بھرے گا۔“

”یہ ٹھیک ہے.....! میں ابھی اس سے بات کرتی ہوں۔“

وہ کہہ کر آٹھ کھڑی ہوئی۔ علی احمد نے کچھ کہنا چاہا، لیکن وہ ہاتھ سے انہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے

”شامی.....! شامی.....!“ پکارتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور اندر داخل ہو کر بھی پکارا تو وہ اپنے کسی

خیال سے چونک کر بولا۔

”جی جی.....!“

”کیا کر رہے ہو بیٹا.....؟“

زوبیر نے اسے فارغ دیکھ کر بھی پوچھا۔

”کچھ نہیں.....! خود سے باتیں کر رہا تھا۔“

شامان نے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

”بس.....! اب خود سے باتیں کرنا بند، میں تمہارے ساتھ باتیں کرنے والی لا رہی ہوں۔“

”ممی.....! آپ کو جلدی کیا ہے.....؟“

وہ جھک پڑ کر بولا تو زوبیر ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”بس شامی.....! یہ نال مثل کا سلسلہ ختم کرو۔ میں اب کچھ نہیں سنوں گی۔“

”چلیں تو جو آپ سنا نا چاہتی ہیں، وہ سنائیں۔“

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”ہاں.....! میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ کل میں مسز جمال کے ہاں تمہارا پرپوزل لے کر جا رہی ہوں۔“

اس نے کہا تو وہ قصداً حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”مسز جمال.....؟ وہ تو مسز ہیں ممی.....! ان کے لئے آپ میرا پرپوزل لے کر جائیں گی.....؟“

”پاگل ہو گئے ہو.....؟ میں ان کی بیٹی کی بات کر رہی ہوں۔“

اس نے جھلا کر کہا۔

”اچھا اچھا.....! لیکن ممی.....! ان کی بیٹی تو.....“

”بہت پیاری ہے۔“

وہ فوراً بولی تھی۔

”ویسے شاہد صاحب اور عقلی صاحب کی بیٹیاں بھی میری نظر میں ہیں۔ تمہیں دیکھا ہوا ہے ایتلا اور نٹی

کو.....؟“

”ہو سکتا ہے، دیکھا ہو۔“

وہ لا پرواہی سے بولا تھا۔

”خیر.....! یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جب چاہو، دیکھ سکتے ہو۔ بلکہ ایسا کرو کل تم میرے ساتھ چانا۔“

اس نے کہا تو اب وہ فوراً بولا تھا۔

”کل نہیں ممی.....! آپ کچھ دن رُک جائیں، پھر میں آپ کو بتاؤں گا۔“

”شامی.....!“

”ممی.....! کہہ رہا ہوں ناں، بس کچھ دن۔ مجھے سوچنے کا موقع تو دیں، پلیز.....!“

اس کی منت پر وہ خاموش ہو گئی، لیکن پھر بڑبڑاتے ہوئے گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کے کھانے کے بعد سب لاؤنج میں آکر بیٹھے تھے۔ ماحول خوش گوار تھا کہ اچانک مشعل پوچھنے

لگی۔

”پاپا.....! اب آپ یہیں رہیں گے ناں، ہمارے ساتھ.....؟“

دانیال حسن نے شیشا کرنا دیکھا تو خواجہ صاحب بول پڑے۔

”یہ یہاں کیوں رہیں گے بیٹا.....؟ اب تم جاؤ اپنے گھر.....!“

”آپ نے تو مجھے مشکل سے نکال لیا انکل.....!“

دانیال حسن منمن ہو کر بولے۔

”اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ثانیہ اور مشعل کو اپنے ساتھ لے جاؤں، بلکہ آپ بھی چلیں۔ یہاں

اکیلے کیا کریں گے.....؟“

”اکیلا کیوں.....؟ شو بی ہے میرے ساتھ۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو مشعل فوراً بولی۔

”شو بی تو نانا بابا.....! ذمہ دار ہے۔“

”زیادہ دنوں کے لئے نہیں جا رہا، آ جاؤں گا جلدی۔“

”تو ٹھیک ہے.....! جب تم ذمہ سنبھالو گے، تب نانا بابا بھی یہاں آ جائیں گے۔“

ان دونوں کی بحث شروع ہو گئی تو خواجہ صاحب نے پہلے ثانیہ کو جانے کی تیاری کرنے کو کہا، پھر ان

دونوں کو ٹوکا۔

”لڑومت تم دونوں۔ جاؤ مشعل.....! تم بھی ماں کے ساتھ تیاری کرو۔“

مشعل، شو بی کو چڑاتے ہوئے ثانیہ کے پیچھے آگئی تو پھر بس کچھ ضروری چیزیں ہی دونوں نے بیگ میں

رکھی تھیں، اس کے بعد خواجہ صاحب نے جیسے دوسری بار ثانیہ کو زخمت کیا تھا۔

”حسن ولا“ آکر مشعل نے پہلے سارے گھر میں گھوم پھر کر دیکھا، پھر اپنے لئے کمرہ منتخب کر کے وہیں

ڈیرہ جمالیا۔ کشادہ کمرہ خوب صورت فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اس نے اپنا بیگ دیوار گیر الماری میں ڈال دیا۔ پھر بیڈ پر

بیٹھی تھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر شامان کا نمبر دیکھ کر اس نے کچھ سوچا، پھر موبائل اٹھالیا۔

”ہیلو!“

”مشعل! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیا میری باتیں اتنی بری لگی ہیں کہ تم نے ریزائن۔“

شائمان چھوٹے ہی بولا تو اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”نوسر! میں نے آپ کی وجہ سے ریزائن نہیں دیا۔“

”پھر؟“

وہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

”بس! مجھے ریزائن کرنا تھا۔ آئی ایم سوری! میں جاب جاری نہیں رکھ سکتی۔“

وہ سہولت سے بولی تھی۔

”ٹھیک ہے! میں وجہ نہیں پوچھوں گا۔ بٹ آئی ایم سوری ٹو! کہ میں آپ کا ریزائن

Except نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ میں نے آپ کو پائینٹ نہیں کیا تھا۔ آپ کو اپنا ریزائننگ لیٹر باس کو دینا ہوگا۔“

اس نے کہا تو وہ جڑ بڑھ کر بولی۔

”توسر! آپ میرا لیٹر باس کے پاس بھجوا دیں۔“

”سوری مشعل! جاب کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے، باس وجہ جانے بغیر ریزائن

نہیں لیں گے۔“

”ٹھیک ہے! میں آ جاؤں گی۔“

اس نے کہہ کر لائن کاٹ دی اور آفس جانے کا سوچ کر رہی پریشان ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”چلی جاؤں گی امی! آخر پہلے بھی تو جاتی تھی، اب میں جاؤں۔؟“

ٹائیپ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔ گوکہ اندر سے وہ پریشان تھی لیکن

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کسی مقام پر کنٹرول نہیں پڑے گی۔ جب ہی اپنے تئیں اعتماد سے آفس میں داخل ہوئی۔ پھر روم میں آ کر اپنا ریزائنیشن لیٹر تلاش کر رہی تھی کہ شائمان کی آواز پر ٹیبل پر ادھر ادھر حرکت کرتا اس کا ہاتھ زک گیا۔

”ہیلو!“

”السلام علیکم!“

وہ ایک نظر اس پر ڈال کر پھر ٹیبل دیکھنے لگی۔

”ماراش ہو۔؟“

شائمان نے ٹیبل پر دونوں ہاتھ جما کر پوچھا۔

”نہیں!“

اس نے اپنی مصروفیت ترک نہیں کی۔

”تو تم واقعی ناراض ہو۔؟“

”نہیں کا مطلب نہیں ہوتا ہے۔“

”تو پھر میری طرف دیکھو!“

شائمان نے کہا۔ اس نے سرواٹھا کر کے دیکھا تو وہ جلدی سے جیب سے گلاب نکال کر اس کے سامنے

رکھنے بولا۔

”تم نے کہا تھا، روٹھی دوست کو گلاب دوں گا تو وہ خوش ہو جائے گی۔“

مشعل کی نظریں گلاب پر پڑھ رہی تھیں، جبکہ چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔

”میرا خیال تھا۔“

وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

”شاید میں نے تمہارا دفاع کرنے کے لئے سارہ سے کہہ دیا تھا کہ تم شائمان علی کے دل میں سب سے

اونچے مقام پر بیٹھی ہو، لیکن پھر مجھ پر ادراک ہوا کہ یہی سچ ہے، اور اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ تم پہلی لڑکی ہو جس کے

سامنے میں یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میرے دل کی ساری گلیوں میں دھیرے دھیرے

سنجیدگی سے سنبھل کر قدم رکھنے والی وہ تم ہو، تم مشعل!“

وہ گم گم ہو گئی تھی۔ شائمان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر گلاب اس کے سامنے رکھ کر روم سے نکل

گیا، تب اس نے جو کہہ کر ادھر ادھر دیکھا، پھر پہلے ریزائن لیٹر ڈھونڈ کر باس تک پہنچایا۔ اس کے بعد جانے کیا

خیال آیا کہ یہ جیوں سے واپس پلٹ کر روم میں آئی تھی اور جیسے نودے بھی چھپا کر گلاب اپنے پرس میں ڈالا تھا، لیکن

زندگی کی دھوپ ڈھل گئی تھی۔ اب ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ ناشتے کی ٹیبل پر مشعل کو اپنے ماں باپ

چہروں پر چٹکتی ہوئی مسکراہٹیں بہت پیاری لگ رہی تھیں اور وہ دل ہی دل میں ان مسکراہٹوں کی ابدیت کی دعا

لگی۔ پھر دانیال حسن کے آفس جانے کے بعد وہ بھی تیار ہو کر آئی تو ٹائیپ پوچھنے لگی۔

”تم کہاں جا رہی ہو بیٹا؟“

”آفس! میرا مطلب ہے، میں ریزائن دینے جا رہی ہوں۔“

اس نے فوراً وضاحت بھی کی تو ٹائیپ لطیفانان سے ہو کر بولی۔

”ہاں بیٹا! اب تمہیں جاب کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جاؤ گی۔؟“

پھر وہ اسے چھونے اور اس میں بسی محبت کی خوشبو اپنے اندر اتارنے سے گریز کرنے لگی۔ گو کہ دل بھی ترغیب دینے لگا تھا، لیکن وہ خائف تھی۔ جیسے علی احمد نے کہا تھا۔

”تم نے وہ کام کر دیا مشعال.....! جو میں نہ کر سکا۔ شامان نے سارہ کو گنڈ بٹے کہہ دیا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے۔ میں اور میری مسرتو اس میٹر میں بالکل ناکام ہو گئے تھے۔“

پھر سارہ تھی۔

”تم مجھے راستے سے نہیں ہٹا سکتے شامی.....! میں کوئی بے جان پتھر نہیں ہوں جسے تم ٹھوکر مارتے ہوئے گزر جاؤ گے۔ کیا سمجھتے ہو، میں اتنی آسانی سے ہارمن لوں گی.....؟ وہ بھی اس معمولی لڑکی کے مقابلے میں.....؟ ہرگز نہیں.....! اسے تو میں اس کی اوقات پر لا کر چھوڑوں گی۔“

یہ باتیں مسلسل نہ صرف اسے چوکتی تھیں، بلکہ اپنے آپ میں مجرم بنی ہوئی تھی۔ گو کہ سچ یہی تھا کہ اس نے شامان کو سارہ کے خلاف نہیں آکسایا تھا۔ لیکن علی احمد تو یہی سمجھتے، بلکہ انہیں یقین تھا اور پھر وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ شامان کو سارہ کے چنگل سے نکال کر اس نے اسے اپنے دام میں گرفتار کر لیا۔ اس خیال سے ہی اس کی روح کانپ جاتی تھی، جب ہی وہ شامان کا نوں ریہہ نہیں کر رہی تھی۔ وہ دن میں کتنی بار اسے کال کرتا تھا اور وہ اس کا نمبر دیکھ کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی، اور اس کے ٹیکسٹ پڑھے بغیر Delet کر دیتی۔ گو کہ اس کے بعد اسے خود سے لڑنا پڑتا تھا، لیکن وہ اپنی عزت نفس داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی۔

بہر حال اپنے ماں باپ کے ساتھ وہ خوش تو تھی، لیکن بوری بھی ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ اس وقت وہ چپ چاپ بیٹھی تھی کہ دانیال حسن اس کے پاس بیٹھ کر کہنے لگے۔

”بھئی.....! کیا بات ہے.....؟ ہماری بیٹی لگتا ہے یہاں آکر بور ہو گئی ہے.....؟“

”اصل میں کبھی فارغ نہیں رہی ناں، کالج کے بعد جاب پہ جانے لگی تھی۔“

ثانیہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو دانیال حسن خود میں نادم ہو کر اس سے بولے۔

”تو بیٹا.....! آپ ابھی بھی آفس جوائن کر سکتی ہو۔ آئی مین، میرا آفس۔ کیوں ثانیہ.....! اگر تمہاری

اجازت ہو تو مشعال میرا آفس جوائن کر لے.....؟“

”ارے.....! اس میں میری اجازت کی کیا ضرورت ہے.....؟“

ثانیہ نے نفس کر کہا تو وہ اس سے بولے۔

”بس، تو کل سے آپ میرے ساتھ چلو گی، ٹھیک.....؟“

اس نے ثانیہ کو دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اوہو.....! مجھے تو ابھی ایک میننگ میں جانا تھا۔“

دانیال حسن اچانک یاد آنے پر اٹھ کھڑے ہوئے تو ثانیہ بھی اٹھ گئی۔

”ٹھیک ہے.....! آپ میننگ میں جائیں، میں مشعال کے ساتھ مارکیٹ جاؤں گی۔“

”ہاں بھئی.....! میری بیٹی کو اچھی سی شاپنگ کروانا، جو یہ کہے۔ اوکے بیٹا.....!“

دانیال حسن اس کا گال تھپک کر نکت میں چلے گئے تو ثانیہ اس سے بولی۔

”چلو بیٹا.....! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

اس کا بالکل دل نہیں چار ہا تھا، لیکن ثانیہ کی خاطر اٹھ گئی، اور پھر ثانیہ کی خاطر ہی اسے شاپنگ میں دلچسپی

لینی پڑی۔ ثانیہ بہت شوق سے اس کے لئے سونوں کے ساتھ چینگ جیولری اور سینڈل وغیرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی

ماں پر پیار کے ساتھ رحم بھی آنے لگا۔

”کتنا ترسی ہے یہ عورت.....!“

”بس کریں امی.....!“

آخر وہ تھک گئی۔

”کچھ بعد کے لئے بھی اٹھا رکھیں۔“

”ہیں.....؟“

ثانیہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”چلو ٹھیک ہے.....! پھر کسی دن آجائیں گے۔“

”لایئے.....! یہ مجھے دے دیں۔“

اس نے ثانیہ کے ایک ہاتھ سے شاپنگ بیگز لے لئے، پھر دونوں مال سے ٹکلیں تو ڈرائیور نے انہیں

دیکھتے ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

”بیٹھو بیٹا.....!“

ثانیہ نے اس سے کہا، جب ہی کسی نے پکارا تھا۔

”مشعال.....!“

ثانیہ نے فوراً پلٹ کر دیکھا، پھر اس سے پوچھنے لگی۔

”کون ہے.....؟“

”پتا نہیں امی.....! میں نہیں جانتی۔ آپ بیٹھیں ناں.....!“

اس نے کہتے ہوئے زبردستی ثانیہ کو ہٹایا، پھر خود بیٹھی تھی کہ شامان قریب آکر کہنے لگا۔

”مشعال.....! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز.....! دو منٹ کے لئے میری بات سن لو۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔“

اس نے گاڑی کا دروازہ کھینچ لیا۔

”مشعال..... پلیر۔“

”چلو حفظ!“

وہ ڈرائیور سے کہہ کر ادھر ادھر سے شاہ پر سنبھالنے لگی، جبکہ دھیان ثانیہ کی طرف تھا جو کبھی اسے دیکھتی کبھی پیچھے رہ جانے والے شائمان کو، اور غالباً ڈرائیور کی وجہ سے خاموش تھی، لیکن گھر آتے ہی اسے بازو سے پکڑا کھینچا تو وہ عاجزی سے بولی۔

”ای..... پلیر، مجھ سے کچھ مت پوچھئے گا۔“

”تم سے نہ پوچھوں تو کیا اس سے پوچھتی کہ وہ کون ہے.....؟ اور تمہیں کیسے جانتا ہے.....؟“

ثانیہ نے قدرے غصے سے کہا تو وہ اپنے آپ میں الجھنے لگی۔

”مشعال..... ادھر میری طرف دیکھو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم اپنی پراہم مجھے نہیں بتاؤ گی تو کس.....؟“

گی.....؟

”مجھے کوئی پراہم نہیں ہے امی.....!“

”تو پھر اسے دیکھ کر پریشان کیوں ہو گئی تھی.....؟ یہ کیوں کہا کہ تم اسے نہیں جانتی.....؟ بتاؤ بیٹا“

کون تھا وہ.....؟

ثانیہ نے نرمی اختیار کی، جب وہ اس طرح الجھتے ہوئے بولی۔

”ای.....! وہ..... جہاں میں جاب کر رہی تھی، وہاں کے باس کا بیٹا ہے۔“

”تمہیں شک کرتا تھا.....؟“

ثانیہ کے مشکوک انداز پر وہ زچ ہو گئی۔

”نہیں امی.....! آپ کچھ غلط نہ سمجھیں..... مجھے کبھی اس نے شک نہیں کیا تھا۔“

”پھر تم نے اس کی بات کیوں نہیں سنی.....؟“

”مجھے پتا ہے، اسے کیا بات کرنی تھی.....؟ یہی کہتا کہ میں اپنی جاب پر واپس آ جاؤں۔“

اس نے کہا تو ثانیہ پھر نرم پڑ گئی۔

”تو بیٹا.....! تم آرام سے اس سے کہہ سکتی ہو کہ تمہیں اب جاب کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اور اس کے بعد یہ بھی بتانا پڑے گا، کیونکہ مجھے میرے پیالہ مل گئے ہیں۔ بس کریں امی.....! ہر بات

ہر ایک سے کہنے والی نہیں ہوتی۔“

وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس نے نارنجی گولے کو دو درپائیوں میں اترتے دیکھا، پھر روٹی پر نظر میں ٹھہر گئیں۔ اس کی آنکھوں میں شام اتر آئی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ اس کے ذہنی جانے سے اُداس ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اسے کیسے یقین دلائے کہ وہ بس تھوڑے دنوں کے لئے جا رہا ہے۔ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر اس کا دھیان بنانے کی خاطر آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

”دیکھو، وہ بادل کا ٹکڑا جاتا ہے کہاں جا کر رہے گا.....؟ میں بتا سکتا ہوں۔ جس رفتار سے وہ چل رہا ہے،

اس سے لگتا ہے بس کوئی تھک ہی جا پائے گا۔ ہے ناں.....؟“

آخر میں اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے کوئی حرکت نہیں کی تو وہ جھنجھلا گیا۔

”کیا ہو گیا ہے باز.....! میں کوئی ہمیشہ کے لئے تو نہیں جا رہا، جو تم نے باقاعدہ سوگ منانا شروع کر دیا

ہے۔ دیکھو، اب رو نامت شروع کر دینا۔ مجھے لڑکیوں کے آنسو پونچھنے کا تجربہ نہیں ہے۔“

”تم بہت برے ہو۔“

وہ اس کے روٹھے انداز پر مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر پوچھنے لگا۔

”لڑکیوں کے آنسو پونچھنے نہیں آتے، اس لئے.....؟“

”آنسوؤں کی نوبت ہی کیوں آئے.....؟ اس سے پہلے تلی دلا سائیں دے سکتے.....؟“

روٹی نے شاکی ہو کر کہا تو وہ پہلے ہنسا، پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”سچ بتاؤں، اگر امی میرے انتظار میں دن نہ گن رہی ہوتیں تو میں ابھی اپنا جانا ملتوی کر دیتا، اور پھر

تمہیں ساتھ لے کر جاتا۔“

روٹی اس کے لہجے کی سچائی میں کھو گئی۔

”اور کیا سننا چاہتی ہو.....؟ مجھے محبت کے دعوے کرنے نہیں آتے۔ کیا ضروری ہے کہ میں زبان سے

کہوں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا.....؟ تم ساتھ نہیں ہو گی تو میرا کہیں دل نہیں لگے گا.....؟ ہاں.....! نہیں لگے گا

دل۔ اس لئے اسے تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا..... سمجھی.....؟ سنبھال کر رکھنا، رکھو گی ناں سنبھال کر.....؟“

”نہیں.....! توڑ پھوڑ کر کچرے میں ڈال دوں گی۔“

وہ کہتی ہوئی چل پڑی۔

”تم سے یہی امید ہے۔“

وہ تیز قدموں سے اس سے آگے چل پڑا اور پھر اسے سیدھا گھر لے آیا، تو وہ بگڑ گئی۔

”سوری.....! ایسی روتی ہوئی شکل کے ساتھ میں کھانا نہیں کھا سکتا۔ چلو سیدھی اوپر جاؤ اور خبردار جو صبح

مجھے ہی آف کرنے آئی تو.....؟“

اس کے رعب سے کہنے پر وہ اسے اگٹھا، کہا قاتی، ہوئی بیڑھیاں چڑھ گئی تو وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے

میں آگیا۔ ابھی اسے اپنا سوٹ کیس پیک کرنا تھا۔ جلدی جلدی دو چار سوٹ الماری میں سے نکالے، پھر شیوگ باکس وغیرہ پیک کر رہا تھا کہ خواجہ صاحب کے گنگنائے کی آواز آنے لگی۔ ان کی بوہمی آواز میں عجیب سا درد تھا۔ وہ سوٹ کیس چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ خواجہ صاحب صوفے کی بیک پر سر رکھے گنگنائے پر تھے۔

”بلھے آ کی جانا میں کون؟“

”نانا بابا.....!“

اس نے دھیرے سے پکارا تو وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

”کیا بات ہے.....؟ تم ابھی تک سوئے نہیں.....؟“

”آپ بھی تو جاگ رہے ہیں۔“

وہ کہتے ہوئے ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہاں.....! اب اس عمر میں نیند کم کم ہی آتی ہے۔ خیر.....! یہ بتاؤ، صبح تمہاری فلائٹ کس وقت

ہے.....؟“

”گیارہ بجے.....!“

”ہیں.....؟ گیارہ بجے.....؟ اور تم ابھی تک جاگ رہے ہو.....؟ پھر صبح گیارہ بجے تک پڑے سوئے

رہو گے۔“

”اچھا ہانا بابا.....! فلائٹ مس ہو جائے گی۔ میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا نانا بابا.....!“

وہ ان کی تنہائی کے خیال سے واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

”بیٹا.....! وہاں تمہاری ماں.....“

”ماں سے زیادہ آپ کو میری ضرورت ہے۔“

وہ فوراً بول پڑا۔

”آپ کہہ دیں امی سے، اگر وہ اتنا ہی میرے لئے تڑپتی ہیں تو خود آ جائیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔“

”شوبی بیٹا.....! چند دنوں کی تو بات ہے۔ ماں کے صبر اور انتظار کو مزید مت آزمائو بیٹا.....! چلو اب سو

جاؤ۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔ جاؤ شاباش.....!“

خواجہ صاحب نے اسے بچوں کی طرح پچکارا تو وہ روشے لہجے میں بولا۔

”آپ اپنا خیال رکھیں گے ناں.....؟“

”بالکل رکھوں گا۔ تمہاری شادی سے پہلے مرنے والا نہیں ہوں میں۔ واپس آؤ گے تو یہیں بیٹھنا ملوں

گا۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو اس نے اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیا۔

”کئی بات.....؟“

”بالکل کئی.....!“

خواجہ صاحب نے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

☆.....☆.....☆

دانیال حسن شاور لے کر نکلے تو ثانیہ الماری سے ان کا کوٹ نکال رہی تھی۔ پھر ان کی طرف گھوم کر پوچھنے

لگی۔

”دانیال.....! کمال بھائی کیسے ہیں.....؟ ابھی بھی وہیں رہتے ہیں یا کہیں اور شفٹ ہو گئے

ہیں.....؟“

”کمال بھائی تو دس سال پہلے دُنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔“

دانیال حسن نے اس کے ہاتھ سے کوٹ لیتے ہوئے بتایا تو اسے دھچکا لگا تھا۔

”سک..... کیا.....؟ کیسے.....؟ آپ کہاں تھے.....؟“

”امریکہ.....! یہاں ہوتا ہوا کیا کر لیتا.....؟ سانس پوری ہو جائیں تو پھر ساری تدبیریں دھری کی

دھری رہ جاتی ہیں۔“

ساتھ کر رے دس سال ہو گئے تھے، جب ہی وہ نارلی بتا رہے تھے۔ جبکہ ثانیہ شاکد تھی۔

”بہت افسوس ہوا۔ سیمابھائی اور بچے کہاں ہیں.....؟“

”پتا نہیں.....!“

وہ اب آئینے کے سامنے کھڑے بالوں میں برش کر رہے تھے۔

”کیا مطلب، پتا نہیں.....؟“

دانیال حسن نے برش رکھ کر اسے دیکھا، پھر کہنے لگے۔

”بھائی کے بعد تقریباً چار پانچ سال میں سیمابھائی اور بچوں سے رابطے میں رہا۔ اس کے بعد انہوں

نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ کینیڈا جا رہی ہیں۔ اب پتا نہیں کینیڈا میں ہیں یا کہیں اور.....؟ مجھ سے بہر حال انہوں

نے رابطہ نہیں کیا، اس لئے مجھے نہیں معلوم۔“

وہ خاموش ہو رہی تو پوچھنے لگے۔

”مشعل تیار ہے.....؟“

”ہاں شاید.....!“

”چلو.....! پھر تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا۔“

”ہاں! شوبی بھی ذہنی جارہا ہے ناں، اسے سی آف کر کے پھر میں کچھ دیر باپا کے ساتھ رہوں گی۔“
وہ کہتے ہوئے ان کے ساتھ کمرے سے نکل کر آئی تو آگے مشعل تیار کھڑی تھی۔

”اچھا، پھر ہمیں اجازت.....؟“
انہوں نے غائبہ کو دیکھا تو اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا۔

”چلو بیٹا!“

”اللہ حافظ امی!“

مشعل اسے ہاتھ ہلا کر دانیال حسن کے ساتھ چل پڑی، اور جب آفس پہنچی تو آفس دیکھ کر وہ خوش

ہوئی۔

”پاپا! آپ کا آفس بہت شاندار ہے، جہاں میں جاب کر رہی تھی، اس سے بھی زیادہ شاندار۔“
مشعل نے خاصے جوش سے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرائے۔

”آپ چاہو تو دوسرے روم دیکھ لو اور اسٹاف سے بھی مل لو۔ پھر جو آپ کرنا چاہو، جہاں بیٹھنا چاہو۔“
”بیٹھوں گی تو میں آپ کے پاس ہی پاپا!“

وہ فوراً بولی تھی۔

”ایز یو لائک!“

”اوکے! میں آپ کے اسٹاف سے مل آؤں۔“

وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی تو بیٹھے ہی انہیں یاد آیا کہ آج علی احمد نے آنے کو کہا تھا۔ تب یاد دہانی کے لئے انہوں نے علی احمد کو نوٹ کیا، پھر ملازم کو بلا کر کہنے لگے۔

”دیکھو، مسٹر علی احمد آرہے ہیں، انہیں احترام سے یہاں لے آنا۔“

”جی سر!“

ملازم چلا گیا تو انہوں نے اس نئے پراجیکٹ کی فائل نکال لی جس پر انہیں علی احمد کے ساتھ کام کرنا تھا۔

پھر تقریباً دس منٹ بعد علی احمد روم میں داخل ہوتے ہی بولے تھے۔

”واؤ! سینگ تو تم نے اچھی کر لی۔“

”جینک یو! بیٹھو۔“

انہوں نے اٹھ کر علی احمد سے مصافحہ کیا، پھر انہیں بیٹھے کو کہا، تب ہی مشعل اندر آئی تو وہ اسے دیکھ کر

بولے۔

”پہلے اس سے ملو، یہ مشعل ہے۔“

”مشعل.....؟“

علی احمد چونک کر مشعل کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولے تھے۔

”جانتا ہوں۔“

”تم مشعل کو جانتے ہو.....؟“

دانیال حسن نے قدرے حیرت سے پوچھا تو مشعل بول پڑی۔

”جی پاپا! میں ان ہی کے آفس میں جاب کر رہی تھی۔“

”پاپا.....؟“

علی احمد نے سوالیہ نظروں سے دانیال حسن کو دیکھا تو وہ مسکرا کر بولے۔

”ہاں علی! مشعل میری بیٹی ہے۔ تمہیں تو سب پتا ہے کہ میں اپنی فیملی کے لئے کتنا ترپا ہوں، لیکن

اب اللہ کر شکر ہے۔“

”اللہ کا شکر تو ہے، لیکن مجھے تم سے بڑا گلہ ہے۔“

علی احمد نے کہا تو وہ سمجھے نہیں۔

”مجھ سے.....؟“

”بالکل! تم نے سارے ڈکھ، ساری پریشانیوں میرے ساتھ شیئر کیں اور خوشی اکیلے ہنسم کر

.....؟“

علی احمد کا شکوہ بجاتھا۔

”نہیں! میں تمہیں بتانے والا تھا۔“

”بس رہنے دو.....! ویسے حیرت ہو رہی ہے۔ تمہاری بیٹی میرے پاس تھی، یعنی بچہ بغل میں اور

امنڈوا شہر میں۔ مجھے اگر پتا ہوتا مشعل تمہاری بیٹی ہے، تو میں اسی وقت تمہیں اطلاع کر دیتا۔ خیر! یہ بتاؤ،

ہالی کسی ہیں.....؟“

علی احمد کو اچانک ثانیک کا خیال آیا تھا۔

”ٹھیک ہیں، اچھی ہیں۔“

”وہ تو مجھے مشعل کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ جس طرح انہوں نے مشعل کی تربیت کی ہے، اس

سے پتا چلتا ہے کہ وہ کتنی سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔ میں نے مشعل سے بھی کہا تھا کہ وہ ایک اچھی ماں کی بیٹی ہے۔

یوں مشعل.....؟“

آخر میں علی احمد نے تصدیق کے لئے مشعل کو دیکھا تو وہ جبراً مسکرائی تھی۔

”جی بالکل!“

شہناز نے سر جھٹکا تھا۔

”تو بیٹا! کیوں اپنی مٹی کو چکروں سے رہے ہو؟ صاف بتاؤ تمہیں شادی کرنی ہے کہ نہیں؟“
انہوں نے کہا تو زویہ فوراً بولی۔

”کیوں نہیں کرنی؟“

”ہاں ڈیڈ! کیوں نہیں کرنی؟“

اس نے زویہ کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے اپنا موڈ بدلا تھا۔

”تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟“ میرا مطلب ہے، تمہاری مٹی نے جوڑکیاں بتائی ہیں، تو کسے سلیکٹ کیا ہے تم نے؟“

انہوں نے پوچھا تو وہ قدر سے رک کر بولا۔

”ان میں سے تو ڈیڈ! کوئی نہیں ہے۔“

”پھر؟“

وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”آپ اسے جانتے ہیں ڈیڈ! وہ مجھے پسند ہے۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”مشعال، اور آپ سن لیں۔ وہ نہیں تو کوئی نہیں۔“

وہ کہہ کر زکا نہیں، تیز قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔ تب زویہ ان کا بازو تھام کر پوچھنے لگی۔

”آپ جانتے ہیں مشعال کو، کون ہے؟“

”ہاں! وہ۔“

علی احمد نے چونک کر زویہ کو دیکھا، پھر بتانے لگے۔

”مشعال میرے دوست دانیال کی بیٹی ہے۔ تمہیں شاید یاد ہو، بیس سال پہلے دانیال اور اس کی بیوی

ثانیہ، ہم نے انہیں ڈنر پر بھی بلا لیا تھا، پھر وہ امریکہ چلے گئے تھے۔“

”ہاں ہاں! مجھے یاد ہے۔ مشعال ان کی بیٹی ہے تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟“

زویہ نے یاد آنے پر فوراً پوچھا تو وہ سوچ کر کہنے لگے۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، البتہ مشعال..... میرا مطلب ہے، شامی سے پوچھو، کیا مشعال بھی اسے

پسند کرتی ہے؟“

”کیا مطلب؟“

زویہ ابھی بھی۔

”شامی! آخر تم چاہتے کیا ہو.....؟ تمہارا مقصد کیا ہے؟ خدا خدا کر کے سارہ سے جان مہملی تھی، پھر اب یہ مشعال کہاں سے آگئی.....؟“

زویہ اس کے بہانوں سے عاجز آگئی تھی، اور ابھی وہ یہی سمجھی کہ شہناز نے ٹالنے کے لئے کوئی نام لے دیا ہے، جبکہ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں می.....! کہ مشعال اب کیوں آئی.....؟ اسے تو بہت پہلے آ جانا چاہئے تھا۔“

”کیا.....؟ کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”آپ اچھی طرح سمجھ رہی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟ مزید یہ بھی سن لیں کہ اگر ڈیڈی نے مشعال کے بارے میں کچھ غلط کہا تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔“

اس کے شہس لہجے پر زویہ چکرائی ضرور، لیکن پھر اس پر بگڑ گئی۔

”تمہارا دماغ خراب ہے۔ اس سے پہلے تم سارہ کے لئے ایسا کہتے تھے۔“

”نہیں! میں نے سارہ کے لئے گھر چھوڑنے کی بات کبھی نہیں کی تھی، اور اسے آپ محض میری دھمکی

مت سمجھیں۔ میں مشعال کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔“

”شامی!.....“

زویہ خائف ہو گئی۔

”بیٹا! تم کیوں ایسی باتیں کرتے ہو، تمہیں اپنے ڈیڈی سے ضد ہے کیا جو بات وہ پسند نہیں کرتے،

تم اسی پر کیوں اڑ جاتے ہو؟“

”ضد مجھے نہیں، ڈیڈی کو مجھ سے ہے۔ جیسی تو وہ میری پسند نہ ٹھیک کر دیتے ہیں۔ سارہ کا خاندان انہیں

پسند نہیں تھا اور دیکھئے گا، مشعال کے بارے میں کہیں گے، معمولی جاب کرنے والی معمولی لڑکی۔“

اس نے اپنے آپ سوچ لیا تھا۔

”تو بیٹا! میں اس میرا کیا قصور ہے؟ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو تم؟ میرا جرم یہ ہے

کہ میں تمہیں پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہوں، لیکن شاید میری قسمت میں یہ ہے ہی نہیں۔“

وہ رو ہانسی ہو گئی، تب ہی علی احمد کے آنے پر وہ ان سے بولی۔

”آپ دونوں باپ بیٹا جودل چاہے کریں۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گی۔“

”کیا ہوا ہے؟“

علی احمد اس اچانک اُفتاد پر شٹا گئے۔

”وہی، میری شادی.....؟“

”تم پوچھو اس سے، اور یہ بھی کہو کہ پہلے وہ خود مشعال کو پر پوز کرے۔ وہ ایگری کرے گی، تب ہم باقاعدہ اس کا پر پوز لے کر جائیں گے۔“

انہوں نے زور دے کر کہا تو زوبیہ مزید ابھی تھی۔

”آپ کا مطلب ہے، مشعال ایگری نہیں کرے گی؟“

”میں شیور نہیں ہوں۔“

وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تو زوبیہ اس نئی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ مشعال اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی اور ادھر می ڈیڈی شادی پر اسرار کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرے؟ یہ تو طے تھا کہ وہ اپنی زندگی، اپنے دل میں مشعال کے علاوہ اور کسی کو جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ بات اس نے علی احمد سے بھی کہہ دی تھی اور وہ چونکہ پھر زکا نہیں تھا، اس لئے ان کے رد عمل سے بے خبر تھا۔

”پتا نہیں انہوں نے می سے کیا کہا ہوگا؟“

رات وہ یہی سوچتے ہوئے سویا تھا۔ پھر صبح کافی دن چڑھ آیا تھا، جب زوبیہ اس کے کمرے میں آئی اور اسے بے خبر سوتے دیکھ کر کھڑکی سے پردے کھینچتے ہوئے اسے پکار کر بولی۔

”نشامی! دیکھو، کتنا دن چڑھ آیا ہے۔ وہ کسمسا یا ضرور لیکن آنکھیں نہیں کھولیں، تو زوبیہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا ہو گیا ہے بیٹا؟ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ کہیں کچھ کھا کر تو نہیں سوئے تھے؟“

”کچھ سے کام نہیں چلے گا می! کھانا ہوتا تو ایک ہی بارز ہر کھالوں گا۔“

وہ کہتے ہوئے بیڈ سے اتر گیا۔

”نشامی! کہیں ایسی باتیں کرتے ہو؟“ اچھا یہ بتاؤ تمہاری مشعال سے بات ہوئی؟“

زوبیہ فوراً اصل بات کی طرف آ گئی۔

”نہیں! وہ میرا فون ہی آئینڈ نہیں کر رہی۔“

وہ وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“

”پتا نہیں!“

”پھر کیسے بات بنے گی بیٹا؟“ تمہارے ڈیڈی کہہ رہے ہیں، پہلے تم مشعال سے بات کرو۔“

زوبیہ نے کہا تو وہ سمجھا نہیں۔

”میں مشعال سے بات کروں؟“ کیا بات کروں؟“

”یہی کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”یہ آپ سے ڈیڈی نے کہا ہے؟“

اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں! وہ کہہ رہے تھے، مشعال ایگری کرے گی تو پھر ہم تمہارا پر پوز لے کر جائیں گے۔“

زوبیہ نے بتایا تو وہ کچھ ٹھنک گیا۔

”ڈیڈی نے ایسا کیوں کہا ہے؟“ کہیں انہوں نے تو۔“

”نشامی!“

زوبیہ ٹوک کر کہنے لگی۔

”تم اپنے ڈیڈی کو الزام دینے کی بجائے اپنے آپ کو دیکھو۔ تمہیں اپنی محبت پر بھروسہ نہیں ہے۔

مشعال تمہارا فون آئینڈ نہیں کرتی، تم سے بات نہیں کرنا چاہتی، اور تم ہو کہ۔“

”او فو می! آپ ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟“ میں کرلوں گا مشعال سے بات۔“

اس نے کہا تو زوبیہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”تم کرنے رہنا بات، میں ایک دو دن میں جاؤں گی اس کے گھر، شادی کی بات تو ہوتی رہے گی۔ میں

ٹائیہ بھابی سے تو مل آؤں۔“

”ٹائیہ بھابی؟“ یہ کون ہیں؟“

وہ پھر حیران ہوا۔

”مشعال کی می تمہیں نہیں پتا؟“ مشعال تمہارے ڈیڈی کے دوست دانیال حسن کی بیٹی ہے۔“

زوبیہ ہتا کر پوچھنے لگی۔

”تم مشعال سے کہاں ملے؟“

وہ فوراً جواب نہیں دے سکا۔ سوچنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے، تو ”بتاؤں گا“ کہتے ہوئے واش

روم میں بند ہو گیا تھا۔ پھر شاور لینے کے دوران وہ مسلسل یہی سوچتا رہا کہ یہ بات ڈیڈی نے پہلے اسے کیوں نہیں

بتائی؟“ یا وہ خود بھی لاعلم تھے؟“ کچھ بھی تھا، وہ اب فوراً مشعال سے ملنا چاہتا تھا۔ شاور لے کر نکلا تو پہلے اسے

فون کیا، تو پہلی بار اس کی کال ریسیو نہیں ہوئی، مگر دوسری بار رائی کرنے پر مشعال کال لینے کے ساتھ خاصے اکھڑے

لبچے میں بولی تھی۔

”فرمائیے!“

”مشعال.....! میں تم سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

اس نے فوراً کہا تو وہ سابقہ انداز میں بولی۔

”جی پوچھیں گے ناں کہ دانیال حسن کی بیٹی کو جاب کی کیا ضرورت تھی؟ دیکھیں شہناز صاحبہ.....! یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔ میں جاب کیوں کر رہی تھی؟ میں نے ریزائن کیوں دیا؟ آپ کو ان باتوں سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔“

”مجھے واقعی ان باتوں سے غرض نہیں ہے مشعال.....!“

اس نے دھیرج سے کہا۔

”غرض نہیں ہے تو پھر کیوں تنگ کر رہے ہیں مجھے.....؟ بار بار فون کرتے ہیں۔ راتے میں نظر آؤں تو پکار لیتے ہیں۔ آپ کو پتا نہیں ہے کہ یہ کتنی غلط حرکت ہے.....؟“

وہ سخت نالاں تھی۔

”آئی ایم سوری مشعال.....! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن پلیز.....! تم میری بات سنو۔!“

اس نے معذرت کے ساتھ عاجزی سے کہا تو وہ جزبہ ہو کر بولی۔

”کیا بات.....؟“

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ دیکھو، منع مت کرنا۔ یہ بہت ضروری ہے مشعال.....! سمجھو میری زندگی کا معاملہ ہے۔ ایک بار آ جاؤ، پلیز.....! آ رہی ہوں.....؟“

اس کی منت پر ادھر خاموشی چھا گئی تو وہ پکار کر بولا۔

”سنو مشعال.....! میں چیری مال کے کیفے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے خود سلسلہ منقطع کر دیا اور یک دم متحرک ہو گیا۔ دس منٹ میں تیار ہوا اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد چیری مال کے کیفے میں موجود تھا، اور وہ پورے دو گھنٹے بعد آئی تھی اور خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی تو کتنی دیر وہ اسے دیکھ گیا۔ جب وہ جزبہ ہونے لگی، تب گویا ہوا۔

”کیوں بھاگ رہی ہو مجھ سے، میری محبت سے.....؟ کیا صرف اس لئے کہ تم نے میرے ساتھ سارہ کو دیکھ لیا ہے.....؟ ہاں.....! میں نے سارہ کے ساتھ وقت گزارا ہے، اس کے ساتھ زندگی بھی گزار سکتا تھا۔ اگر تم نہ آتیں۔“

مشعال نے ٹھٹھا ہونٹ دانتوں میں دبا کر گویا کچھ نہ کہنے کا تہیہ کیا۔

”تم نے مجھے محبت کا ادراک دیا ہے مشعال.....! میرے دل میں محبت کی آگ ساگا کر اب دامن کیوں بچا رہی ہو.....؟ نہیں مشعال.....! تم دامن نہیں بجا سکتیں۔ چاہو گی تبت بھی نہیں۔ جو آگ میرے دل میں بھڑک

رہی ہے، اس کی تپش سے تم بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں.....“

وہ ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔ بہت نروٹھا انداز تھا۔

”میں محفوظ رہوں یا جل کر راکھ ہو جاؤں، آپ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہئے۔“

”تو تمہیں کیا غرض تھی.....؟ بھاگنے دیتی مجھے سارہ کے پیچھے۔“

”میں نے آپ کو سارہ کے پیچھے بھاگنے سے نہیں روکا تھا۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اس کی آزمائش سے پہلے خود کو آزمائیں۔“

وہ سچ کر بولی تھی۔

”اس لئے تاکہ تم جانتی تھیں، جب میں اپنے دل کو ٹٹولوں گا تو تمہاری پیٹکی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے گی۔“

وہ جانے انجانے میں اسے غصہ دل رہا تھا۔

”نہیں.....! میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔“

وہ خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جبکہ دھیان اسی کی طرف تھا۔ وہ اپنے آپ میں الجھ رہی تھی۔ تب وہ ہار مان کر بولا۔

”سنو.....! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زندگی میں ہر قدم تمہیں اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے شادی کرو گی.....؟“

مشعال نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا کہ وہ فوراً بولا۔

”ناں کہنے سے پہلے سوچ لینا۔ میرا دل تمہارے انکار کی تاب نہیں لاسکے گا۔ میں تمہیں فورس نہیں کر رہا مشعال.....! لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ہاں یا ناں سے پہلے اپنے اندر جھانک لو۔ ہو سکتا ہے تمہارے دل کے کسی کونے میں چھپی میری محبت کی چنگاری اچانک بھڑک اٹھے۔“

وہ چاہنے کے باوجود نظریں نہیں اٹھا سکی اور اپنے چہرے پر جی اس کی نظریں بری طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ تب وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئی تو وہ ہمیشہ کی طرح اسے دُور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

دانیال حسن کو اچانک یاد آیا کہ انہیں خواجہ صاحب کے ہاں سے ٹائیو کو پک کرنا ہے تو انہوں نے فائل بند کر دی اور اٹھنے لگے تھے کہ ایک لڑکی کو اپنے روم میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر رُک گئے۔

”جی.....؟“

ان کا انداز سوالیہ تھا۔

”میرا نام سارہ ہے اور میں نے کل مشعال کو یہاں سے آپ کے ساتھ نکلنے ہوئے دیکھا تھا۔“
اس نے کہا تو وہ خوش اخلاقی سے بولے۔

”اوہ.....! تو آپ مشعال کی دوست ہیں.....؟“
”دوست.....؟“

وہ طنز آمیز سگلتے ہوئے لہجے میں بولی۔
”سوری.....! میں مشعال جیسی لڑکیوں سے دوستی تو دُور کی بات، ان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں

کرتی۔“

”ہاؤ ٹیل یو.....؟“

ان کی پیشانی پر بے شمار شکنیں ابھر آئی تھیں۔

”جانتی ہیں، آپ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں.....؟“

”بہت اچھی طرح، وہی مشعال جو کچھ عرصہ پہلے علی احمد صاحب کے آفس میں ان کے بیٹے شامان پر
دُورے ڈال رہی تھی۔ اب آپ کو کیا آپ کے بیٹے کو پھانسنے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”شٹ آپ.....!“

غصے سے ان کی آواز پھٹ گئی تھی۔

”شرم آنی چاہئے تمہیں، میں مشعال کا باپ ہوں۔“

”باپ.....؟“

سارہ کو جھکا لگا تھا۔

”ہاں باپ۔ مشعال میری بیٹی ہے۔“

انہوں نے زور دے کر کہا تو وہ بد تیزی سے بولی۔

”آپ کی بیٹی ہے تو لگام ڈال کر رکھیں اسے، اور اسے یہ بھی سمجھا دیں کہ شامی میرے سوا کسی کا نہیں ہو

سکتا۔ وہ میرے اور شامی کے درمیان سے ہٹ جائے، ورنہ.....“

”شٹ بور ماؤتھ اینڈ گیٹ آؤٹ.....! آئی سے گیٹ آؤٹ.....؟“

وہ بالکل آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ بس نہیں چل رہا تھا، اسے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔

”ہونہ.....!“

سارہ نخوت سے سر جھکاتی ہوئی، پیر پختے ہوئے چلی گئی تو انہوں نے سر ہٹا لیا۔ ان کا ذہن بری طرح
چٹختے لگا تھا۔ یہ بھی یاد نہیں رہا کہ انہیں ثانیکہ کو لینے جانا تھا۔ انہوں نے اس لڑکی کو تو نکال دیا تھا، لیکن اس کی باتیں
مسلل کانوں میں گونج رہی تھیں۔

”وہی مشعال جو پہلے شامان پر دُورے ڈال رہی تھی، اب آپ کو کیا آپ کے بیٹے کو پھانسنے کی کوشش
کر رہی ہے۔“

”میرے خدا.....!“

ان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ انہوں نے گلاس کو دیکھا، پانی نہیں تھا،
اور ملازم کو بلانے کی ہمت نہیں ہوئی، نہ اٹھنے کی سکت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہانگوں میں جان ہی نہ ہو۔ تب ہی فون
کی بیل بج اٹھی تو انہوں نے بمشکل ریسیور اٹھایا تھا۔

”کہاں رہ گئے دانیال.....؟“

ادھر بیٹھ گئی۔

”ہاں.....! میں..... میں آفس میں ہوں۔ مشعال کہاں ہے.....؟“

ان کا ذہن مشعال میں الجھا ہوا تھا۔

”مشعال گھر پر ہے۔“

ثانیہ نے بتایا تو وہ کہنے لگے۔

”ٹھیک ہے.....! تم بھی گھر چلی جاؤ، مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی۔“

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر خود پر قابو پانے میں انہیں بہت دیر لگی، اور گھر آتے
آتے تو رات ہو گئی۔ وہ بے حد محال لگ رہے تھے، جب ہی ثانیکہ انہیں دیکھتے ہی پریشان ہو گئی۔

”دانیال.....! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....؟“

”ہوں.....!“

وہ سیدھے واش روم چلے گئے چیلنج کر کے نکلے تو لیٹ گئے۔

”کھانا نہیں کھائیں گے کیا.....؟“

ثانیہ نے انہیں لیتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں.....! مجھے ہوک نہیں ہے۔“

انہوں نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا تو ثانیکہ مزید پریشان ہو کر ان کے قریب آ گئی۔

”دانیال.....! کیا ہو گیا ہے.....؟“

”کچھ نہیں.....! بس وہ.....“

”کیا بس وہ.....؟ بتائیں ناں دانیال.....! کیا ہوا ہے.....؟“

ثانیہ نے ان کی آنکھوں پر رکھا بازو پکڑ کر کھینچ لیا تو وہ اُلجھتے ہوئے بولے۔

”پتا نہیں ثانیکہ.....! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ وہ میرا دوست علی احمد یاد ہے تمہیں.....؟“

”علی احمد؟“

”ثانیہ نے چند لمحوں سوچا۔“

”ہاں! آپ مجھے ان کے گھر بھی لے گئے تھے، اس وقت ان کا ایک بیٹا تھا۔“

”ہاں! وہی۔“

وہ اُٹھتے ہوئے بولے۔

”مشعل اسی کے آفس میں جاب کر رہی تھی۔“

”اچھا! یہ تو مجھے نہیں معلوم۔“

”معلوم تو علی احمد کو بھی نہیں تھا کہ مشعل میری بیٹی ہے۔“

”ظاہر ہے، انہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟“

ثانیہ کہہ کر پوچھنے لگی۔

”تو آپ اس لئے پریشان ہیں کہ مشعل، علی احمد کے آفس میں جاب کر رہی تھی؟“

”نہیں! میں اس لئے پریشان نہیں ہوں۔“

وہ اُلجھے، پھر جیسے بتانے پر آمادہ ہو کر کہنے لگے۔

”پریشانی کی بات یہ ہے کہ آج آفس میں میرے پاس ایک لڑکی آئی تھی جو یہ کہہ گئی ہے کہ میں مشعل کو

سمجھاؤں کہ وہ اس کے اور شائمان کے درمیان سے بٹ جائے۔“

”شائمان؟“

ثانیہ پریشان ہو گئی۔

”شائمان کون ہے؟“

”علی احمد کا بیٹا ہے۔“

انہوں نے بتایا تو ثانیہ کو فوراً یاد آیا کہ اس روز شائمان کس طرح مشعل کو پکارے

ہوئے آیا تھا۔

”تم کیا سوچنے لگیں؟ کیا مشعل نے تمہیں شائمان کے بارے میں بتایا تھا؟“

انہوں نے پوچھا تو وہ چونک کر بولی۔

”نہیں! اس نے تو کچھ نہیں بتایا، لیکن میں پوچھوں گی اس سے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ مشعل مجھ

سے کچھ نہیں چھپائے گی۔“

دانیال حسن اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

..... غلطی کی پہچان دینی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر مشعل، وہ شائمان کے درمیان کوئی بات ہوئی تو وہ

انیال کی نظروں میں بھی ہرٹ ہوگی اور ابھی وہ مشعل سے پوچھنے کے لئے خود کو تیار کر رہی تھی کہ زویہ آگئی۔

برمیان میں بیس سال تھے، پھر بھی ثانیہ نے اسے پہچان لیا، کیونکہ وقت اس پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوا تھا۔

”میں زویہ ہوں، مسز علی احمد! پہچانتا ہے؟“

زویہ نے اپنے تعارف کے ساتھ کہا تو وہ اس کی اچانک آمد پر ہشمل ہو کھلا ہٹ چمپا کر بولی۔

”جی جی! ابھی کل ہی دانیال آپ لوگوں کا ذکر کر رہے تھے۔ ٹینیس پلیئر!۔“

”شکریہ!۔“

زویہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”مجھے بھی علی نے ابھی کچھ دن پہلے بتایا ہے کہ آپ لوگ یہاں شفٹ ہو گئے ہیں۔“

”کیسی ہیں آپ، اور بچے وغیرہ؟“

ثانیہ نے پوچھا تو زویہ ہنستے ہوئے بولی۔

”بچے؟ بھئی! ایک ہی بیٹا ہے میرا، اور آپ کے کتنے بچے ہیں؟“

”میری بھی ایک ہی بیٹی ہے۔“

”اچھا! شادی کر دی بیٹی کی؟“

زویہ نے انجان بن کر پوچھا۔

”نہیں! ابھی تو نہیں، ایک جگہ بات چل رہی ہے، دیکھیں اللہ کو کیا منظور ہے۔“

اس نے قصداً غلط بیانی کی تو زویہ فوراً بولی تھی۔

”اللہ کو یہ منظور ہے کہ ہم ایک ہو جائیں۔“

”جی!؟ میں سمجھی نہیں۔“

وہ پھر انجان بنی، جبکہ دل میں اُبال اُٹھنے لگا تھا۔

”ما بھئی کی کیا بات ہے ثانیہ!؟ اللہ نے اتنے عرصے بعد شاید اسی لئے ہمیں ملایا ہے کہ ہمارے بچوں

کا جوڑ آسانوں پر نکلا ہے۔“

زویہ نے جتنے جوش سے کہا، وہ اسی قدر نرمی بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں چائے کا کپتی ہوں۔“

”ارے نہیں ثانیہ! چائے میں جب علی کے ساتھ آؤں گی، تب پیوؤں گی۔ ابھی تو میں کہیں اور جا

رہی تھی، سوچا تم سے مل لوں۔“

زویہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

”اور ہاں.....! میری بات سوچنا ضرور، میں پھر آؤں گی۔“

ثانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسے زخمت کر کے مشعال کے کمرے میں آئی اور اسے دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے امی.....؟“

مشعال نے پوچھا تو وہ تیزی سے اس کے قریب آ گئی۔

”جو میں پوچھوں، سچ بتانا۔ تمہارے اور شائمان کے درمیان کیا معاملہ ہے.....؟“

”میرے اور شائمان کے درمیان.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی.....؟ اور آپ شائمان کو کیسے جانتی

ہیں.....؟“

مشعال اندر سے خائف ہو گئی تھی۔

”تم میری بات کا جواب دو۔“

اس کی سختی سے مشعال رو ہانسی ہو گئی۔

”میرے اور شائمان کے درمیان کچھ نہیں ہے امی.....! آپ سے یہ بات کس نے کہی ہے.....؟ مجھے

بتائیں تو۔“

”کیا کرو گی جان کر.....؟“

”کچھ نہیں کروں گیا، لیکن یہ تو پتا چل جائے گا کہ میرے خلاف یہ پروپیگنڈہ کون کر رہا ہے.....؟ اور

اس کا مقصد کیا ہے.....؟“

مشعال نے کہا تو وہ دانت پیس کر بولی۔

”اس کا مقصد جو بھی ہو، تمہارے پاپا کو یہ بات بہت بری لگی ہے۔“

”پاپا.....؟“

مشعال چکرا گئی۔

”ہاں.....! کوئی لڑکی تمہارے پاپا سے کہہ گئی ہے کہ تم اس کے اور شائمان کے راستے سے ہٹ جاؤ۔“

ثانیہ نے کہا تو وہ مزید چکرا گئی۔

”آف.....! وہ یقیناً سارہ ہی ہوگی۔“

”کون سارہ.....؟ تم جانتی ہو سارہ کو.....؟“

اس نے فوراً پوچھا۔

”جی.....! وہ شائمان کی دوست ہے، اور اس نے مجھ سے بھی کہا تھا، جب ہی تو میں نے ریزائن دے

دیا تھا۔ میں..... میں کسی کے درمیان نہیں ہوں امی.....! سارہ کو غلط فہمی تھی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں امی.....! میرا

یقین کریں۔ میں کسی کے درمیان نہیں تھی۔ سارہ جھوٹی ہے۔“

وہ روئے لگی۔ ثانیہ نے اسے چپ نہیں کرایا، مزید چبھتے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

”اور جو ابھی شائمان کی امی آئی تھی، تمہارا پر پوزل دے گئی ہیں، انہیں کیا جواب دیا جائے.....؟“

بتاؤ.....!“

”کک..... کیا.....؟“

وہ جھنجکی رہ گئی۔

”میں کیا بتاؤں.....؟ جو آپ کا دل چاہے، کریں۔ منع کر دیں بے شک.....!“

مشعال روتے ہوئے بولی تھی۔

”منع تو میں کروں گی۔“

ثانیہ جیسے خود سے فیصلہ کرتے ہوئے اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

مشعال بیڈ پر اوڑھ لی مگر کتنی دیر روتی رہی۔ پھر اس نے غصے سے سیل فون اٹھا کر شائمان کا نمبر

پش کیا تھا۔

”میں بڑی شدت سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔“

ادھر سے وہ کال ریو کر تے ہی بولا تھا۔

”میں آپ کو ہمیشہ کے لئے انتظار کی زحمت سے بچا رہی ہوں شائمان علی.....! کیونکہ میں سیل فون کے

ساتھ اپنے دل سے بھی آپ کا نام Delete کر رہی ہوں۔“

اس نے کہا۔

”چلو، تم نے یہ تو اعتراف کیا کہ تمہارے دل پر میرا نام نقش تھا۔“

وہ پریشانی میں بھی جتا کر پوچھنے لگا۔

”ایسا کیوں کر رہی ہو.....؟“

”مجھے یہی کرنا چاہئے، کیونکہ آپ کی وجہ سے میں اپنے جیٹس کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں

رہی۔“

”میری وجہ سے.....؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے.....؟“

”کسی نے بھی کیا ہوا، وجہ آپ ہی ہیں، اور پلیز.....! آئندہ مجھے فون مت کیجئے گا۔“

وہ سیل آف کرنے لگی تھی کہ وہ بول پڑا۔

”مشعال.....! پلیز، میری بات سنو.....! مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے.....؟“

”سارہ سے پوچھیں، وہ میرے پاپا کے پاس کیوں گئی تھی.....؟“

اس نے کہہ کر سیل آف کر دیا تھا۔ پھر سارا دن وہ کمرے سے نہیں نکلی۔ ثانیہ اور دانیال حسن کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی اس کی جان جاری تھی۔ دوپہر میں تو ثانیہ نے خود اسے نہیں بلایا، لیکن رات کے کھانے کے لئے ملازمہ کو بھیجا تو بھی اس نے بھوک نہ ہونے کا کہہ کر منع کر دیا، اور کچھ دیر انتظار کرتی رہی کہ شاید ثانیہ خود آئے گی۔ لیکن وہ نہیں آئی، تب وہ مندر پر لپٹ کر سو گئی، اور اسے پتا بھی نہیں چلا، رات کس وقت دانیال حسن اس کے کمرے میں آئے تھے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے سیل فون کی منیج لائٹ جل بھ رہی تھی، جب ہی دانیال حسن نے اس کا سیل فون اٹھا کر منیج دیکھا تھا۔

”تم اپنے دل سے میرا نام Delete نہیں کر سکتی مشعال.....! کیونکہ میری محبت اتنی بودی نہیں ہے۔“

انہوں نے شانمان کا نام دیکھا، پھر سیل رکھ کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ صبح اس نے منیج کے ساتھ شانمان کا نام بھی Delete کر دیا تھا۔ لیکن دل کا کیا کرتی، جو اس نقش کو چھونے بھی نہیں دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

خولید صاحب وہیں بیٹھے تھے جہاں شوبی جاتے ہوئے انہیں چھوڑ کر گیا تھا، جب ہی اس نے سفری بیگ پھینک کر خوشی سے نعرہ لگایا تھا۔

”نانا بابا.....! میں آگیا نانا بابا.....!“

”ارے.....! میرا بچہ.....!“

خولید صاحب نے ہانپیں پھیلادیں تو وہ ان سے لپٹ گیا۔

”بہت جلدی آگئے.....؟“

”ہیں.....؟ میں تو سوچ رہا تھا، آپ کہیں گے، بہت دن لگا دیئے۔“

شوبی نے کہا تو وہ مسکرا کر پوچھنے لگے۔

”ماں کسی سے تمہاری.....؟“

”اچھی ہیں، آپ کو بہت سلام کہہ رہی تھیں۔“

وہ جواب کے ساتھ پوچھنے لگا۔

”آپ اس دن سے ہمیں بیٹھے ہیں نانا بابا.....؟“

”ہاں.....! تم سے کہا تھا ناں، بیس بیس ماں کا تو بیٹھا رہا۔“

خولید صاحب نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ پھر ان سے لپٹ گیا۔ تب ہی روٹی کھانے کی ٹرے لئے آگئی۔

”نانا بابا.....! یہ.....“

پھر شوبی کو دیکھ کر خوش گوار حیرت میں گھر گئی تو وہ اس کے ہاتھوں میں ٹرے کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔

”کیا ہے یہ.....؟“

”یہ میں نانا بابا کے لئے کھانا لائی ہوں۔“

”صرف نانا بابا کے لئے کیوں.....؟ میں کیا کھاؤں گا.....؟“

”شوبی.....!“

خولید صاحب نے اسے ٹوکا پھر روٹی سے بولے۔

”جاؤ بیٹی.....! کچن میں رکھ دو، اور ہاں.....! اب اپنی ماں سے کہنا، تکلیف نہ کرے۔ شوبی آگیا ہے، اب یہی پکائے گا۔“

”جی نہیں نانا بابا.....! میں کوئی نہیں پکاؤں گا۔ پکانے والی ملے آئیں اب۔ میں امی سے بھی کہہ آیا ہوں۔“

اس نے کہتے ہوئے روٹی کو آنکھ ماری تو وہ جو ہمیشہ آنکھیں دکھاتی تھی، شرما کر بھاگ گئی جس پر وہ زور سے ہنستا تھا۔

☆.....☆.....☆

ثانیہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی تیاری کا جائزہ لے رہی تھی کہ دانیال حسن کمرے میں داخل ہو کر رک گئے اور آئینے میں سرائتی نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کہاں کی تیاری ہے بھئی.....؟“

”لیجئے، اتنی جلدی بھول گئے.....؟“

ثانیہ ان کی طرف پلٹ کر کہنے لگی۔

”بس.....! آپ بھی جلدی سے فریش ہو جائیں۔ مسز آمنہ کے ہاں جانا ہے۔ وہ کتنی بار فون کر چکی ہیں۔ بس چلیں، دیکھ آتے ہیں ان کے لڑکے کو۔“

”تم نے مشعال سے پوچھ لیا ہے.....؟“

دانیال حسن پر ثانیہ کی غلت کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”پوچھ لوں گی مشعال سے بھی، پہلے لڑکا تو دیکھ آئیں۔“

ثانیہ نے کہا تو وہ فی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”نہیں ثانیہ.....! یہ ساری باتیں بعد میں آتی ہیں، پہلے بیٹی کی رضا مندی ضروری ہے، اور ہاں.....! تم

نے بتایا تھا علی احمد کی مز بھی اسی سلسلے میں آئی تھیں۔“

”انہیں تو خیر میں منع کر دوں گی۔ مجھے مشعال کی شادی وہاں نہیں کرنی۔“

وہ فوراً بولی تھی۔

”کیوں؟ میرا مطلب ہے، تم نے اپنے آپ سوچ لیا، فیصلہ کر لیا.....؟“

”ہاں.....! میں مشعال کی ماں ہوں۔ کیا مجھے حق نہیں ہے اس کے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے

کا.....؟“

وہ پہلی بار ہٹ دھرم لگ رہی تھی۔

”بالکل ہے، لیکن شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکی کی رضا مندی بھی ضروری ہے۔ مشعال کی مرضی معلوم

کئے بغیر ہم اپنے طور پر فیصلہ نہیں کر سکتے۔“

انہوں نے دھیرج سے سمجھاتے کی کوشش کی تو وہ ناگواری سے بولی۔

”میں مشعال سے پوچھ چکی ہوں۔ شانمان کے لئے اس نے منع کر دیا ہے۔“

”اچھا.....؟“

وہ حیران ہوئے۔

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے تم مشعال کے ساتھ زبردستی کر رہی ہو.....؟“

”ہاں.....! کر رہی ہوں زبردستی۔“

وہ چیخ مچی تھی۔

”کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کا نصیب مجھ جیسا ہو۔ گھر سے بگھر کی جائے۔“

”ثانیہ.....؟“

وہ ٹھٹھک گئے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”مطلب مجھے میرے گھر سے نکلنے والی حنا تھی اور وہاں سارہ موجود ہے۔ وہی سارہ جو آپ کو وارن

کر گئی تھی۔ کیا وہ ہماری بیٹی کو چین سے رہنے دے گی.....؟ نہیں دانیال.....! میں جانتے بوجھتے ہوئے اپنی بیٹی کو

آزمائشوں میں نہیں ڈال سکتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں، میں نے بیس سال کیسے گزارے ہیں.....؟ سر پر چھت تو تھی،

پھر بھی بے سائبانی کا احساس ہر پل کچھ کتا تھا۔ بیوگی کے دکھ سے بڑا دکھ جھیلنا ہے میں نے۔ اب اور ہمت نہیں

ہے۔“

وہ رونے لگی تو دانیال نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ پھر اپنے پاس بٹھا کر قدرے بحرمانہ انداز

میں بولے تھے۔

”میں نے علی احمد سے ہائی بھری ہے۔ وہ اور ان کی سزا بھی آنے والے ہوں گے۔“

”کیا.....؟“

وہ جھٹکے سے اٹھی تھی۔

”آپ نے ایسا کیوں کیا دانیال.....؟ محض اپنی دوستی کی خاطر بیٹی کا مستقبل داؤ پر لگا رہے ہیں.....؟“

پھر اس کے لہجے میں طنز سمٹ آیا تھا۔

”آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ مشعال آپ کے سامنے بڑی نہیں ہوئی، آپ نے بچپن میں اسے اپنی

بانہوں میں نہیں جھلایا۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے، اس کے ساتھ کچھ بھی ہو.....؟“

”کچھ نہیں ہوگا ثانیہ.....! کچھ نہیں ہوگا۔“

وہ زور دے کر کہنے لگے۔

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، میں نے دوستی میں، مشعال کی محبت کو دیکھتے ہوئے اور یہ سوچ کر شانمان

کے رشتے کی بانی بھری ہے کہ آخر کب تک میاں بیوی کے درمیان حنا اور سارہ جیسی رنجش پیدا کرتی رہیں گی۔ بس

اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے۔“

”آپ کے کہنے سے ختم ہو جائے گا، کیا شیطان مر جائے گا.....؟ نہیں دانیال.....! شیطان تو ازل سے

آدم اور حوا کے درمیان موجود ہے۔“

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ دانیال حسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور تائید کے ساتھ بولے۔

”بے شک شیطان موجود ہے۔ لیکن..... کیا تمہیں یاد نہیں، میرے ایک دوست جہانزیب اور اس کی

بیوی جانیہ کے درمیان بھی ایک شیطان ہی تو تھا، جس نے اوجھے جتھ کنڈے استعمال کر کے ان دونوں میں فساد برپا

کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مگر جانیہ بھائی نے عقل مندی س کام لیتے ہوئے جہانزیب کو اپنے اعتماد میں لے کر

اس شیطان کے مطلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ نتیجہ کیا نکلا.....؟ آخر شیطان کو ہی ہارنا پڑا ناں.....!“

دانیال حسن ایک لمحے کو خاموش ہوئے، پھر کہنے لگے۔

”ہاں.....! میں مانتا ہوں کہ شیطان واقعی ہی موجود ہے، لیکن اس سے بڑی ذات اللہ کی ہے، اور یہ

ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود کو آرام سے شیطان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بڑے رنگین

خواب دکھاتا ہے شیطان، انسان اپنی سدھ بدھ کو بیشتا ہے۔ ہوش تب آتا ہے جب وہی رنگین خواب بھیا تک تعبیر

لے کر سامنے آتے ہیں۔“

”پھر بھی آپ.....؟“

”ہاں.....! پھر بھی میں شیطان کا قرض لوٹانا چاہتا ہوں۔ مجھ پر اس کا وار چل گیا تھا، اور میرے دوست جہانزیب پر بھی اس شیطان مردود کا وار چل جاتا، اگر جانیہ بھابی اسے اپنے اعتماد میں نہ لیتیں۔ مگر اب میں اپنی بیٹی مشعال پر اس شیطان مردود کا وار ہرگز، ہرگز نہیں چلنے دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اپنے دل سے سارا کا خوف نکال دو۔“

دانیال حسن نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”دانیال.....!“

وہ کمزور پڑ گئی۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔

”مشعال اور مشعال کی خوشیاں مجھے خود سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ میں اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے میں نے شائمان کا رشتہ منظور کیا ہے۔ کیونکہ وہ مشعال کی پسند ہے۔ پھر بھی اگر تم نہیں چاہتیں تو میں علی احمد کو منع کر دوں گا۔“

”نہیں.....!“

اس نے بے اختیار اپنے ہونٹوں پر رکھی انگلی والا ان کا ہاتھ تھاما تھا۔ دانیال حسن نے مسکرا کر اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

زندگی میں دھوپ نہ ہو تو چھٹاؤں کی تمنا ہو ہی نہیں سکتی، اور یہ تمنا میں ہی تو دل کو اُکساتی ہیں۔ ابھی چلنا ہے، اور چلنا ہے، چلتے چلے جانا ہے، تاوقتیکہ منزل یہ نہ پہنچ جائیں۔

تانیہ اپنی منزل پر پہنچ کر آسودگی سے پلکیں موندتے ہوئے مشعال اور شائمان کی خوشیوں کی تمنا کرنے کے ساتھ دل سے دُعا گو تھی۔

اختتام